
منبر
مصلحت
مصنف:
محمد شہزاد
سیاست اور معاشرہ
تجزیات حیات
قانون و اخلاق

منبر مصلحت

ناول

مصنف	**محمد شہزاد**
اشاعتِ اول	جولائی 2023
ناشر	مصنف
حقوقِ اشاعت	محمد شہزاد

رابطہ کے لیے yamankalyan@gmail.com

حرفِ آغاز

ادب محض واقعات کی نقل نہیں؛ وہ اپنے عہد کے چہرے پر رکھا ہوا ایسا آئینہ ہے جو آرائش سے زیادہ دراڑیں دکھاتا ہے۔ "منبر مصلحت" اسی آئینے میں جھانکنے کی ایک کوشش ہے۔ اس ناول کی دنیا میں لفظ، منصب، تقدس، آزادی، خدمت اور اخلاق—سب اپنے ظاہری معانی کے ساتھ موجود ہیں، مگر ان کے پسِ پشت خواہش، خوف، مفاد اور اقتدار کی وہ کشمکش بھی جاری ہے جسے ہم اکثر تہذیب کے خوش نما پردوں میں چھپا دیتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کسی ایک طبقے، ادارے یا نظریے کو کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا؛ میرا مخاطب وہ انسانی کمزوری ہے جو اصول کو نعرہ، نعرے کو سیڑھی اور سیڑھی کو اقتدار میں بدل دیتی ہے۔ جب زبان سچ کی بجائے مصلحت کی خادمہ بن جائے، جب اخلاق دوسروں کے لیے ضابطہ اور اپنے لیے استثنا بن جائے، اور جب خدمت کے نام پر خود نمائی کا بازار گرم ہو، تو معاشرہ صرف منافقت کا شکار نہیں ہوتا—وہ اپنی اخلاقی بصیرت بھی کھونے لگتا ہے۔

طنز اس ناول کا محض اسلوب نہیں، اس کی اخلاقی ضرورت ہے۔ بعض سچائیاں نرم لہجے میں اپنی پوری شدت کھو دیتی ہیں؛ انہیں کبھی قہقہے کی دھار، کبھی مکالمے کی تلخی اور کبھی کرداروں کی خود فریبی کے ذریعے نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہاں بعض مناظر بے آرام کرتے ہیں، بعض جملے چونکاتے ہیں اور بعض کردار قاری کو ناگوار گزرتے ہیں۔ مگر ادب کا کام صرف آسودگی فراہم کرنا نہیں؛ وہ سوال اٹھاتا، پردہ ہٹاتا اور کبھی کبھی ہماری اپنی خاموش شراکت کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔

"منبر مصلحت" کو میں کسی حتمی فیصلے کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ یہ ایک بحث ہے—فرد اور ادارے کے باہمی تعلق پر، جنس اور اختیار کی سیاست پر، مذہبی و سماجی تقدس کے استعمال پر، اور اس فاصلے پر جو ہمارے اعلان کردہ اصولوں اور عملی رویّوں کے درمیان پھیلتا جا رہا ہے۔ قاری اس داستان سے اتفاق کرے یا اختلاف، میری خواہش صرف یہ ہے کہ وہ اسے پڑھ کر چند لمحے رک جائے اور اپنے گرد موجود زبان، طاقت اور مصلحت کے رشتوں کو نئے زاویے سے دیکھے۔

یہ کتاب ان تمام قارئین کے نام ہے جو ادب سے محض تفریح نہیں، فکری بے قراری بھی چاہتے ہیں—اور جو آئینے سے ناراض ہونے کے بجائے اپنے چہرے پر غور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

—محمد شہزاد

فہرستِ ابواب

باب 1

دودھ پتی کا دور!

'کیا زبردست پیس آیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اس کی بڑی بڑی چھاتیاں فوکس کریں۔ یہ اپنی گاڑی سے اترتے وقت ذرا سا جھکے گی۔ سارا سامان سمٹ کر باہر آ جائے گا۔ پھر دیکھیے گا نظارہ۔ حضور جلوہ طور بھول جائیں گے آپ!'

شاہ نے ڈاکٹر بدر کو آنکھ مارتے کہا اور پھر دیدے پھاڑ پھاڑ کر ذکیہ کو تاڑنے لگا جو ادارے میں سینئر لیول پر کام کیا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ فرقان اور فرید کی نظریں بھی ذکیہ پر مرکوز ہو گئیں جو ابھی ابھی دفتر پہنچی تھی۔ اس کا ڈرائیور گاڑی دفتر کے سامنے روک چکا تھا۔ اب وہ گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے فرشتوں تک کو علم نہ تھا کہ یہ منظر شاہ اور اسکے چمچے اپنی غلیظ نگاہوں سے ریکارڈ کر رہے ہونگے۔

بدر اور حیدر نے شاہ کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ دونوں میں سے کسی نے بھی مڑ کر ذکیہ کی جانب دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

'شاہ جی واقعی درست فرمایا آپ نے۔ بہت مست ہے اور چالو بھی۔' فرقان نے کہا۔

'کیا سینہ تان کر چلتی ہے۔ ایسا لگتا ہے پریڈ کر رہی ہو۔' اس بار فرید بولا۔ وہ اس معاملے میں کیوں پیچھے رہے فرقان سے؟

'اب ذرا پیچھے سے دیکھنا۔ توجہ! کیا کولہے مٹکاتے گھماتے جائے گی گول گول۔ اتنی ٹائٹ جینز پہنتی ہے۔ خواہ مخواہ ہمارا دین ایمان خراب کرتی ہے صبح صبح۔ ایسی عورتیں ہی صالح سے صالح مرد کو شیطان بنا دیتی ہیں۔ جہنم میں آگ کے کنوؤں میں ان جیسی بے حیا عورتیں اپنے پستانوں سے الٹی لٹکائی جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب جب آپ اس ادارے کے سربراہ بن جائیں تو ان کشتیوں کو لگام ڈالنے کے لئے کم از کم ایک عدد ڈریس کوڈ تو لازمی قرار دیجئے گا۔' شاہ نے چہرے پر مصنوعی تقوی اور سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بدر سے کہا۔ فرقان اور فرید نے جھٹ سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بدر نے کوئی جواب نہ دیا۔

'شاہ جی آخر کیا خاص بات ہے اس لڑکی میں؟ سلم سمارٹ تو ہے نہیں۔ بال بھی اتنے لمبے نہیں۔ اس سے کہیں بہتر تو راشدہ ہے۔ ٹھیک ہے چھاتیاں ذرا چھوٹی ہیں راشدہ کی، مگر سخت تو

بے تحاشہ ہیں۔ گھنی کالی زلفیں ہیں۔ بھئی راشدہ ہی ہے اصلی جنت کی سوغات آپکے دفتر میں۔'ڈھابے کا مالک شیدا بولا جو ابھی ابھی بدر کے لئے دودھ پتی لے کر آیا تھا۔

شیدا کچھ عرصے قبل اس قسم کے مشاغل سے دور ہوا کرتا تھا۔ لیکن شاہ کی صحبت میں اسے بھی "تاڑنے" کی لت پڑ چکی تھی۔ اور اس چکر میں وہ کئی بار کھولتی ہوئی دودھ پتی اپنے ہاتھوں پر گرا بھی چکا تھا۔

شاہ نے شیدے کو فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنا مزا خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تک ذکیہ کو گھورتا رہا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ اسکے بعد اس نے شیدے کے علاوہ اوروں کو بھی باری باری گھورا اور پھر کہا:

'آپ لوگوں کا علم عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ جتنا عورت کو میں جانتا ہوں کوئی اور نہیں جانتا۔ عورت کے جسم پر جتنا گوشت ہو، چھاتیاں اور کولہے جتنے بھاری ہوں، وہ اتنی ہی گرم لگتی ہے اور ایسی شے پر سواری کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ڈریس کوڈ ہونا چاہیے۔ دیکھیں نا یہ دوٹکے کا شیدا بھی اب ہماری کولیگ پر فقرے کس رہا ہے!'

'ایسا ممکن نہیں۔ یہ پرسنل فریڈم کے زمرے میں آتا ہے۔ آپ لوگوں کو تو معلوم ہے کہ ہم جینڈر سینسیٹو آرگنائزیشن ہیں۔ ہمارا تو کام ہی عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھانا ہے۔ اگر ہم نے اس قسم کا کوڈ لاگو کر دیا تو سب سے پہلے ہماری اور آپکی چھٹی ہو جائے گی۔'بدر بولا۔

'وہ کیسے ؟'سب نے حیرت سے پوچھا۔

'یار ڈونر ہمیں شدت پسند قرار دیکر گرانٹ بند کر دیگا۔ اور دفتر پر تالہ پڑ جائے گا۔'بدر بولا۔

'ہوں۔۔۔بات میں وزن ہے۔ چلو اچھا ہی ہے ایک طرح سے۔ مفت کے نظارے تو مل رہے ہیں۔ دفع کرو ڈریس کوڈ کو۔ ویسے ڈاکٹر صاحب نہا دھو کر آئی ہے۔ بالوں سے ابھی تک ٹپ ٹپ پانی گر رہا ہے۔ قمیض گیلی ہو کر اسکی سفید برا سے چپکی ہوئی ہے۔ لگتا ہے رات کے علاوہ دن کو بھی اوور ٹائم لگاتی ہے۔ تب ہی تو روز اتنا لیٹ آتی ہے۔ ایسے ہی تو زلزلے نہیں آتے۔' شاہ نے کہا۔ سب بندروں کی طرح کھی کھی کرنے لگے مگر بدر اور حیدر کے چہرے تاثرات سے خالی رہے۔

'شاہ جی آپ بہت پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ واقعی غیب کا حال جانتے ہیں۔' فرقان بولا جو خوشامد کے نت نئے مواقع ڈھونڈتا رہتا تھا۔

'ابے چوتیے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو عورت کا پیٹ، ننگا یا ڈھکا، دونوں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اور اسکا اپنا ہے یا یار کا۔ چال دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہاں سے آ رہی ہے۔۔۔ کچھ کر کے آ رہی ہے یا کچھ کئے بغیر! چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہوں راستہ کھلا ہے یا بند۔' اب کے شاہ چوڑا ہو کر بولا۔ ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔ ایک بار پھر بدر اور حیدر خاموش رہے۔

'شاہ جی گوہر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟' فرید نے پوچھا۔

'او یار وہ تو گرم گرم انگیٹھی ہے کوئلوں کی۔ سیخ کباب اوپر رکھو اور فوراً اٹھا لو۔ ورنہ کباب جل جائے گا!' شاہ نے جیسے ہی بات ختم کی ایک بار پھر قہقہے بلند ہوئے۔ بدر اور حیدر اس بار بھی کچھ نہ بولے۔

'یار شیدے کہاں مر گیا ہے تو؟ گھنٹہ ہو گیا۔ میرا ابر گر آیا نہ میری دودھ پتی۔' شاہ ڈھابے کے بنچ پر بیٹھے بیٹھے شیدے پر چلایا جو اس وقت تندور گرم کر رہا تھا۔

'آ رہا ہوں سرکار۔ انڈے ختم ہو گئے تھے۔ بچہ گیا ہے لینے موٹر سائیکل پر بڑے بازار۔ آتا ہی ہو گا۔' شیدے نے بھی گلا پھاڑ کر وہیں سے کہا۔

شیدے کا یہ ڈھابہ شہر کے ایک خاص اور مہنگے ترین علاقے میں واقع تھا۔ اس علاقے میں بڑے ممالک کے سفارت خانے اور بڑی بڑی ملکی و غیر ملکی کمپنیوں اور این جی اوز کے دفاتر تھے۔ دفتر سے تھوڑی دور مہنگے ریستوران، کافی شاپس اور فائیو سٹار ہوٹل تھے۔ ان دفاتر میں کام کرنے والے بڑے افسران تو چائے اور کھانے کے لئے وہیں جایا کرتے۔ اور کثیر تعداد میں عام ملازمین کا ڈیرہ شیدے کا یہ ڈھابہ تھا جسکی چائے اور دودھ پتی کی دور دور تک شہرت تھی۔

بہت سے بڑے افسران کھانا تو نہیں البتہ چائے یا دودھ پتی کے لیے اس ڈھابے پر ضرور آتے۔ جن کی گردن میں سریا تھا وہ نہ آتے۔ اپنا تھرماس ماتحت کے ہاتھ بھجوا دیا کرتے۔ شیدا ہدایات کے مطابق چائے یا دودھ پتی بنا کر اس میں بھر دیتا۔ لیکن سریے والے افسران بہت کم تعداد میں تھے۔ زیادہ تر بڑے افسران اپنے ماتحتوں کے ساتھ ڈھابے پر آ کر چائے یا دودھ پتی سے لطف اندوز ہوتے، سگرٹ پیتے، آتی جاتی خواتین کو تاڑتے، آپس میں فقرے بازی کرتے اور گپ شپ لگا کر دوبارہ تازہ دم ہو کر کام کی طرف لوٹ جاتے۔ کوئی خاتون افسر یا اسکی ماتحت اس ڈھابے پر شاذونادر ہی آتی۔ شاید یوں کہ سب مرد ایک نمبر کے ٹھرک باز تھے۔

سفارت خانوں میں جو لوگ ویزے کے لئے آتے، ان میں خواتین بھی ہوتیں۔ یہ زیادہ تر اپنے گھر کے مردوں کے ہمراہ ہوتیں۔ انکے مرد چائے یا کچھ اور چیزیں ڈھابے سے خرید لیتے۔ سفارت خانوں کے سامنے پارکنگ کے احاطے میں بنچ موجود تھے جہاں انکی مستورات اور بچے بیٹھے ہوتے۔ یہ وہ چیزیں وہاں لے جاتے اور انکے ساتھ بیٹھ کر کھا پی لیتے۔ ڈھابے پر

بیٹھ کر چائے نوشی کرنے والے یا کھانا کھانے والے دفاتر میں کام کرنے والے ہی ہوتے اور ان میں اکثریت انکی ہوتی جو مہنگے ریستوران میں جا کر کھانے کے متحمل نہ تھے۔

دفاتر کے سامنے ایک وسیع اور طویل سڑک تھی۔ دائیں بائیں لمبے گھنے دور دور تک پھیلے سایہ دار درخت تھے جو شدید گرمی میں بھی ٹھنڈک کا احساس دلاتے۔ پھر دفاتر کے اپنے اپنے لان تھے جس میں قسم قسم کے پھول فضا کو ہر وقت معطر کیے رہتے۔ سڑک کے اطراف بہت سارے ٹائپسٹ بیٹھے ہوتے جو لوگوں کو ویزا فارم پر کر دیا کرتے۔ کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ خاندان یہ سڑک پال ہی رہی تھی۔ دفاتر میں کام کرنے والے اس گنتی میں شامل نہیں۔ بات صرف اس طبقے کی ہو رہی ہے جو سڑک پر ہی اپنی خدمات فراہم کر کے شام کو اپنے اپنے گھر روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ ان حالات میں شیدے کا ڈھابہ خوب چلتا۔

شاہ کا اصلی نام پیراں دتہ قادری تھا۔ اسے اس نام سے شدید چڑ تھی۔ اس کی وجہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ پینڈو نام تھا۔ اصل میں وہ پیروں کی "کرامات" کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اسکے والدین مزاروں، تکیوں اور درگاہوں پر اولاد کے لیے بھٹکتے پھرتے تھے۔ قسم قسم کی منتیں مانا کرتے۔ کون آستانہ ہو گا جہاں انہوں نے ماتھا نہ ٹیکا۔ کون پیر ہو گا جسے سجدہ نہ کیا۔ ان ہی میں سے ایک پیر کو شاہ کے والدین اپنے گھر لے آئے۔ وہ مسلسل چھ برس ان ہی کے پاس رہا۔ اس عرصے میں شاہ کی ماں پانچ بار حاملہ ہوئی۔ سب سے پہلے شاہ پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کو دونوں نے پیر کا معجزہ قرار دیا۔ اور اسے "پیراں دتہ" کہنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ ہی نام اس کی پیدائش کے کاغذات میں لکھوا دیا گیا۔ شاہ کے بعد اس کی ماں نے لگا تار چار بیٹیاں جنیں۔ آخری بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ پیر ہمیشہ کے لئے کہیں غائب ہو گیا۔ خدا معلوم زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟

شاہ کے خاندان میں بہت سوں کا کہنا یہ تھا شاہ کا باپ تو نامرد تھا۔ پانچوں بچے پیر سے تھے جسے شاہ کے باپ نے قتل کر کے لاش کہیں دفنا دی تھی۔ ان میں سے کسی حاسد نے یہ بات پولیس تک بھی پہنچائی۔ شاہ کا باپ دو دن پولیس کا مہمان بھی رہا۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا۔ جب لاش ہی نہیں تو قتل کیسا؟

اب شاہ نے تو پیراں دتہ اپنے لئے تجویز کیا نہیں تھا۔ اس کا حل اس نے دو طرح سے نکالا۔ خود کو پی ڈی قادری لکھنے لگا اور اپنے آپ کو بطور "شاہ جی" متعارف کرانے پر جت گیا۔ وہ اس پوش علاقے میں واقع ایک بہت بڑی ملکی این جی او کا ایڈمن مینیجر تھا جس کا نام تھا، "خالص ترقی"۔

یہ تنظیم خالصتاً بڑے ممالک کی خیرات پر زندہ تھی۔ یہ اپنے دستور پر کم اور ادارے کی خاتون سربراہ کے ذاتی منشور پر زیادہ عمل پیرا تھی۔ اس خاتون کا کہا حتمی مانا جاتا جسے ڈونر کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت لکار نہ سکتی تھی۔

درجہ بندی کے لحاظ سے شاہ ادارے میں اکا دکا بھی نہ تھا۔ مگر اس کے پاس کچھ ایسا ضرور تھا جس کی وجہ سے سب ہی اس کے "مرید" تھے۔ اس ادارے میں پچاس کے قریب لوگ کام کیا کرتے تھے۔ ادارے کی پالیسی کچھ ایسی تھی کہ کم سے کم مردوں کو نوکری دی جائے۔ اب ڈرائیورز، مالی اور آفس بوائے کی حد تک تو مردوں کو ملازمت دینا ادارے کی مجبوری ٹھہری مگر اسکے باوجود کئی اسامیاں ایسی بھی تھیں جہاں اس تنظیم کو مطلب کی خواتین نہ مل سکیں۔ ایسی تمام جگہوں کو مردوں نے ہی پر کیا۔ پھر بھی وہ اقلیت میں ہی رہے۔ انکی موجودگی کا تناسب بیس فیصد سے زیادہ کبھی نہیں بڑھا۔ اوپر کے لیول پر زیادہ تر خواتین چھائی ہوئی تھیں۔

ادارے کی باس ڈاکٹر گوہر تھی۔ یہاں ڈاکٹروں کی بھرمار تھی۔ یہ ایم بی بی ایس یا ہومیوپیتھک والے نہیں بلکہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ شرارتی عناصر انہیں 'پھرا ہوا دماغ' کہتے۔ سب کے سب فارن کوالیفائیڈ تھے۔ سب ہی ایلیٹ کلاس سے تھے۔ عام لوگ مڈل یا جونیئر لیول پر کام کیا کرتے تھے۔

شاہ یہاں کئی برسوں سے ملازم تھا۔ عمر چالیس ہو چکی تھی۔ قد ناٹا، گھنے بال، درمیانی داڑھی جو آدھی سے زیادہ سفید ہو چکی تھی۔ آنکھیں گول گول الو کی طرح اور اس پر گول فریم کی عینک۔ کسی نام نہاد ڈبہ پیر کا مرید تھا اور اپنے ماتحتوں کو زبردستی اپنا مرید بنائے رکھے ہوا تھا۔ ڈھابے سے انکو مفت چائے پلا دیتا۔ سگرٹ خرید دیتا۔ کبھی کبھار کھانا بھی کھلا دیتا۔ اس کے عوض ماتحت اٹھتے بیٹھتے اسے شاہ جی، شاہ جی کہتے رہتے۔ دفتر میں اس بات کا پرچار کرتے پھرتے کہ شاہ جی بہت پہنچے ہوئے پیر ہیں۔ کئی لاعلاج بیماریوں کا علاج انکے وظیفوں اور تعویذوں میں پوشیدہ ہے۔ فلانے دم سے فلانا سو فیصد ٹھیک ہو گیا جسے کینسر تھا۔ فلاں کو ڈاکٹر نے ہارٹ سرجری کا مشورہ دیا تھا۔ وہ شاہ جی کے پاس گیا۔ انہوں نے تعویذ دیا تو سب شریانوں کی خود بخود بھل صفائی ہو گئی۔ پھر وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کرانے گیا تو سارا ہسپتال حیران و پریشان رہ گیا کہ ایسا ممکن کیسے ہوا۔ اس قسم کے جھوٹ وہ اٹھتے بیٹھتے گھڑتے رہتے لیکن اندر اندر ہر چمچہ شاہ کو شدید ناپسند کرتا۔

'لو شاہ جی آپکا برگر اور دودھ پتی ریڈی ہے۔' شیدے نے دونوں چیزیں شاہ کے آگے رکھی میز پر دھرتے کہا۔ اس میز کے چاروں پائے برابر نہیں تھے۔ اسی لئے شیدے نے 'دھیان سے!' کا اضافہ بھی کر دیا۔

'شیدے شاہ جی کی خدمت کیا کر۔ ان کی دعا لیا کر۔ میری پروموشن ان ہی کی کرامات کا نتیجہ ہے۔' یہ فرید تھا۔ شاہ کا اسسٹنٹ۔ کمال کا چاپلوس۔ پیروں فقیروں پر یقین نہ رکھتا تھا۔ پر مجبوری تھی۔ شاہ کی خوشامد نہ کرے تو نوکری میں کیسے رہے گا؟ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہ ایک نمبر کا منافق، جھوٹا اور بذات خود ایک بہت بڑا چاپلوس تھا۔ جس عہدے پر تھا اس پر صرف اور صرف خوشامد کر کے پہنچا تھا۔ مگر مصلحت کے تحت سچ نہیں بول سکتا تھا۔ شیدے کو شاہ کے اثر میں لانے والا فرید ہی تھا۔

'سر جی میں نے تو کبھی پیسے بھی نہیں مانگے شاہ جی سے۔ وہ زبردستی دے دیتے ہیں۔ بلکہ ہمیشہ زیادہ ہی دیتے ہیں۔' شیدا بولا۔

'چل ٹھیک ہے۔ لیکن سپلائی ایڈوانس میں رکھا کر شیدے۔ شاہ جی کی چاشت کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔' اس بار فرقان بولا۔ یہ بھی شاہ کا ایک ماتحت تھا۔ فرید سے جلتا تھا کیونکہ اس کے مقابلے کی چاپلوسی نہیں کر سکتا تھا۔ کوشش کرتا تھا لیکن فرید کا دماغ بہت ہی چالو تھا چاپلوسی میں۔

'اچھا شیدے سن۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی دودھ پتی میرے کھاتے میں ڈالا کر۔ انکے نہیں۔' شاہ نے بدر کی طرف دیکھتے اس انداز میں کہا جیسے وہ اس پر بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ بدر کچھ کہتا، حیدر بول پڑا: 'اوئے نہیں شیدے۔ ڈاکٹر صاحب کا بل میرے کھاتے میں ڈالا کر۔'

حیدر شاہ کا ماتحت نہ تھا۔ بدر کی چاپلوسی بہر حال اس پر فرض تھی کیونکہ وہ ادارے کا نائب سربراہ تھا اور سب کو معلوم تھا کہ گوہر کے بعد وہ ہی باس ہو گا اگر بورڈ نے کوئی نیا گل نہ کھلایا! حیدر کی نوکری عارضی تھی۔ اس کا مقصد نوکری پکی کرنا تھا۔ قابل تھا مگر یہ بات سمجھتا تھا کہ نوکری کے لئے قابلیت کے علاوہ سب سے بڑی ڈگری خوشامد یا نسوانی حسن تھا۔ خوشامد والا خمیر اس میں بدرجہ اتم موجود تھا لہذا معاملات ایک طرح سے اس کے ہاتھ ہی میں تھے۔

'ڈاکٹر صاحب کا سخت آرڈر ہے کہ ان کا بل کسی اور کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ڈھابے پر تالا لگوا دیں گے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟' شیدے نے یہ کہہ کر بدر کی طرف دیکھا جیسے اس بات کی تصدیق چاہتا ہو۔ اس پر بدر نے کہا: 'شاباش شیدے

شاباش۔ سب کو اپنا اپنا بل خود چکانا چاہیے۔ میرا بل صرف میں ہی چکاؤں گا۔ کوئی اور نہیں!' آخری جملہ اس نے قدرے سختی سے کہا اور یہ کہتے اس نے شاہ کی جانب دیکھا۔

اس کے بعد بدر نے ایک اور جملہ بولا: 'ذکیہ ہماری کنسلٹنٹ ہے، ملازم نہیں۔ وہ اگر دفتر نہ بھی آئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو ٹاسک اس کو دیا جاتا ہے، ڈلیور کر دیتی ہے۔'

'آپ بالکل درست فرما رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ کنسلٹنٹ کوئی کلرک ہے جو نائن ٹو فائیو مزدوری کرے؟' حیدر نے کہا اور شاہ کی جانب دیکھا۔ شاہ اس کا طنز سمجھ گیا اور جھٹ سے بولا: 'سولہ آنے کھری بات کی آپ نے ڈاکٹر صاحب۔ لیکن ہمارا دل توڑ دیا آپ نے۔ کبھی ہماری طرف سے بھی دودھ پتی پی لیا کریں۔ آپ تو خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے۔'

بدر نے اسے نظر انداز کیا تو شاہ نے پرانا داؤ آزماتے کہا: 'چلو بھئی اٹھو ورنہ میری نماز چاشت قضا ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آج تک چاشت کی نماز قضا نہیں کی۔ اس کے علاوہ ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں ادا کرتا ہوں۔ یہ سلسلہ پچھلے پچیس برس سے جاری ہے۔ سات بار حج کر چکا ہوں۔ سال میں تین عمرے ادا کرتا ہوں۔ محلے کی زکواۃ کمیٹی کا پچھلے دس سال سے بلا مقابلہ چیئر مین ہوں۔'

بدر نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اب سب کھڑے ہو گئے۔ بدر اور حیدر بیٹھے رہے۔ جب یہ لوگ کچھ دور چلے گئے تو حیدر نے بدر سے کہا: 'ایک نمبر کا حرامی ہے یہ شاہ ڈاکٹر صاحب۔ بیٹا کوئی نہیں اسکا۔ دو بیٹیاں ہیں۔ انتہائی پیاری اور خوبصورت۔ گڑیا کی طرح۔ جڑواں ہیں۔ کوئی چھ برس کی ہیں۔ ایک دفعہ آفس میں دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ مجھے بھی ایسی ہی بیٹیاں دے۔ لیکن اسکی حرکتیں دیکھیے۔ کیسی بیہودہ بکواس کرتا پھرتا ہے دفتر کی لڑکیوں کے بارے میں۔ اسے پوچھنے والا کوئی نہیں؟ کیوں گوہر بے بس ہے اس کے آگے؟

اتنی واضح اور سخت سیکسچول ہراسمنٹ پالیسی ہے ہمارے ادارے کی۔ اسے اللہ ہی سیدھا کرے گا۔ اور اب یہ حرامزادہ دفتر کے ٹائم میں چاشت کی نماز پڑھے گا۔ اپنے ماتحتوں کو تو یہ فرض نماز پڑھنے کے لئے پانچ منٹ بھی نہیں بخشتا! چاشت پڑھ کر یہ اپنی معشوقہ سے گھنٹوں فون پر سیکسی باتیں کرے گا۔ پھر اسکے بعد پورنوگرافک ویب سائٹس دیکھے گا۔ آپ بے شک آئی ٹی والوں سے کنفرم کروالیں۔ ویسے آئی ٹی تو آپ ہی کے انڈر ہے۔ اس حرامی کو صرف اور صرف آپ ہی پٹہ ڈال سکتے ہیں۔'

یہ سب باتیں کرنے کے بعد وہ بدر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی جواب کا منتظر ہو۔ 'یار میں چلتا ہوں۔ ایک ارجنٹ رپورٹ آج ہی ختم کرنی ہے۔ 'بدر نے کہا۔ حیدر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

'آپ کو شاہ کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ اسکی حرکتیں ناقابل برداشت حد تک بڑھتی جا رہی ہیں۔ اب تو اس کی جرات اتنی بڑھ چکی ہے کہ میرے سامنے ذکیہ اور آپکے خلاف بھی انتہائی رکیک اور فحش جنسی جملے کستا ہے۔ اور اسکے تمام ماتحت چسکے لیتے ہیں۔ 'بدر اپنی باس اور خالص ترقی کی سربراہ ڈاکٹر گوہر سے مخاطب تھا۔

'آپ جانتے ہیں ادارہ سختی سے سیکسچول ہراسمنٹ پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ ایک کمیٹی بھی بنی ہوئی ہے جو آزادانہ کام کرتی ہے۔ اگر ادارے کا سربراہ بھی قصوروار ہو تو اسے نکال باہر کر سکتی ہے۔ لیکن کوئی مدعی ہونا چاہیے۔ ذکیہ نے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور میں نے اپنے بارے میں ایسی کوئی بات سوائے آپ کے کسی اور سے سنی نہیں۔ 'گوہر بولی۔

'حیدر، فرقان، فرید اور شیدا چشم دید گواہ ہیں۔ میں بھی ہوں۔'

'ایک منٹ۔۔۔ 'گوہر نے ہاتھ کے اشارے سے بدر کو روکا اور انٹر کام پر اپنی سیکریڑی سے کہا کہ کمیٹی کی سربراہ ڈاکٹر ریٹا کو اسکے کمرے میں آنے کا کہے۔

'تم سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ شیدے کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ہمارا ملازم نہیں۔ وہ باہر کا آدمی ہے۔ دو ٹکے کا ڈھابہ چلانے والا!' گوہر نے بدر سے دوبارہ مخاطب ہوتے کہا۔

'گواہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ شیدے کی گواہی تو سب سے زیادہ معتبر ہو گی بطور آوٹ سائیڈر۔ اور ہم تو انسانی حقوق کے چیمپین ہیں۔ کیسے کسی کو دو ٹکے کا کہہ سکتے ہیں؟' بدر نے کہا۔ وہ گوہر کو "آپ" سے مخاطب کرتا۔ گوہر اسے کبھی "آپ" کبھی "تم" کہا کرتی۔

اس دوران ڈاکٹر ریٹا گوہر کے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔

'آیئے۔۔۔ ایک قانونی نکتہ ہے۔ کیا کوئی بھی تھرڈ پارٹی متاثرہ پارٹی کی جگہ ہراسمنٹ کی شکایت کر سکتی ہے؟' گوہر نے پوری رام کہانی ریٹا کو سنائی جس پر ریٹا بولی:

'صرف متاثرہ فریق ہی شکایت کر سکتا ہے۔ لیکن ادارے میں اگر کوئی بھی یہ محسوس کرے کہ دفتر کا ماحول پالیسی کے مطابق نہیں تو ایسا ممکن ہے مگر ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔ ورنہ بدر صاحب نوکری سے جائینگے۔'

'بہت بہت شکریہ اب آپ جاسکتی ہیں۔' گوہر نے ریٹا سے کہا۔ پھر بدر کی طرف دیکھتے بولی:

'اور کچھ ؟'

بدر کو اب مکمل یقین ہو چکا تھا کہ شاہ کا بال بھی بیکا نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک گوہر سربراہ ہے۔ اسکے عہدے کی معیاد پوری ہونے میں کئی سال باقی تھے۔ حیدر شاہ کا ماتحت نہ تھا۔ وہ گواہی دے سکتا تھا جسے فرید اور فرقان جھٹلا سکتے تھے۔ وہ چاہتا تو ڈونر کو مطلع کر سکتا تھا۔ اس صورت میں اپنی ہی بے عزتی ہوتی۔ ڈونر کہتا اپنے ہی ادارے کے کلرک کو تو سنبھال نہیں سکتے۔ ملک کیا خاک سنبھالو گے ؟ کبھی کبھی اسے شک ہوتا کہ گوہر اور ریٹا کا شاہ سے کوئی راز اہے۔ اگلے لمحے اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوتی۔

'تھینک یو۔ میں چلتا ہوں!' بدر نے گوہر سے کہا۔ اس نے مسکراہٹ کیساتھ بدر کو رخصت کیا پھر انٹر کام پر تین ہندسوں پر مشتمل ایک نمبر ڈائل کیا۔ یہ شاہ کی ایکس ٹینشن تھی۔۔۔ چار سو بیس!

ڈاکٹر گوہر اپنے اپارٹمنٹ میں تھی جو شہر کے مہنگے اور محفوظ ترین علاقے میں واقع تھا۔ یہاں چڑیا بھی پر نہ مار سکتی تھی۔ داخلے کے لیے سیکیورٹی کے کئی مراحل سے گذرنا پڑتا۔ مکینوں کے لئے لازم تھا کہ سیکیورٹی والوں کو اپنے ملاقاتیوں کے مکمل کوائف پہلے سے جمع کرائیں۔ مثلاً شناختی کارڈ نمبر، گاڑی کی لائسنس پلیٹ، گاڑی کا رنگ، ماڈل وغیرہ تاکہ کوئی غیر متعلقہ یا مشکوک شخص علاقے میں گھس نہ پائے۔ چیک پوسٹ کے بعد کوئی چار کلومیٹر لمبی گرین بیلٹ تھی۔ سڑک پر دائیں بائیں گھنے درخت تھے۔ اسکے بعد رہائشی اپارٹمنٹس شروع ہوتے۔ امیر گوروں کا اک چھوٹا سا شہر تھا۔ مگر پیسے والے "کالے" بطور سٹیٹس سمبل یہاں رہا کرتے تھے۔

اس جگہ کا نام قلو پطرہ اپارٹمنٹس تھا۔ کوئی دو ہزار مربع فٹ اپارٹمنٹ کا کرایہ لاکھوں میں ہو گا۔ کوئی کسی محفل میں اگر بتلا دے کہ وہ یہاں رہتا ہے تو سننے والے غش کھا جاتے۔ وہ تصدیق کے لئے دوبارہ پوچھے بنا نہ رہتے کہ کیا آپ واقعی قلو پطرہ اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں؟ اچھا وہاں کے لوگ کیا عام انسانوں کی طرح ہی ہوتے ہیں یا سر پر سینگ ہوتے ہیں؟

گوہر کا وسیع وعریض اپارٹمنٹ اپنی نوعیت کا پینٹ ہاؤس تھا۔ وہ تن تنہا یہاں رہتی تھی۔ طلاق یافتہ تھی۔ اولاد نہ تھی۔ چالیس برس کی تھی۔ عمر سے کوئی دس برس کم دکھتی تھی۔

خاصی خوش شکل تھی۔ درمیانہ قد۔ گوری رنگت۔ سلم سمارٹ۔ امیر کبیر گھرانہ۔ بہت گم گو۔ ایک سمندر کی مانند تھی۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا گہرائی ہے اور تہہ میں کیا کچھ ہے۔

شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ شدید گرمی اور حبس تھا۔ مگر اپارٹمنٹ سنٹرلی ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ اندر بیٹھ کر انسان گرمی کی شدت کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی ٹی شرٹ اور باریک سا خاکی سکرٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ کے کشادہ لاؤنج میں مدہم روشنی میں صوفے پر آنکھیں موندھے پڑی تھی۔ پس منظر میں موزارٹ کی موسیقی دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ریٹا تھی۔

'دیر تو نہیں ہوئی آنے میں؟'

'نہیں۔۔۔'

'موزارٹ ہے نا؟'

'یس۔۔۔'

'بیٹھو۔ کیا لو گی؟'

'تمہیں معلوم تو ہے۔۔۔ میں کیا لیتی ہوں۔۔۔' ریٹا نے کہا۔

'جو تم شوق سے لیتی ہو وہ اس وقت موجود نہیں۔۔۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہو گا!' اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ریٹا ہنس دی۔

'میرا مطلب ڈرنک سے تھا۔'

'آئی نو۔۔۔' یہ کہہ کر گوہر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

ریٹا گوہر کی ہم عمر تھی۔ جاذب نظر تھی۔۔۔ غیر شادی شدہ۔۔۔ کتوں کی شوقین جو اسکے نزدیک مردوں سے زیادہ وفادار تھے۔ قد میں گوہر سے ذرا لمبی۔ جسامت دبلی پتلی۔ گھنے لمبے بال اور گندمی رنگ۔

دونوں دوست ایک ہی صوفے پر تھیں۔ رسم نبھانے کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو چیرز کہا۔ پھر حسب معمول ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ عورتیں عورتیں ہی رہتی ہیں۔ تنہا ہوں اور غیبت کا دور نہ چلے۔۔ یہ ممکن نہیں! گھنٹوں گھر کے اندر فضول گپ شپ کریں گی۔ پھر کہیں گی کہ دیر ہو رہی ہے، اب چلتی ہوں بہن۔ اس کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ مزید کھڑے کھڑے وقت رخصت دروازے یا گیٹ پر مزید گفتگو کرینگی۔ بندہ پوچھے بیبیوں کیا یہ ایک گھنٹے والی آخری گپ شپ آرام سے گھر کے اندر نہ ہو سکتی تھی پہلے والی چار گھنٹے کی سیر حاصل گفتگو کی طرح؟

'کیا ٹائم دیا تھا حرامی کو؟' ریٹا نے پوچھا۔

'آنے والا ہو گا۔۔۔لو آ گیا۔۔۔' گوہر نے کہا جب عین اسی لمحے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجی۔ وہی تھا۔۔۔شاہ!

'ہائے باسٹرڈ۔۔۔' گوہر نے کہا۔ اس قسم کی نجی محفل میں شاہ مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا۔۔۔باسٹرڈ، ڈاگ، پپی، پگ، کتا، حرامی، حرامزادہ۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔ یہ القابات شاہ کے لئے ویاگرا کا اثر رکھتے تھے۔ پھر گوہر کو شاہ کے پس منظر کا مکمل علم تھا۔ اس کے گاؤں میں سب ہی اسکو "حرامی حرامی" کہا کرتے تھے۔ اسی لئے وہ بھاگ کر شہر آ گیا تھا اور اپنے گاؤں سے لاتعلقی اختیار کر چکا تھا۔

'میرا پیارا پپی!' ریٹا کے منہ سے یہ نکلنے کی دیر تھی کی شاہ فوراً دونوں خواتین کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ وہ کسی بھی وفادار کتے سے بڑھ کر انکے پاؤں چاٹ رہا تھا۔

'ویری گڈ، ویری گڈ۔۔۔' دونوں خواتین باری باری کہہ رہی تھیں اور شاہ باری باری ان کے پیر چاٹ رہا تھا۔ وہ لاونج میں بچوں کی طرح بھاگتیں۔ شاہ انکا پلے کی طرح تعاقب کرتا۔۔۔ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل۔ دونوں نے اسے اتنا دوڑایا کہ کچھ دیر بعد وہ ہانپنے لگا۔ وہ "پانی پانی" کر رہا تھا۔

'تھوڑا اور دوڑ۔ پھر ہم تجھے چشمے سے ابلتا تازہ پانی پلائیں گے۔' ریٹا بولی۔ اس پر گوہر نے کھل کر قہقہہ بلند کیا۔

شاہ کو ذلیل کر کے دونوں مستورات کو ایک انوکھی مسرت محسوس ہوتی۔ وہ ان دونوں کا کھلونا تھا جس پر ان ہی کی مرضی چلتی۔ وہ شاہ کو ننگی ننگی گالیاں دیتیں۔ ایسی گالیاں جن کا مزہ شرفاء کو صرف کسی چکلے کی ڈیرے دارنی، بیسوا یا کسبی سے ہی میسر تھا۔ لیکن یہ دونوں خواتین مغرب کی اعلی ترین جامعات سے پی ایچ ڈی تھیں۔ ان کے منہ سے ایسی "چنیدہ" اور "نپی تلی" گفتگو اگر خالص ترقی کا سٹاف سن لیتا تو پہلا شک ان کی سند پر ہی کرتا۔ لیکن یہ ان کا ذاتی آستانہ تھا جہاں بڑے بڑے گدی نشینوں کی مرشد و پیر و مربی یہ دونوں دوشیزائیں ہی تھیں۔ اس آستانے کا فلسفہ حیات سو فیصد عملی تھا۔۔۔کھلا کھاؤ ننگا نہاؤ! بس یہ ہی اک محاورہ ایسی گفتگو کے حق میں بطور دلیل استعمال کیا جا سکتا تھا۔

شاہ پیاس سے جاں بلب تھا۔ وہ نیم مردہ حالت میں قالین پر پڑا تھا۔ گوہر اسکے سرہانے اور ریٹا پیتانے تھی۔ جیسے دونوں جھک کر اس زندہ لاش کو قبر میں دھکیل دیں گی۔ لیکن وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ پانی پانی کر رہا تھا۔ دونوں خواتین کو اس پر ترس آ گیا۔ پھر ایک معجزہ ہوا۔ دونوں اس کے سرہانے آ گئیں اور پانی کے دو فوارے پھوٹے۔ دو چشموں کے پانی نے شاہ کو سیراب

کر دیا۔ وہ پل بھر میں بھلا چنگا ہو گیا۔ 'تو صرف پپی کی ہی اداکاری کر سکتا ہے۔۔۔ پیر کی نہیں!'
گوہر نے سکرٹ درست کرتے کہا۔
'حرام کا پلا!' ریٹا نے کہا اور شاہ چاؤں چاؤں کرنے لگ گیا۔

باب 2

کالی ساڑھی!

'یہ ڈریس کیسا رہے گا؟' ماریہ نے اپنی شاگردہ اور دوست افسانے سے پوچھا۔

'پینڈو پروڈکشن ہے۔ سلمی ستاروں کی کھچڑی۔ ہمارے محلے کی گڑوی والیاں پہنتی ہیں ایسے کپڑے عید بقر عید پر۔' افسانے نے کہا۔ ماریہ کو اس کا جواب سن کر خوش نہ ہوئی اور احتجاجاً بولی: 'تمھیں میری چوائس پینڈو پروڈکشن نظر آتی ہے؟ یہ میں نے پیرس سے خریدا تھا شانزے الیزے کے ایک سٹور سے۔'

افسانے کو احساس ہوا کہ انسان کو بولنے سے پہلے تولنا چاہیے۔ 'آئی ایم سوری! میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہ تھا۔' اس نے کہا۔ شاگردہ کی معصومانہ معذرت پر ماریہ کو بے ساختہ پیار آ گیا۔

ماریہ کے کنگ سائز ڈبل بیڈ پر ملبوسات کا اک انبار لگا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے مختلف ڈریسز اپنی وارڈروب سے نکال کر افسانے کو دکھا رہی تھی۔ چند منٹوں میں یہ بارہواں لباس تھا جو مسترد ہو چکا تھا۔ ہر لباس بیش قیمت ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی تھا۔ مگر افسانے خود بلا کی حسین لڑکی تھی۔ دیومالائی حسن کے تمام اوصاف اس کی شخصیت میں تھے۔ ابھی تک سب ہی ملبوسات اسکے حسن کی چمک دمک کے آگے ماند پڑ چکے تھے۔ مگر ماریہ بھی شکست ماننے والوں میں سے نہ تھی۔ اسکے ملبوسات کا خزانہ اگر امیلڈا مارکوس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھا۔ اسے یقین تھا افسانے کی پسند کے ایک نہیں کئی پہناوے نکل آئیں گے۔

'تمہارے لمبے قد اور بل کھاتے گورے گورے بدن پر یہ کالی ساڑھی بہت جچے گی۔'

'تا کہ گلی کے سارے لڑکے میرے پیچھے لگ جائیں!' افسانے بولی۔

'مجھے معلوم ہے تمہارے محلے کا ماحول۔ عورت اگر برقعے میں بھی ہو تو کیا بچہ، کیا جوان، کیا بوڑھا۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی خلائی مخلوق ہو۔ ساڑھی کے اوپر چادر لے لینا ورنہ ہر دیکھنے والا غش کھا کر وہیں ڈھیر ہو جائے گا!' ماریہ نے کہا۔ وہ کئی بار افسانے کے گھر جا چکی تھی۔ اپنی شاگردہ کے پس منظر سے اچھی طرح واقف تھی۔

افسانے واقعی بے حد خوبصورت تھی۔ سرو جیسا لامبا قد۔۔۔ پانچ فٹ دس انچ! چکنا بدن۔ ستواں ناک، گھنے مضبوط بال گھٹنوں سے بھی نیچے۔ چوڑی پیشانی۔ غزالی آنکھیں۔ چمک

دار موتی جیسے دانت۔ گلابی ہونٹ اور رنگت بھی ویسی۔ بھاری گول گول چھاتیاں، ابھرے ہوئی نپلز، پتلی کمر اور اسی تناسب سے کولہے، رانیں، زانو اور پنڈلیاں۔ ہر وہ مرد جس نے اسے دیکھا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ کوئی اسے مدھوبالا کہتا کوئی بروک شیلڈ۔ کسی کو اس میں ہیما مالنی کا عکس دکھائی دیتا تو کسی کو کرینہ کپور کا۔ بڈھے ٹھرکیوں کو اس میں فردوس، آسیہ یا انجمن نظر آتی۔ غرضیکہ جو اپنے اپنے زمانے کی جس ہیروئین پر مرتا وہ ہی اسے افسانے میں نظر آتی۔ ماریہ کو اس میں مارلن منرو نظر آتی۔

'یہ میری پسندیدہ ساڑھی ہے۔ زبردست گولڈن زری کا کام ہے۔ اسے پہن کر تم قیامت برپا کر دو گی میری شادی پر۔' ماریہ نے کہا۔

'واقعی زبردست ہے میڈم!' افسانے بولی۔

'کتنی بار کہا ہے مجھے میڈم نہ کہا کرو۔ تم میری فرینڈ ہو مائی ڈیئر۔ اور اس وقت یونیورسٹی میں نہیں میرے گھر پر ہو۔
'

پی ایچ ڈی ڈاکٹر ماریہ یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتی تھی۔ اسکی اپنے ساتھیوں سے کم اور افسانے سے زیادہ دوستی تھی۔ وجہ یہ کہ افسانے اپنی عمر سے بڑی باتیں کیا کرتی تھی اور منفرد سوچ کی حامل تھی۔

ماریہ پینتیس برس کی ہو چکی تھی۔ حسین و جمیل تھی۔ اپنی عمر سے کافی کم نظر آتی تھی۔ امیر کبیر گھرانے سے تعلق تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں اک بڑے سے گھر میں رہتی تھی۔ انسان دوست تھی۔ طبیعت میں کوئی غرور نہ تھا۔ فیشن ایبل بہت تھی۔ کون عورت ہو گی جو امیر ہو، خوبصورت ہو، اعلی تعلیم یافتہ ہو، پروفیشنل ہو اور فیشن ایبل نہ ہو؟

'اور یہ ہے اسکا بلاوز۔' ماریہ نے ایک اور ہینگر الماری سے نکالتے کہا۔

'یہ تو بغیر آستین کا ہے۔' افسانے بلاوز کی جانب عجیب نظروں سے دیکھتے بولی۔

'تو کیا ہوا۔ عورتیں علیحدہ ہال میں ہونگی۔ کھانا بھی اسی ہال میں ہو گا۔' ماریہ نے کہا۔

'ایسا ہے تو پھر چلے گا۔ اسے پہن کے دیکھ لوں؟' افسانے نے پوچھا۔

'کیوں نہیں؟'

وہ بلاوز ہاتھ میں پکڑ کر باتھ روم کی طرف بڑھی تو ماریہ نے اسے یاد دلاتے کہا: 'کوئی پردہ ہے ہم دونوں میں؟'

'ہے تو کوئی بھی نہیں!' افسانے ہنستے ہنستے بولی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے قمیض اتار کر بلاوز پہننے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ اس کا آدھا عریاں بدن ماریہ پر سحر طاری کر چکا تھا۔

لمحے بھر کے لئے ماریہ نے سوچا کہ اگر یہ لڑکی مقابلہ ملکہ حسن میں شرکت کرے تو سب کی چھٹی کر دے۔ اس کے رگ و ریشے میں ہیجان برپا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر افسانے سے لپٹ گئی۔ اس نے بھی ماریہ کو بھینچ لیا۔ اس حالت میں وقت ہمیشہ ان دونوں کے لئے تھم جایا کرتا تھا۔ اس بار بھی تھم گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں پر سکون ہو چکی تھیں۔

'میرے ہاتھ بلاوز کی زپ تک نہیں پہنچ رہے۔۔۔'

ماریہ نے اس کام میں اسکی مدد کی۔

'بہت ٹائیٹ ہے۔' افسانے بولی۔

'برا اتار کر ٹرائی کرو۔' یہ کہہ کر ماریہ نے بلاوز کی زپ کھول کر برا کا ہک نکال دیا۔ بغیر برا بلاوز افسانے کے بدن پر چست تھا۔

'ارے اس میں تو سارا جسم نظر آ رہا ہے۔۔۔'

'تو آنے دو کیا فرق پڑتا ہے۔' ماریہ لاپروائی سے بولی۔

'کیا؟'

'بھئی تم ساڑھی کو بلاوز پر ڈالو گی تو سب کچھ چھپ جائے گا۔' ماریہ نے کہا۔

چند دنوں بعد ماریہ کی شادی تھی۔ سب ہی بہت خوش تھے کہ اسے اپنی پسند کا مرد مل ہی گیا۔ لمبا انتظار کرنا پڑا بیچاری کو۔ افسانے کی ماں ماریہ سے چند ہی برس بڑی ہو گی۔ چودہ پندرہ برس میں شادی ہو گئی۔ اگلے ہی برس افسانے پیدا ہو گئی۔ اب وہ بائیس برس کی ہو چکی تھی۔ ادھر ماریہ کو کہیں پینتیس میں پہنچ کر اپنا مسٹر پرفیکٹ ملا جب اس کے حسن کے بجھنے کا ابتدائی عمل شروع ہو چکا تھا۔ پر وہ اب بھی بے انتہا پرکشش تھی۔ لمبی، نازک، دبلی پتلی، گوری، کندھے تک لٹکتے بال۔ درمیانے سائز کی ایسٹ ویسٹ چھاتیاں جو اسکے فگر کے ساتھ خوب میل کھاتیں۔

عارف ماریہ کا پرانا پیار تھا۔ وٹے سٹے کے چکر میں وہ اس سے شادی نہ کر سکا۔ جب اس کی بیوی کا کینسر میں انتقال ہوا تب جا کر ماریہ سے شادی کی سبیل بنی۔ وہ چالیس برس کا تھا۔ امیر بزنس مین۔ ہینڈسم۔ شادی کے وقت سے اب تک ماریہ اور اسکے خفیہ تعلقات برقرار رہے۔

اب یہ سارا قصہ کچھ یوں تھا کہ ماریہ بضد تھی کہ افسانے اسکی شادی میں شرکت کرے۔ پر وہ کترا رہی تھی۔ غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسا ڈریس نہ تھا جو کسی اہم اور امیر لوگوں کی تقریب میں پہنا جا سکے۔ آج ماریہ یونیورسٹی سے اسے اپنے گھر لے آئی۔ وہ یہ چاہ رہی تھی کہ اس کے ہی ملبوسات میں سے کوئی ایک اس دوشیزہ کو پسند آ جائے تا کہ وہ شادی میں شریک ہو سکے۔

ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ شادی تھی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں جو اس غریب گھرانے کی حسینہ کے گھر سے بہت دور تھا۔ کوئی پبلک ٹرانسپورٹ وہاں آتی جاتی نہ تھی۔ محفل بھی رات کی تھی۔ یعنی اگر جلد سے جلد نکلنے کی کوشش بھی کی جائے تو آدھی رات سے پہلے نکلنا ممکن نہ تھا۔ اب ٹیکسی کی جائے۔ اس میں دو قباحتیں۔ ٹیکسی بہت مہنگی پھر اتنی رات اکیلے آنا جانا۔ تو دونوں کی اس ملاقات کا مقصد ان تمام دشواریوں کا حل تلاش کرنا تھا۔ دونوں مستورات حسن کے ساتھ ساتھ عقل کی دولت سے بھی مالا مال تھیں۔ لہذا ہر مسئلہ با آسانی حل ہو رہا تھا۔ ٹرانسپورٹ کے مسئلے کے لئے ایک وین کا بندوبست پہلے سے ہی کر لیا گیا تھا۔ تو ٹیکسی بھی نہ کرنا پڑی اور گھر سے رات گئے اکیلے بھی نہ نکلنا پڑا۔

'اس ساڑھی میں دیکھ کر تمہیں کئی آنٹیاں اپنے بیٹوں کے لئے پروپوز کریں گی۔'

'مگر میڈم میرا کوئی موڈ نہیں ابھی شادی کا۔ میں نے زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ پروپوزلز تو اب بھی بہت ہیں۔ لیکن میں کسی کی باندی بن کر نہیں رہ سکتی۔ مجھے اپنے آپ کو منوانا ہے۔'

'کیا میں عارف کی باندی بننے جا رہی ہوں؟'

'آپ کی بات اور ہے۔ آپ اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ عارف آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپ ان پر مرتی ہیں۔ میرا تو کیریئر ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ نہ ہی میں کسی پر مرتی ہوں۔ البتہ سب مجھ پر مرتے ہیں۔۔۔ یہ ساڑھی واقعی بہت خوبصورت ہے۔ یہ ہی پہنوں گی!' افسانے نے کہا۔ یہ ساڑھی اسے واقعی بہت اچھی لگی۔ ماریہ یہ بات سن کر خوش ہوئی۔

افسانے کے خاندان کے سب ہی لڑکے اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ کون ہو گا جو اسے نہ سوچے اور اپنے خیالوں میں اسکے جسم کے روئے روئے کی پرستش نہ کرے۔ جنسی کشش اس میں اتنی کے قبر میں پیر لٹکائے بوڑھے کو بھی کسی کشتے کی ضرورت نہ رہے۔ افسانے کی آنکھیں ہی اس کے بدن میں تناو پیدا کر دیں اور وہ بغیر کشتہ کھائے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے۔ لیکن سب کزنز ایک جیسے ہی تھے۔ سکول سے بھاگے ہوئے۔ جاہل اور گنوار! وہ مغرور تو ہرگز نہ تھی پر ایک خاص ادا اور مزاج ضرور رکھتی تھی۔ کیا تیر مارا اگر کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کی لگائی بن گئی۔ چند برس میں چار پانچ بچے جن دیے۔ وہ زندگی میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا جس کی دوسرے تمنا کریں۔ ایسا نہیں کہ بہت سا پیسہ کما لیا۔ پیسے کے ساتھ پاور بھی ہونی چاہیے۔ کچھ ایسا نظریہ حیات تھا اس لڑکی کا۔

اس کا برج اسد تھا۔ یعنی شیرنی تھی۔ سورج اسد کی پہچان۔ لیڈرشپ اسد کا قدرتی وصف۔ گھر والے بھی اسکی قائدانہ صلاحیتوں کے قائل تھے۔ اسکا باپ رحیم بخش کسی سیٹھ کی

کمپنی میں منشی تھا۔ گھر اپنا تھا شہر کے مصروف ترین علاقے میں۔ پانچ مرلے کا ایک منزلہ یہ گھر اس وقت کروڑوں کا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ان گھروں کے نزدیک ایک بہت بڑا تجارتی مرکز وجود پذیر ہو چکا تھا۔ لوگ گھر مسمار کر کے تجارتی عمارات تعمیر کر رہے تھے۔

افسانے کا گھر مین روڈ پر تو نہ تھا۔ لیکن پلازے اب گلیوں تک پھیل چکے تھے۔ مین روڈ سے ایک بڑی سڑک اندر آتی تھی۔ اس سڑک کے دائیں بائیں گھر ہوا کرتے تھے۔ سب کے سب پلازوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان پلازوں کے پیچھے تنگ گلیاں تھیں جہاں گاڑی داخل نہ ہو سکتی تھی۔ اب یہ پلازے گلیاں بھی ہڑپ کرتے جا رہے تھے۔

افسانے کا گھر گلی میں تھا۔ اس کی گلی کے کئی گھر بک چکے تھے۔ وہ کئی بار اپنے والدین کو یہ مشورہ دے چکی تھی کہ اس گھر کو فروخت کر دیا جائے۔ اس سے اتنے پیسے آ جائینگے کہ وہ شہر سے دور کسی بھی نئی ہاوسنگ سوسائٹی میں پانچ نہیں دس مرلے کا ڈبل سٹوری گھر خرید سکیں۔ اسکے باوجود بہت سا پیسہ بچ جائے گا جس سے کوئی بھی کاروبار کرنا ممکن ہو گا۔ اس کے والدین اس خیال کے حامی نہ تھے۔ اس طرح افسانے کے گھر والے کروڑ پتی لوگ تھے، کوئی کنگلے نہیں۔ مگر ہاتھ میں نقد کچھ بھی نہ تھا۔ وہ یہ پکا ارادہ کر چکی تھی کہ جس دن باپ مرے گا، یہ گھر وہ بیچ دے گی اور ماں محمودہ بیگم رکاوٹ نہیں بنے گی۔

محمودہ شہر کے ایک بہت امیر بزنس مین ملک کے گھر ملازمہ تھی۔ ملک فیاض اور رحم دل انسان تھا۔ افسانے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرتی۔ گذر بسر ہو جاتی۔ اب وہ ایم اے انگریزی کے آخری سال میں تھی۔ گھر میں سب سے بڑی تھی۔ ایک ہی چھوٹا بھائی تھا۔۔۔ تیرہ برس کا بوبی۔۔۔ جو بہن سے بہت زیادہ مانوس تھا۔

انگریزی ڈرامے اور فلمیں شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ محنت پر اسے یقین تھا۔ پورے خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں میٹرک سے اوپر نہ جا سکے۔ بہت سے تو میٹرک پاس بھی نہ کر سکے۔ وہ تو اب ایم اے مکمل کرنے کے قریب تھی۔ اسکے بعد وہ ماسٹرز کہلانے کے لائق! کتنا بڑا اعزاز تھا اس کے لئے۔ اسکے محلے میں چند گھر ایسے تھے جنکے باہر کچھ اس قسم کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔۔۔ راشد حسین (بی اے)۔ محمد خان (بی کام)۔ راشدہ خانم ایڈوکیٹ (بی اے ایل ایل بی)۔ محلے کے شرارتی بچے اسے 'ایڈی وڈی کیٹ 'یعنی اتنی بڑی بلی' کہتے تھی۔ لیکن افسانے کا خواب کافی اونچا تھا۔ وہ ڈاکٹر افسانے (پی ایچ ڈی) والی تختی چاہتی تھی گھر کے باہر۔

عموماً کزنز کی آپس میں بہت دوستی ہوتی ہے۔ افسانے کا معاملہ کافی مختلف تھا۔ وہ بہت سارے دوستوں کی قائل نہ تھی۔ ایک ہو۔ صاحب علم ہو۔ قابل بھروسہ ہو۔ کچھ ایسی سوچ کی حامل تھی۔

ماریہ ہی اسکی بہترین دوست تھی۔ اس کے بعد اسکی کزن شمیم۔ پوری یونیورسٹی سے ماریہ نے صرف اسے ہی اپنی شادی پر مدعو کیا تھا حالانکہ اس کے سٹوڈنٹس کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ یہ بات افسانے کے لئے باعث فخر تھی۔ علاوہ ازیں ماریہ اسکی شادی میں شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کررہی تھی! یہ دہرا اعزاز تھا افسانے کے لئے۔

'ارے بوبی ذرا جا تو شمیم کے گھر۔ ابھی تک نہیں آئی۔ شادی کا ٹائم ہونے والا ہے۔ وین آتی ہی ہوگی۔ افسانے نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

'دوبار جا چکا ہوں باجی۔ وہ پانچ بجے آئیں گی۔'

بیوٹیشن شمیم افسانے کی کزن تھی۔

'اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ باہر جا میں کپڑے بدل لوں۔'

افسانے نے دروازہ بند کرکے بلاوز پہنا۔ بالکل فٹ تھا۔ 'میڈم درست کہہ رہی تھیں کہ اسے برا کے بغیر پہننا۔' اسے اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔

آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیتے لیتے اسے اپنے آپ سے پیار ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے آئینے سے بھی عشق ہو گیا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی اگر آئینہ نہ ہوتا تو دنیا کیسی ہوتی۔ وہ کسی جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر اپنی خوبصورتی کی گواہی پانی سے لیتی۔ لیکن اگر کوئی رات میں تیار ہو رہا ہو تو جھیل میں اپنا عکس کیسے دیکھے گا؟

پھر اسکے گھر کے آس پاس تو کوئی جھیل بھی نہ تھی۔ گندے نالے بہت تھے۔ صنعتی اور گھریلو فضلہ ان جھیلوں میں پھینکا جا رہا تھا جہاں سے لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ جن دریاؤں میں مچھلیاں ہوا کرتی تھیں اب وہاں گندگی کے ڈھیر تیرتے تھے۔

کچھ عرصے قبل ملک کے سمندر میں ایک تیل سے بھرا ٹینکر ڈوب گیا۔ آب و ہوا اتنی آلودہ ہوئی کہ درجنوں لوگ مر گئے۔ لاکھوں مچھلیوں کا قتل عام ہوا۔ اب سمندر میں میلوں دور مچھلی نہیں ملتی۔ دریا سوکھ کر کانٹا بنے۔ دریاؤں کے اندر لوگوں نے ہاوسنگ سوسائٹیاں بنا ڈالیں۔

دوسرے، کیا وہ یہ سلیولیس اور باریک بلاوز پہن کر کسی جھیل میں اپنا عکس دیکھنے جا سکتی تھی؟ ان حالات میں آئینہ کتنی بڑی نعمت تھا!

پھر ایک خیال اور آیا۔ کیا بدصورت لوگ بھی آئینے کے عشق میں گرفتار ہو سکتے تھے؟ کچھ آئینے عکس کو مسخ کرکے پیش کرتے تھے۔ اس کے سامنے کھڑے حسین سے حسین لوگ

بھی اپنی شکل دیکھ کر ڈر جاتے۔ لیکن جو واقعی بد شکل ہوں وہ کیوں آئینے سے پیار کرینگے؟ انہیں تو آئینے سے نفرت نہ ہو گی؟ لیکن پھر وہ لوگ کیا کریں جنکی صورت تو اچھی نہ تھی مگر سیرت بہت ہی خوبصورت تھی۔ کیا کوئی ایسا آئینہ بھی تھا جسکے سامنے کھڑا ہو کر انسان اپنی سیرت کی صورت دیکھ لے؟

تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئینہ صرف ظاہری شکل کا عکس ہی دکھا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی اسکے دماغ سے آئینے سے عشق کا بھوت اتر گیا۔ کاش وہ ایسا آئینہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے جو سیرت کی سچی صورت دکھا سکے۔ سنا تھا کہ ولی لوگ سیرت دیکھ سکتے تھے۔ پر آج کل کے زمانے میں ولی ملے گا کہاں؟ یہاں تو ہر آستانے پر، ہر مزار پر، ہر تکیے پر ایک نمبر کے فراڈیے براجمان تھے جنہیں گدی نشین کے نام سے جانا جاتا تھا۔

بلاوز کہیں سے بھی مانگے تانگے کا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی باکمال آرٹسٹ اس کے بدن کو بلاوز کی شکل میں پینٹ کر چکا ہو۔ کچھ دیر وہ اپنے آپ کو آئینے میں تکتی رہی۔ زاویے بدلتی رہی۔ بلاوز میں اسکے گلابی نپل کسی کلی کی طرح کھل رہے تھے۔ سوچ رہی تھی کہ ماں نے اگر دیکھ لیا تو ناراض ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ ماں تو خود اتنا کھلا گلا پہنتی ہے۔ جھاڑو لگاتے ذرا سے جھکتی ہے تو ساری چھاتیاں باہر ابل آتی ہیں۔ 'پر اماں کی چھاتیاں ابھی بھی اتنی سخت کیوں ہیں؟ حالانکہ وہ برا کا استعمال بھی شاذونادر ہی کرتی۔' ماں کا سوچ کر افسانے کے ذہن میں اک نیا سوال کوندا۔

'ارے دروازہ کھول!' یہ شمیم تھی۔

'ایک منٹ!' افسانے نے کہا اور بستر پر بکھری چیزیں جلدی جلدی ایک طرف کر دیں۔ کمرہ چھوٹا سا تھا۔ آنے والا مہمان بستر پر ہی بیٹھ سکتا تھا۔

'ارے تو تو قیامت ڈھا رہی ہے!'

'واقعی؟'

'ہاں نہیں تو کیا! بالکل زینت امان کی طرح لگ رہی ہے۔ ستم شوم سندرم والے روپ میں! شمیم افسانے کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتے بولی۔ چونکہ ایسا افسانے خود بھی شمیم کے ساتھ کیا کرتی تھی، لہذا اس حرکت پر اسے لطف ہی آیا۔

'ستم شوم سندرم والا روپ؟ بات سمجھ نہیں آئی؟ افسانے بولی۔

'لگتا ہے تو نے یہ فلم نہیں دیکھی۔۔۔ بھئی زینت کا بلاوز ایک تو بہت کھلا اور باریک تھا دوسرے اس کے نیچے برا نہیں تھی۔ بلاوز میں اسکے براون نپل صاف دکھائی دیتے تھے۔ جیسے

تیرے گلابی دکھائی دے رہے ہیں۔ ویسے تیرے زیادہ حسین ہیں اور بڑے بھی۔ اور تنے ہوئے بھی!'

'تو بہت بڑی حرافہ ہے!' افسانے نے کہا۔ جواب میں شمیم نے واقعی کسی حرافہ کے انداز میں قہقہہ بلند کیا۔

'اچھا سن تجھے میک اپ کی کیا ضرورت؟ رنگ تیرا گلابی، ہونٹ تیرے سرخ انگارہ۔ لوگ میک اپ کرتے ہیں بدصورتی چھپانے کو۔ تو خوبصورتی چھپا رہی ہے!'

'چل ہلکا سا کر دے۔'

'ہلکا بھی نہ کر۔ صرف سرخی، نیل پالش اور مہندی چھپوا لے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں دولہا تجھے ہی نہ پسند کر لے۔

'

'ابے چل! ٹھیک ہے۔ سرخی، نیل پالش اور مہندی کافی ہے۔'

'دیما تجھے بہت پسند کرتا ہے۔ اگر تو میری بھابھی بن جائے تو کتنا اچھا ہے!' شمیم نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

'میری جوتی بھی نہ کرے اس سے شادی۔ تو میری دوست ہے یا دشمن؟ جانتی بھی ہے اپنے بھائی کے لچھن۔ پھر بھی ایسا سوچتی ہے۔ ایک نمبر کا فراڈیا ہے۔ اپنے ہی مالک کو تھوک لگاتا ہے۔ جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ ویسے تیرا بھائی لگتا نہیں۔ کہیں خالہ نے کچھ گل تو نہیں کھلایا؟'

'اب کے تو حرافہ کی طرح باتیں کر رہی ہے۔ ویسے مجھے بھی شک ہوتا ہے اماں پر۔ نچھا چچا شروع سے اماں پر لٹو تھے۔ رشتہ ان کے بڑے بھائی سے طے ہو گیا۔ ابھی بھی بہت بن ٹھن کے رہتی ہے اماں نچھا چچا کے سامنے۔۔۔ سینہ پر دوپٹہ بھی نہیں لیتی۔' شمیم اپنی ماں اور سگے چچا کا ذکر کر رہی تھی۔

'پھر تو دیما ہنڈرڈ پرسنٹ تیرے چچا کا ہے۔ ناک نقشہ بھی وہی ہے۔ بچ کے رہیو۔ کسی دن تجھے ہی نہ پکڑ لے۔' افسانے نے متنبہ کرتے کہا۔

'ارے وہ اماں کے علاوہ کسی اور پر نہیں مرتے۔۔۔'

'میں تجھے دیمے سے ہوشیار کر رہی ہوں چچا سے نہیں۔۔۔'

'دیما تو میرا بھائی ہے۔۔۔' شمیم بولی۔

'حرامی بھی تو ہے!'

افسانے کی بات سن کر شمیم حیران ہو گئی۔ اسے لگا اس کی چوری پکڑی گئی۔ دیما ایک نہیں کئی بار پکڑ چکا تھا شمیم کو۔ جب اس نے ماں کو بتایا تو الٹا اسے ہی ڈانٹ پڑی۔ ماں نے یہ بھی تاکید کی کہ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرے۔ اگر دیما پکڑ بھی لے تو کوئی شور شرابہ نہ کرے ورنہ اس کا باپ دیمے کو تو کچھ نہیں البتہ اسے ضرور زمین میں گاڑ دے گا۔۔۔ وہ بھی زندہ۔

ماں کی بات سن کر شمیم بہت ڈر گئی۔ اس دن سے دیما اور بھی شیر ہو گیا اور اب وہ بھی اس کی عادی ہو چکی تھی۔ دیمے نے ایک بار افسانے سے بھی زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ دیما اس کے کمرے میں گھس گیا۔ افسانے نے تانبے کے گلدان سے اس کا سر کھول کے رکھدیا۔ نہ افسانے نے نہ دیمے نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا۔

افسانے مکمل طور پر تیار ہو چکی تھی۔ اس نے چادر اچھی طرح سے ساڑھی پر لے لی تھی۔ ماں بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اسکی خوبصورتی دیکھ کر پریشان بھی۔ آئے روز گینگ ریپ کی خبریں پھر اس لڑکی کا بے پناہ حسن۔ وہ لڑکیوں کے گھر سے باہر نکلنے کے حق میں نہ تھی۔ آج اسکی فکرمندی قدرے کم درجے کی تھی۔ بیٹی پبلک ٹرانسپورٹ میں نہیں جا رہی تھی۔ اس کی میڈم نے سب کے لئے ایک وین کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دل ہی دل میں ماں میڈم کو دعائیں بھی دے رہی تھی۔ کہ دیکھو کتنی سمجھدار ہے۔ جانتی ہے مشرق کی ریت رواج کو۔ معلوم ہے کہ عورت ذات رات کو تنہا گھر سے نکل کر اتنی دور نہیں جا سکتی۔ بہت ساری خواتین ہونگی وین میں۔ ڈرائیور بھی کچھ غلط نہ کر سکے گا۔

ایک اور سوچ اس کے ذہن میں خوشی کے دیے بھی روشن کر رہی تھی۔ بڑے گھر کی شادی میں جا رہی ہے بچی۔ فائیو سٹار ہوٹل میں ہے تقریب۔ ظاہر ہے بڑے لوگ ہی آئے ہونگے۔ اس قسم کی صورت حال وہ انڈین فلموں میں کئی بار دیکھ چکی تھی۔ ایک غریب گھرانے کی حسین بچی امیروں کی شادی میں شرکت کرنے جاتی ہے۔ کسی شہزادے یا اس کی ملکہ کی نظر لڑکی پر پڑ جاتی ہے۔ اور وہ ایک ہی نظر میں اسکے حسن سے متاثر ہو کر اسے اپنے گھر کی بہو بنا لیتی ہے۔

اسے یقین تھا کہ ایک نہیں کئی خواتین چند دنوں میں اسکے گھر کی دھلیز پر ہونگی۔ سب اس کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے مانگ رہیں ہوں گی۔ وہ سب سے امیر کبیر خاندان کو بیٹی دے

گی۔ لمبا چوڑا حق لکھوائے گی اور بیٹی کے نام کم از کم دس مرلے کا ڈبل سٹوری گھر بھی۔ ایک کنال ہو تو زیادہ اچھا۔۔۔ کوشش کنال کی ہی کرے گی۔ اس کے علاوہ ماہانہ خرچہ بھی ٹھیک ٹھاک لکھوائے گی۔ یہ خیالی پلاؤ اسکے ذہن میں بہت تیزی سے پک رہا تھا۔

بوبی افسانے کو گلی کے نکڑ تک چھوڑ کر گھر واپس آ چکا تھا۔ اندر آتے ہی وہ اس کمرے میں گھس گیا جہاں کچھ دیر پہلے اسکی بہن تیار ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ کمرہ اس کا بھی تھا۔ افسانے کے کپڑے اور دیگر چیزیں بستر پر بکھری ہوئی تھیں۔ گھر سے گلی کے نکڑ اور واپس گھر تک پہنچنے میں وہ ایک صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔ تھک چکا تھا۔ بے حال ہو کر اوندھے منہ بستر پر موجود کپڑوں پر گر گیا۔ جلد ہی میٹھی نیند کی آغوش میں تھا!

وین جب فائیو سٹار ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہوئی تو افسانے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پورا ہوٹل جگمگا رہا تھا۔ اتنی روشنی اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی۔ جب باوردی دربان نے دروازہ کھولا تو ایسا لگا وہ کسی دیس کی شہزادی ہے اور دربان اس کا ادنیٰ غلام! لابی میں قسم قسم کے لوگ تھے۔ کچھ ملکی اور کچھ غیر ملکی۔ کچھ عورتیں اور کچھ مرد۔

لابی کے پیچھے اوپن کافی شاپ تھی۔ سنگ مرمر کا فرش تھا۔ اگر ذرا بے احتیاطی کرتی تو گر پڑتی۔ لیکن ہوٹل کی ایک لڑکی مردوں جیسا سوٹ، پینٹ اور ٹائی پہنے ہائی ہیل میں جب اسکے سامنے تیزی سے ٹھک ٹھک کرتے گذری تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ ایسے ملائم اور چکنے فرش پر ہائی ہیل پہن کر اتنے آرام سے اتنا تیز نہیں چل سکتی تھی۔

'ہو نہ ہو یہ لڑکی یقیناً نٹوں کے خاندان سے ہے!' افسانے یہ سوچ رہی تھی۔ اس دوران ایک سوٹڈ بوٹڈ ڈیوٹی مینیجر اس کی جانب بڑھا۔ افسانے نے اسے شادی کا دعوت نامہ دکھایا۔ اس نے اس حسین لڑکی کو خود ہال تک پہنچانے کا ارادہ کیا۔ وہ باتیں کرتا چلتا رہا۔ افسانے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بار بار اسکی طرف دیکھتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ افسانے معاملہ بھانپ چکی تھی لہذا اس نے اسے کوئی بھاؤ نہ دیا۔ مینیجر کی دل میں تو خواہش تھی کہ ہال کبھی نہ آئے لیکن جب قدم آہستہ آہستہ بھی منزل کی جانب اٹھ رہے ہو تو ایک لمحہ ضرور آتا ہے جب مسافر اور منزل روبرو ہو جاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے چلنے کے باوجود ہال آ ہی گیا حالانکہ وہ اسے گھما پھرا کر لمبے راستے سے لایا تھا۔ وہ اس امید میں تھا کہ یہ لڑکی اسے اپنا بزنس کارڈ دے گی۔ جب ایسا نہ ہوا تو اس نے اپنا بزنس کارڈ افسانے کو دیا۔ ایسا کر کے وہ اپنے آپ کو کوئی بہت بڑا فاتح محسوس کر رہا تھا۔

افسانے ہال میں داخل ہونے سے پہلے اس کا کارڈ سٹینڈنگ ایش ٹرے میں پھینک چکی تھی۔ ایسا کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مینیجر ابھی تک اسکی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اسکی آنکھوں میں جوش کے بجائے مایوسی تھی۔ اسی لمحے افسانے کو یاد آیا کہ اس نے اپنے گائیڈ کا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے دور سے افسانے نے یہ شکریہ ہاتھ ہلا کر کیا پر یہ اظہار تشکر مینیجر کی افسردگی کا علاج نہ کر سکا۔

اب افسانے ہال میں داخل ہونے والی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ ہال میں قدم رکھتے ہی وہ کتنی نگاہوں کا مرکز بن چکی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ شکاری و عقابی نگاہ رانی کی تھی۔ وہ جھٹ سے اسکی جانب لپکی۔

'ہیلو مائی ڈیئر افسانے۔۔۔ ویلکم!'

'تھینک یو۔ آپ مجھے جانتی ہیں؟'

'تمہیں کون نہیں جانتا۔ ہر وقت تو ماریہ تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے۔ تمہاری تصویر اس کے بیڈ روم میں لگی ہوئی ہے۔ اس لئے میں تمہیں پہچان گئی۔ چلو ماریہ کے ویڈنگ سوئیٹ میں چلتے ہیں۔ یہاں بہت بھن بھن ہو رہی ہے۔ ویسے میرا نام رانی ہے۔ ماریہ کی بیس سالہ پرانی گہری دوست!'

اس تجربہ کار پچاس سالہ حسینہ کے لئے جو دکھنے میں ماریہ کی ہم عمر لگتی تھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس خوبرو دوشیزہ نے زندگی میں پہلی بار کسی فائیو سٹار ہوٹل میں قدم رکھا تھا اور یہ اس کی زندگی کی پہلی اہم تقریب تھی بڑے لوگوں کی۔ چادر ہی اسکی کلاس کا بھانڈہ پھوڑ چکی تھی۔ دونوں حسینائیں۔۔۔ ایک مکمل کھلا ہو پھول، دوسری تازہ کلی۔۔۔ ہال سے باہر نکلیں اور لفٹ کی جانب بڑھنا شروع ہوئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ شاید ایک دوسرے کا حسین لمس انہیں ان کے بیچ کسی پچھلے جنم کے خاص رشتے کی یاد دلا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد دونوں لفٹ میں تھیں۔ تیسرا کوئی نہ تھا۔ رانی نے مطلوبہ فلور کا بٹن دبایا اور اگلے ہی لمحے لفٹ چلنا شروع ہو گئی۔

'ویسے آپ کسی رانی سے کم نہیں لگتیں!'

بات بھی سچ تھی۔ رانی کا سن پچاس کا تھا۔ ابھی بھی بہت طوفان تھا اس کے اندر جو بڑے بڑے پیراکوں کو ڈبو کر رکھ دے۔ اسکے چاہنے والوں میں تو کڑیل جوان بھی تھے اور نوخیز لونڈے بھی۔

'کاش دس برس پہلے دیکھتیں! اب تو تم چڑھتا ہوا سورج اور ہم ڈھلتا ہوا ہیں۔'

'ویسے ڈھلتا ہوا سورج چڑھتے ہوئے سے کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے!' افسانے نے کہا

'ارے واہ کیا جملہ بولا تم نے۔ ایسی عقلمندی کی باتیں کس سے سیکھیں تم نے؟'

'تجربہ سب کچھ سکھا دیتا ہے!' افسانے بولی۔

'واہ! چھوٹی سے عمر یا اور بڑے بڑے تجربے۔' رانی نے آنکھیں مٹکاتے کہا۔

'کیوں؟ بعض اوقات کسی کھلونے سے کھیلتے بچے کے آگے کسی دانشور کی حکمت ماند پڑ سکتی ہے۔' افسانے نے سنجیدگی سے کہا۔

'آئی ایگری۔۔۔ ہنڈرڈ پرسنٹ۔ یو آر جسٹ لائک می! میں تمہارے تجربے سے سیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنا سٹوڈنٹ بنالو!' رانی نے کہا۔

'آپ شرمندہ کر رہی ہیں! میں تو خود سٹوڈنٹ ہوں۔'

ارے چادر تو اتارو۔ تمہار دم نہیں گھٹتا اس میں؟'

جب اس نے چادر ہٹائی تو رانی دم بخود رہ گئی۔

'آج تو جنت کی حور زمین پر ہے!'

'زمیں اور آسماں کے بیچ۔ ہم لفٹ میں ہیں۔'

'گریٹ سینس آف ہیومر۔۔۔ کیا تمہیں علم ہے تم دنیا کے خوبصورت ترین لڑکی ہو؟' رانی اسے دم دے رہی تھی۔

'شاید۔۔۔ کیونکہ سب یہ ہی کہتے ہیں۔' افسانے بولی۔

دونوں لفٹ سے باہر نکل کر سوئیٹ تک پہنچ چکی تھیں۔ رانی نے سویٹ کے دروازے پر دستک دی۔ ماریہ کی بیوٹیشن نے دروازہ کھولا۔ اپنی سٹوڈنٹ کو دیکھ کر ماریہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے سب کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ رانی اسکی مرشد دوست تھی۔ جینڈر ایشوز پر کام کرنے والی ایک بہت بڑی این جی او کی بانی سربراہ تھی۔

'اپنے نام کی طرح تمہاری سٹوڈنٹ کا حسن بھی افسانوی ہے۔ میں نے اس سے زیادہ خوبصورتی کہیں اور نہیں دیکھی حالانکہ دنیا کے چپے چپے میں پھر چکی ہوں۔' رانی اپنی سیاحت کا رعب ڈالتے بولی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ وہ کسی کا بھی پانی منٹوں میں اتارنے کا وسیع تجربہ رکھتی تھی۔

'لیکن رانی آنٹی اس وقت تو ساری کائنات میں میڈم ماریہ سے زیادہ خوبصورت اور کوئی نہیں۔' افسانے بولی۔

'اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن مجھے آنٹی شانٹی دوبارہ نہ کہنا۔ سب مجھے رانی کہتے ہیں۔'

'اس سے نہیں ہو سکے گا۔ یہ تو ابھی تک مجھے بھی میڈم ہی کہتی ہے۔ میرا نام اسکی زبان پر چڑھتا ہی نہیں۔' ماریہ بولی۔

'میں دونوں اس کے اوپر چڑھا دوں گی!' رانی نے کہا۔ اس ذو معنی جملے پر سب ہی ہنس دیے۔

'دکھاؤ تو ساڑھی میں کیسی لگ رہی ہو۔' ماریہ بولی۔

افسانے نے اپنی چادر اتار کر صوفے پر رکھ دی۔

'اف۔۔۔!' تینوں عورتوں کے منہ سے اکھٹی اک آہ سی نکلی۔

سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ افسانے کی ساڑھی بلاوز کے بائیں حصے کو تو ڈھانپ رہی تھی مگر دوسرا حصہ کچھ بھی چھپانے میں ناکام رہا۔ رانی تاڑ چکی تھی کہ ساڑھی کے نیچے کونسا خزانہ کتنی تعداد میں دفن ہے۔ وہ اس خزانے کو باہر نکالنا چاہتی تھی۔ دنیا کو ایک نئے عالم سے متعارف کروانا چاہتی تھی۔ سب دم بخود افسانے کو تک رہے تھے۔ اگر زلیخا کی سہیلیوں کی طرح ان کے ہاتھوں میں بھی پھل اور چاقو ہوتا تو سب اپنی انگلیاں کاٹ چکی ہوتیں! 'یہ لڑکی چاہے تو آسماں اپنے قدموں میں جھکا دے!' رانی کے دل نے اس سے سرگوشی کی۔

کچھ دیر گپ شپ کے بعد تینوں خواتین ہال میں تھیں۔ شادی کا یہ فنکشن رات دو بجے جا کر ختم ہوا۔ آخر میں علیحدہ محفل مخلوط بن چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماریہ اور عارف رخصتی سے کچھ دیر قبل ایک ہی صوفے پر براجمان ہو چکے تھے تاکہ دونوں طرف کے مہمان ان کے ساتھ تصاویر کھنچوالیں۔ فوٹو سیشن کے دوران افسانے ماریہ کے پہلو میں نہ بیٹھ سکی کیونکہ وہ جگہ رانی نے گھیر لی تھی۔ اسے عارف کے پہلو میں بیٹھنا پڑا۔ لیکن ایک عجب صورت حال پیدا ہوئی۔ عارف نے اپنا ہاتھ افسانے کے ران پر رکھ کر اسے سہلانا شروع کر دیا۔ افسانے کچھ نہ کر سکی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حرکت بری تھی۔ یہ اسے بوبی کی یاد دلا رہی تھی۔

وین گلی کے نکڑ تک پہنچ چکی تھی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ شکر ہے بجلی کی لوڈشیڈنگ اس وقت نہ تھی۔ سٹریٹ لائٹ جل رہی تھی۔ نکڑ سے پیدل اس کا گھر کوئی اڑھائی منٹ کی دوری پر تھا۔ خیریت سے گھر پہنچ گئی۔ مین دروازے سے وہ کمرہ جڑا تھا جو بوبی اور اس کے زیر استعمال تھا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کو ہلکا سا کھٹکھٹایا۔ بوبی کچھ دیر پہلے ہی جاگا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

'بہت دیر کر دی باجی آپ نے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا۔'

'کیوں ڈر لگ رہا تھا تجھے۔ تو ہی تو گھر میں واحد مرد ہے۔'

'اسطرح ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ میرا مطلب ہے آپکے بارے میں سوچ رہا تھا۔'

'اچھا یہ بات تھی۔ لے مٹھائی کھا۔'

'ہوں۔۔۔ برفی اور گلاب جامن۔ دونوں میرے پسندیدہ!' بوبی ہوشوں کی طرح کھانے لگا۔

'آرام سے کھا۔ دھسکا نہ لگ جائے۔'

'نہیں لگتا باجی۔ میں تو پورا ڈبہ ایک ہی سانس میں ختم کر دوں۔' وہ مسکرا دی بھائی کی معصومیت پر۔

'بہت تھک چکی ہوں میں۔ ہیل نے پاؤں میں درد کر کے رکھ دیا۔ اتنی دیر مسلسل پہلے کبھی پہنی جو نہیں۔'

'دبا دوں؟' بوبی نے پوچھا۔

'ہاں یار دبا دے اچھی طرح۔ سارا بدن ہی تھکن سے چور ہے۔ لیکن ذرا چینج کر لوں۔' افسانے نے ساڑھی کی پنیں کھولتے کہا۔ آخری پن کے باہر نکلتے ہی پوری ساڑھی ایک جھٹکے سے فرش پر گر گئی۔

'باجی آپ تو بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔ بالکل 'ستم شیوم سندرم' کی زینت امان کی طرح۔۔۔'

'تو نے کب دیکھی یہ فلم؟'

'شمیم باجی کے گھر وی سی آر پر۔'

'شرارتی کہیں کا۔ تجھے تب دیکھنی چاہیے تھی جب تو اٹھارہ برس کا ہو جاتا۔'

'لیکن میں تو ابھی اٹھارہ کا نہیں۔ پھر بھی آپ کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ ویسے آپ میں اور زینت امان میں کوئی فرق نہیں۔۔۔ غلط۔۔۔ بہت فرق ہے۔۔۔ آپ زینت امان سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔'

'اچھا زیادہ مکھن نہ لگا۔ تجھے میں خوبصورت یوں لگتی ہوں کہ میں تیری بڑی بہن ہوں۔ اور ہر چھوٹے بھائی کو اپنی بڑی بہن خوبصورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ ویسے کیسی تھی فلم؟'

'لڑائی مار کٹائی بالکل نہیں تھی۔ مجھے نہیں پسند آئی۔ تھوڑی دیر ہی دیکھی۔۔۔ لیکن آپ نے کہا کہ مجھے اٹھارہ برس کے بعد دیکھنی چاہیے۔۔۔ تو کیا آپ اب مجھ سے پردہ کریں گی اگلے پانچ سال؟'

افسانے کی یونیورسٹی گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھی۔ اس لئے صبح جلدی اٹھنے والا جھنجھٹ نہ تھا۔ وہ آرام سے اٹھتی۔ گھر کا کام کرتی۔ پھر کچھ مطالعہ کرتی۔ اسکے بعد محلے کے بچے ٹیوشن پڑھنے آجاتے۔ شام اسی میں ہو جاتی۔ ٹی وی پر کوئی اچھا پروگرام لگتا تو دیکھ لیتی۔ فلمیں وہ شمیم کے گھر پر دیکھتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شمیم وی سی آر اور وڈیو کیسٹس افسانے کے گھر لے آتی اور ساری ساری رات فلمیں چلتیں۔ دیما وڈیو شاپ پر ملازم تھا۔ جب کبھی وی سی آر کرائے پر نہ اٹھتا تو گھر لے آتا۔ اس صورت میں شمیم افسانے کو گھر بلا لیتی یا خود سب ساز و ساماں سمیت اس کے گھر پر محفل جماتی۔

یہ ہی واحد تفریح تھی لوئر مڈل کلاس کی۔ اس قسم کا پروگرام رات گئے شروع ہوتا۔ صبح تک جاری رہتا۔ افسانے کی ماں کو تو ایسی محفل پسند آتی کیونکہ وہ خود فلموں کی شوقین تھی۔ امیتابھ بچن اس کا پسندیدہ اداکار تھا۔ اس پر مرتی تھی۔ اس کی تصویر ہمیشہ اپنے پرس میں

رکھتی۔ پھر اسکی عمر ہی کیا تھی۔۔۔ محض اٹھتیس یا انتالیس برس؟ اپر کلاس کی اعلی تعلیمیافتہ لڑکیاں تو اس عمر میں گھر بسارہی تھیں۔ اس طرح محمودہ کی عمر تو رومانس کی تھی۔ اور وہ اپنی عمر سے کافی کم نظر آتی تھی۔ بہت اچھار کھا ہوا تھا اس نے اپنے جسم کو۔ ملک کا گھر چھ کلومیٹر دور تھا۔ پیدل آتی پیدل جاتی۔ اس طرح روزبارہ کلومیٹر کی واک ہو جاتی۔ فٹ تو رہنا ہی تھا!

فلموں والی محفل سے باپ کو اعتراض ہی رہتا۔ بیچارہ زن مرید تھا۔ بیوی اس کے اوپر ہر طرح سے حاوی تھی۔ وجہ یہ کہ محمودہ کے والدین نے بڑی مشکل سے رحیم بخش کا رشتہ منظور کیا تھا۔ محمودہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ رحیم بخش بس انکے گھر کا نوکر بن کر وہیں پڑا رہتا۔ محمودہ اس پر خوب رعب جماتی۔ وہ سب نخرے خوشی خوشی اٹھاتا۔ ایک دن یہ رشتہ پکا ہو ہی گیا۔ بیوی کی غلامی رحیم کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کی مجال نہ تھی بیگم کے آگے زبان کھولنے کی۔ محمودہ بچوں کے سامنے کھڑے کھڑے اسے بے عزت کر دیتی۔ اکثر ناراض ہو کر میکے میں لمبے عرصے کے لیئے ڈیرہ جمالیا کرتی۔ یہ وطیرہ ابھی تک جاری تھا۔ اور میکہ بھی کوئی دور نہ تھا۔ پیدل بیس منٹ کا راستہ۔ کچھ عرصہ پہلے ہی محمودہ پورا ایک مہینہ میکے گذار کر آئی تھی۔ اگر افسانے اسے آنے کا نہ کہتی تو اس نے ایک مہینہ مزید وہیں ٹکے رہنا تھا۔ لیکن بیٹی کے آگے محمودہ کی نہ چلتی۔

شمیم کے مالی حالات نسبتاً بہتر تھے۔ اس کا ایک بھائی فون کے محکمے میں لائن مین تھا۔ اس زمانے میں لائن مین کی بڑی ٹور ہوا کرتی تھی۔ شمیم کے گھر فون لگا ہوا تھا۔ افسانے نے یہ نمبر اپنی خاص سہیلیوں کو دیا ہوا تھا۔ اس فہرست میں نیا نام رانی کا تھا۔

افسانے ابھی ابھی اٹھی تھی۔ دن کے نو بج چکے تھے۔ اگر یونیورسٹی کھلی ہوتی تو اسے صبح پانچ بجے اٹھنا پڑتا۔ نہا دھو کر ناشتہ کر کے بس پکڑ کر یونیورسٹی پہنچنے کا عمل تین گھنٹوں پر محیط تھا۔ اس لحاظ سے نو بجے تک بستر میں گھسے رہنا ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ باپ آفس جا چکا تھا۔ ماں کام پر جانے کی تیاری پکڑ رہی تھی۔

'اٹھ گیا میرا بیٹا!' ماں اسے بیٹی کے بجائے بیٹا کہا کرتی تھی۔

'کنڈا لگا لے میں نکلتی ہوں۔ پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہوں۔'

بوبی ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ سرکاری سکول میں ساتویں کلاس کا طالبعلم تھا۔ ہر سال اپنی کلاس میں اول آتا۔ یہ بہن کی محنت کا نتیجہ تھا۔ استاد بھی اس پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ وہ تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتا اور ہمیشہ کپ جیت کر لاتا۔ اسے گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسکی بہن اسے مثبت اور تعمیری سرگرمیوں میں مصروف رکھتی۔ یونیورسٹی کی لائبریری سے مختلف کتابیں اور رسائل لا دیتی جنہیں وہ پڑھتا رہتا۔

'اٹھ بھی جا۔ سارا دن سوتا رہے گا کیا؟'

'اٹھتا ہوں باجی!'

'میں نہا دھو کر ناشتہ بناتی ہوں۔'

وہ غسل خانے میں گنگناتے نہا رہی تھی۔ صابن ملتے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ کمر تک نہ پہنچا۔ ایسے میں بوبی مسئلے کا آسان حل تھا۔ غسل خانے کا کواڑ کھول کر افسانے نے چلا کر 'بوبی' کہا۔ 'بوبی' کہنے کا یہ انداز ایک منفرد سر اور لے میں تھا جس سے چھوٹا بھائی اچھی طرح مانوس تھا۔ جھٹ بستر سے نکل کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ جب صابن ملنے لگا تو اسے اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں یہ درست اندازہ ہوا کہ کمر پر میل ہے۔ گرمی اور حبس میں ایسا ہوتا ہے۔

'باجی جھاواں لگا دوں؟'

'ہاں لگا دے!' بوبی جھاوے سے اسکا بدن صیقل کرنا شروع ہو گیا۔ دونوں کو اس عمل میں کچھ بھی عجیب محسوس نہ ہوتا۔ وہ بہن ہی کے ہاتوں میں پلا پڑھا تھا۔ وہ ابھی تک اسے نہلایا کرتی تھی۔ صابن اور جھاوے کے عمل میں بھائی آدھا تو بھیگ ہی جاتا اور حبس میں ایسی مشقت اسے پسینوں پسینے کر دیتی۔ پیٹھ پر صابن ملوانے کے بعد جب وہ کھلا پانی اپنے بدن پر ڈالتی تو چھینٹے بھائی کو مزید گیلا کر دیتے۔ پھر وہ اسے کہتی کہ تو بھی نہا لے۔ آدھا تو نہا ہی چکا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اسکے کپڑے اتار کر ایسے رگڑ رگڑ کر نہلاتی جیسے وہ تیرہ نہیں تین برس کا بچہ ہو۔

کوئی نو برس کی عمر تک تو افسانے اسے اسی طرح نہلاتی رہی۔ اس کے بعد ماں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ دونوں اس فیصلے سے ناخوش تھے۔ حل یہ نکالا گیا کہ اب افسانے اسے تب نہلائے گی جب ماں گھر پر نہ ہو۔ اور وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔ بھائی نے بہن کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لمس اچھا لگتا تھا۔ یہ لمس خلوص سے بھرپور تھا۔ اس میں قدرتی پیار تھا۔ کوئی لالچ نہ تھا۔ صرف سچائی تھی۔ یہ سب چیزیں اب ناپید ہوتی جا رہی تھیں۔

نہا دھو کر وہ اپنے اور بھائی کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ اس دوران شمیم آ گئی۔ رانی کا پیغام تھا۔ اس نے ماریہ اور عارف کے اعزاز میں ایک ڈنر پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی افسانے بھی شریک ہو۔

'تو چائے پی پھر اکٹھے چلتے ہیں۔ فون بھی کر لونگی اور کوئی اچھی فلم بھی دیکھوں گی۔ ستم شوم سندرم ہے؟' افسانے نے شمیم سے کہا۔

'ابھی نہیں ہے۔ لیکن دیپے سے مل سکتی ہے۔ لیکن ایک اور زبردست فلم ہے۔ تجھے وہ دکھاؤں گی تو خوش ہو جائے گی۔ لیکن بوبی ساتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔'

'کیوں؟'

'انگریزی فلم ہے۔ بوبی نہیں دیکھ سکتا۔'

'تجھے کس نے بتایا اس فلم کا؟'

'مجھے کسی نے نہیں بتایا۔ بس دیما دیکھ رہا تھا رات کو۔ چھپ چھپ کر میں نے بھی دیکھ لی۔'

'تو بڑی حرافہ ہے!' افسانے بولی اور شمیم ہنس دی۔ سچ تو یہ تھا کہ شمیم اور دیما یہ فلم اکھٹے کئی بار دیکھ چکے تھے۔

رانی سے فون پر یہ طے ہوا کہ اس کا ڈرائیور افسانے کو گھر سے اٹھائے اور چھوڑے گا۔ یہ ہی واحد وقت تھی اس کے کہیں آنے جانے میں جو رانی حل کر چکی تھی۔ اس کے بعد شمیم اور افسانے اس کمرے میں گئے جہاں وی سی آر اور کلر ٹی وی تھا۔ شمیم نے ایک کیسٹ کپڑوں کی پیٹی سے نکالی اور وی سی آر میں ڈالی۔ ٹی وی پر لکیریں ہی لکیریں ابھریں۔ 'کم بخت ہیڈ میں کچرا آگیا! یہ بھی اسی وقت ہونا تھا۔' شمیم نے کیسٹ کو نکال کر ہیڈ کلینز کا سپرے کیا اور چند سیکنڈ گذرنے کے بعد کیسٹ دوبارہ وی سی آر میں ڈالی۔ اس بار چمکیلی سی تصویر ٹی وی پر نمودار ہوئی۔

'کتنا صاف پرنٹ ہے۔ لگتا ہے ماسٹر ہے!' شمیم بولی۔ پھر وہ بھی افسانے کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ فلم اپنے وقت کی مشہور 'باربرا براڈ کاسٹ' تھی۔۔۔ اینت ہیون کی۔ کچھ دیر بعد اس میں عجیب مناظر ابھرنے لگے۔ افسانے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسکا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ غصے سے نہیں۔ جوش، حیرت اور تجسس سے۔ وہ دم بخود فلم دیکھتی رہی۔ شمیم ایک نظر اس پر اور دوسری ٹی وی پر ڈالتی۔

شمیم کے گھر سے اپنے گھر تک چلتے افسانے کی ذہن میں وہی فلم چل رہی تھی۔ 'کتنی خوبصورت تھی ہیروئین!' وہ سوچ رہی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ تھک چکی تھی۔ بوبی انہماک سے ہوم ورک کر رہا تھا۔

'ہوم ورک چھوڑ۔ بہت تھک چکی ہوں۔ سارا بدن دکھ رہا ہے۔' یہ کہہ کر وہ بستر پر اوندھے منہ گر گئی۔ بوبی اسے نرم نرم ہاتھوں سے دباتا رہا۔ وہ فلم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جلد ہی میٹھی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کچھ دیر بعد بوبی بھی تھک گیا۔ بچہ ہی تو تھا آخر! وہ بھی وہیں سو گیا۔

باب 3

پراسرار عورت!

'یار کچھ دیر پہلے مجھے اپنی ایک پرانی فی میل کلاس فیلو کا فون آیا تھا۔ بہت رو رہی تھی۔ شوہر نے مارا پیٹا تھا۔ کچھ کر سکتے ہو؟' چوہدری نے اپنے صحافی دوست شہباز سے فون پر پوچھا۔

'پریس کانفرنس تو آرام سے ہو جائے گی۔ پولیس میں رپورٹ بھی ممکن ہے۔' شہباز نے کہا۔

'اسکا شوہر اثر ورسوخ والا بندہ ہے۔ پولیس والا معاملہ نہیں ہو سکے گا۔ پریس کانفرنس ٹھیک رہے گی۔ کیسے ہو گا؟' چوہدری نے پوچھا۔

'بھئی بہت ساری این جی اوز یہاں عورتوں کے حقوق کے لئے کام کر رہی ہیں۔ انہیں تو چاہیے کوئی ایسا موضوع شور مچانے کے لئے۔ وہ تو خوشی خوشی اس معاملے کو اچھالیں گی۔ آپکی دوست کو اپنے درمیان بٹھا کر پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس داغ دی جائے گی۔ لمحے بھر میں یہ خبر چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس کا شوہر سب سے منہ چھپاتا پھرے گا اور آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔' شہباز نے کہا۔

'زبردست۔۔۔ میں اسے تمہارا نمبر دے دیتا ہوں۔ غزالہ نام ہے اس کا۔'

کچھ دیر بعد فون دوبارہ بجا۔

'آئی ایم غزالہ۔۔۔' ایک خوبصورت نسوانی آواز تھی۔

'آپ ہی کے بارے میں بات ہو رہی تھی چوہدری صاحب سے۔ بہت دکھ ہوا سنکر۔'

'آپ آ سکتے ہیں؟'

'اس وقت؟'

'یس۔۔۔'

'اتنی رات گئے؟ آپ کے شوہر بھی گھر ہوں گے۔ نامناسب سا لگتا ہے۔'

'مجھے تو کوئی پرابلم نہیں! اور رہی بات شوہر کی تو وہ اکثر مجھے پیٹتے ہیں۔ پیٹنے کے بعد گھر سے نکل جاتے ہیں۔ پھر تین دن سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے۔'

'پھر بھی۔۔۔ یہ وقت مناسب نہیں۔ صبح مل لیتے ہیں۔'

'جیسے آپ کی مرضی۔ ایڈریس میسج کر دوں گی۔ کل سہہ پہر چائے میرے ساتھ پیجیے۔'

'ڈن۔۔۔' شہباز نے کہا۔

شہباز ایک مشہور این جی او میں میڈیا آفیسر تھا۔ اس ادارے کی گذر بسر بھی غیر ملکی پیسے سے ہی ہوتی تھی۔ تنخواہ کام کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ لیکن یہاں سیکھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ اس جگہ ٹکے رہنے کی ایک وجہ اس کا مرد باس تھا۔ نام نہاد دانشور نہ تھا۔ اسے اپنے کام کا علم تھا۔ بہت محنتی تھا۔ دوسری این جی اوز میں لوگ اپنے ادارے میں بیٹھ کر کام دیگر بڑی غیر ملکی این جی اوز کیلئے کیا کرتے تھے۔ یا اپنی ہی این جی او کے وقت اور پیسے سے اپنی کتابیں لکھتے اور چھپواتے۔ یہ ایسا نہ تھا۔ سب اسے نپولین کہتے تھے۔ ایک مکمل نمونہ تھا۔

شاید اسے نپولین کا نام یوں دے دیا گیا تھا کہ یہ قد میں ناٹا تھا۔ اس کا فلسفہ مینجمنٹ نرالہ تھا۔ یہ لوگوں کو چھٹی کے بعد دیر تک بٹھانے کا قائل تھا۔ اسے ایسا کر کے راحت محسوس ہوتی۔ دن بھر سٹاف کو فضول قسم کی میٹنگز میں الجھائے رکھتا۔ جب ان کے گھر جانے کا وقت ہوتا تو یہ کام کی بابت سوالات کرنا شروع ہو جاتا۔ اس معاملے میں یہ خواتین کو بھی نہ بخشتا۔ صبح نو سے شام پانچ تک اس کا موڈ شدید آف رہتا جیسے بیوی سے ڈانٹ کھا کر آیا ہو۔ پانچ بجے کے بعد چونکہ اس نے سٹاف کو آگے لگانا ہوتا تھا، یہ خوش مزاج بن جاتا۔

اسکی فتوحات کا معیار یہ تھا کہ کس کو کتنی دیر دفتر میں بٹھائے رکھا۔ یار لوگ بھی اسکی فطرت سمجھ چکے تھے۔ فون پر گپیں لگاتے اور انٹرنیٹ پر پورنوگرافی دیکھتے۔ اسطرح نپولین کو خوش کر دیتے۔ اگر کوئی نپولین سے اختلاف کرتا تو وہ جھٹ سے یاد دلا دیتا کہ تم کام تو کرتے نہیں۔ تمہیں تو پورنوگرافی سے ہی فرصت نہیں! اگلا بیچارہ چپ کر جاتا۔ یعنی کون پورنوگرافی دیکھ رہا ہے، نپولین کو سب علم ہوتا۔ لیکن نظر انداز کر دیتا کیونکہ اس بہانے دیر تک بیٹھا تو!

یہ ہی ایک بنیادی وجہ تھی لوگوں کے اس دفتر میں زیادہ عرصے نہ رکنے کی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نپولین عظیم انسان تھا۔ کبھی کسی کا برا نہ چاہا۔ جو بھی اسے چھوڑ کر جاتا اسے اس کی مرضی کا سرٹیفیکیٹ دیتا۔ بلکہ اپنی جان چھڑانے کے لئے کہتا کہ بھائی تو خود ہی تعریفی خط لکھ لے۔ اگر تو نے اس پر یہ بھی لکھ دیا کہ تو پانی پر چل سکتا ہے اور ہوا میں اڑ سکتا ہے تو میں تصدیق کر دونگا۔ اس کی اسی مہربانی کی وجہ سے سینکڑوں لوگ نپولین کو چھوڑ کر بڑے اداروں میں اچھے عہدوں پر گئے حالانکہ ان میں بھاری تعداد نالائقوں کی تھی۔

نپولین عورتوں کا شوقین نہ تھا۔ عموماً مرد باس کی پرسنل سیکریٹری عورت ہوتی مگر نپولین سیکریٹری ہمیشہ مرد کو ہی رکھتا۔ شاید اس لئے کہ صرف مرد سیکریٹری ہی رات دیر تک دفتر میں بیٹھ سکتا تھا۔ اسی لئے خواتین اس کے ادارے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتیں۔ لیکن شہباز اس معاملے میں بے انتہا کنفیوز بھی تھا۔ اس کی وجہ ایک لڑکی مینا تھی۔ یہ لڑکی ادارے میں بطور

ٹرینی آئی تھی۔ اوسط درجے کی ذہین اور محنتی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا گیا۔ حالانکہ بڑے باپ کی بیٹی نہ تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد یہ پروگرام آفیسر بن گئی اور پھر جلد ہی پروگرام مینیجر۔ اس کے برعکس جو شخص بھرتی ہی پروگرام مینیجر ہوا اور جسے سب ادارے کا نائٹ مانتے مینیجر کا مینیجر ہی رہا۔ اس نائٹ کا نام شہسوار تھا۔

شہباز کا تجربہ رنڈی بازوں کیساتھ یہ تھا کہ یہ قبیلہ ایک لڑکی کو چند ماہ سے زیادہ برداشت نہیں کرتا۔ انہیں ہر دو یا زیادہ سے زیادہ تین ماہ بعد نئی ورائٹی درکار ہوتی۔ اس بات کو مد نظر رکھتے وہ اس سوچ پر کاربند رہنے پر مجبور تھا کہ نپولین کا مینا کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا۔ لیکن یہ سوچ بدلتی رہتی۔

شہباز اس ادارے میں کام کرنے کے علاوہ آزاد صحافت بھی کرتا۔ اس معاملے میں نپولین اسے بھرپور مدد فراہم کرتا۔ بعض اوقات وہ کئی دنوں کے لئے فیلڈ میں رپورٹنگ کے لئے نکل جاتا جس کا ادارے سے کچھ لینا دینا نہ ہوتا اور نپولین اس کے کام کو سراہتا۔ یہ آزاد صحافت اسے غیر ملکی پریس تک لے آئی جہاں سے اسے اچھا معاوضہ مل جاتا۔ اس نے درجنوں ایسے مضامین لکھے جس پر طاقتور حلقے ناخوش ہوئے۔ نپولین کو طلب کیا گیا کہ شہباز کو نوکری سے فارغ کر دے۔ مگر نپولین ڈٹ گیا۔ اس وجہ سے اس کے دل میں نپولین کی بے انتہا عزت تھی۔

شہباز کی وجہ سے ادارے کی سرگرمیوں کی کوریج جو پہلے لوکل اخبارات تک محدود تھی، انٹرنیشنل پریس تک پہنچ چکی تھی۔ صحافت اور عملی زندگی کی بدولت شہباز گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ اس عورت کی بات سے حیران تھا کہ ابھی آجاؤ اور شوہر گھر پر موجود نہیں ہے۔ کوئی شریف زادی ایسا کہہ سکتی تھی؟ ہو سکتا ہے دل کا حال کہنا چاہ رہی ہو پر کوئی سننے والا نہ ہو۔ وہ ان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ فون تیسری بار بجا۔

'اب کون ہے کم بخت؟' یہ سوچتے اس نے کال لی۔

'آپ بہت بڑے علمبردار بنے پھرتے ہیں انسانی حقوق کے۔ میں آپ سے درخواست کر رہی ہوں کہ آجائیں مگر آپ نخرے دکھا رہے ہیں۔ جب کوئی ضرورت پڑنے پر ہی کام نہ آیا تو کیا فائدہ؟'

'غزالہ بی بی آپ غلط سوچ رہی ہیں۔ میں آپ سے ضرور ملونگا مگر صبح۔ چند گھنٹوں ہی کی بات ہے۔ اب رات کے دو بج چکے ہیں۔'

'صبح آنے کی ضرورت نہیں۔ آنا ہے تو ابھی آیئے۔ گیٹ کھلا ہو گا!' فون کٹ گیا اور شہباز گم سم! ویسے بھی جنسی ہراسانی کی وبا پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ سینکڑوں عورتیں

خود ہی مردوں کو لبھا کر ہراسانی کا الزام لگا کر انہیں نوکریوں سے نکلوا چکی تھیں۔ دل و دماغ سے کافی دیر تک جہاد کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے جانا چاہیے۔

شہر کے پوش علاقے میں وسیع و عریض یہ گھر پرانی طرز کا تھا۔ گیٹ واقعی کھلا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا پورچ کی سب بتیاں روشن ہو گئیں۔ وہاں دیگر گاڑیوں کے علاوہ ایک سفید رنگ کی سن انہتر کی ٹویوٹا کرونا کھڑی تھی۔۔۔ کمال کی کنڈیشن میں! وہ اس کا تفصیلی معائنہ کرتا اگر ٹھک سے جالی والا دروازہ نہ کھلتا۔

'اندر آ جائیے۔۔۔' وہی فون والی آواز شہباز کے کانوں سے ٹکرائی۔

'آپ غزالہ ہیں؟'

'جی۔۔۔ اور آپ شہباز ہی ہیں نا یا کوئی کاربروکر؟'

'جی شہباز ہی ہوں۔ دراصل مجھے پرانی گاڑیوں کا شوق ہے۔۔۔'

ویلکم۔۔۔' یہ کہہ کر غزالہ گھر کے اندر چلی گئی۔ گھر کی مختصر گیلری سیکنڈوں میں ختم ہو کر لاونج میں کھل گئی۔ پھر وہ مڑی۔ اب دونوں روبرو تھے۔ ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔۔۔ بنا کچھ بولے۔

غزالہ بہت ہی خوبصورت عورت تھی۔ شہباز سے قریب بارہ برس چھوٹی۔ بہت ہی باریک کالی نائٹی میں تھی۔ وہ خود بیالیس برس کا تھا۔ بدن کا کونسا کونا ہو گا جو اس کی نظر باآسانی ڈھونڈھ نہ سکے۔ بہت ہی سخت چھاتیاں۔۔۔ تنی ہوئی۔ بیلی چین اور اسکے نیچے گھنا پھیلا ہوا قدرتی بلیک فورسٹ۔ نیچرل بیوٹی۔ سلم باڈی۔ خوش نما متناسب وضع کا بدن۔ بالکل پورن سٹار اینت ہیون کی طرح۔ پورا جسم چمکتا دمکتا سوائے اس جگہ کے جس نے بیلی چین کو سہارا دیا ہوا تھا۔ قد اتنا ہی جتنا شہباز کا۔۔۔ پانچ فٹ آٹھ انچ۔ رنگ گورا۔ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جن کے نیچے چند نیل جنہیں دیکھ کر شہباز اداس ہو گیا۔ یہ سب منظر اک پل سے زیادہ کا نہ تھا۔ اور اسی پل میں دونوں ایک دوسرے کا مطالعہ کر چکے تھے۔

'ٹیک اے سیٹ!' اسنے بازو پھیلا کر ہاتھ کی انگلی کے اشارے سے کہا۔ پل بھر میں شہباز کو ایک اور گھنا بلیک فارسٹ دکھائی دیا جو اسکی کی دائیں چھاتی کی سائیڈ سے نمودار ہوا۔ ایسی خوبصورتی اسے اپنے ملک میں بہت ہی کم دیکھنے کو ملی۔ کچھ دین کچھ کلچر۔۔۔ یہ عوامل قدرتی اور گھنے جنگلات پھیلنے نہ دیتے۔

'لگتا ہے عورت پہلی بار دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔' وہ بولی۔

'آپ جیسی خوبصورت پہلی بار۔۔۔'شہباز نے کہا۔ یہ بات سن کر غزالہ مسکرا دی۔

'کیا لینگے۔۔۔ چائے، کافی، جوس یا کچھ اور؟' غزالہ نے 'کچھ اور' ایک خاص ادا سے کہا جس میں مسکراہٹ اور خفیف سا طنز تھا۔

'کچھ اور ٹھیک رہے گا۔۔۔'

'مجھے بھی "کچھ اور" ہی اچھا لگتا ہے!' غزالہ یہ کہہ کر کچن میں گئی۔ اس کا بدن مست ہوا کی طرح جھوم رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ نئی بوتل اور گلاس لیے واپس لوٹی۔

'برف، سوڈا یا پانی؟'

'دودھ اور "کچھ اور" ملاوٹ کے بغیر ہی اچھے لگتے ہیں۔

'آپ اب بھی دودھ پیتے ہیں؟'

'جی لیکن صرف تازہ اور ملاوٹ سے پاک!' شہباز نے کہا۔

'میرے پاس صرف تازہ اور ملاوٹ سے پاک ہی ملے گا۔ پینا پسند کرینگے؟'

'پھر کبھی ضرور پیئیں گے!' اس نے کہا اور دونوں ہنس دیے۔

'یہ ونٹاج گاڑی کس کا شوق ہے؟'

'یہ میری سوکن ہے۔ میرے شوہر کا دوسرا عشق!' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

'دوسرا عشق۔۔۔ پہلا عشق کیا ہے ان کا؟

'مجھے مارنا۔۔۔'

'اکثر ایسا ہی کرتے ہیں؟'

'کیا؟' اس نے چھت کو گھورتے کہا۔

'مارپیٹ۔۔۔'

'بس کبھی کبھار۔۔۔'

'یہ تو اکثر ہی ہے۔ آپ پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کرتیں؟'

'پولیس اس کے گھر کی لونڈی ہے۔۔۔'

'تو پھر آپ نے میرے دوست کو فون کیوں کیا؟'

'دکھ کی شدت کم کرنے کے لئے۔۔۔' وہ سر کو صوفے کی ٹیک سے لگا کر چھت کو گھور رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر حزن نمایاں تھا۔ اس کی گردن تک صراحی دار تھی۔ یوں لگتا تھا بنانے والے نے اس کے بدن کی ہر شے پر فبوناچی ریشو اپلائی کر رکھی تھی۔

'پریس کانفرنس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'

'آپکے خیال میں مجھے یہ باتیں پتہ نہ ہونگی؟ اس شہر میں عورتوں کے لئے کام کرنی والی ایک مشہور این جی او میری اپنی کزن چلاتی ہے۔'

'رانی؟'

'نہیں۔'

'سارہ ی سرمست؟'

'یس!'غزالہ نے کہا۔

'

ایک نمبر کی حرافہ ہے۔۔۔'اس کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ لفظ نکل گیا۔ وہ پچھتایا یہ سوچ کر کہ اس لفظ سے غزالہ کو دکھ ہوا ہو گا۔ لیکن وہ حیران ہوا جب غزالہ نے اس کی بات کی تائید کر ڈالی۔

'وہ این جی او نہیں چکلہ چلاتی ہے۔ خود اس کے پلے کچھ ہے نہیں۔ موٹی کالی بھینس۔ اوپر سے ہندوؤں کی طرح ماتھے پر تلک تھوپ لیتی ہے! ساڑھی میں ننگی پھرتی ہے پارٹیوں میں۔ پورا جسم نظر آرہا ہوتا ہے۔ بہت جان مارتی ہے کہ کوئی ایک نظر ڈال لے اس کے ڈب کھڑبے جسم پر۔ کوئی تھوکتا بھی نہیں اس پر۔ ہے ہی کچھ نہیں اس کے پاس۔ ہاں البتہ اسے دیکھ کر سب توبہ توبہ ضرور کرتے ہیں۔

خوبصورت لڑکیاں اچھی تنخواہ پر رکھ لیتی ہے اور ڈونرز کے علاوہ ہر طاقتور اور بااثر مرد کو سپلائی کرتی ہے۔ جب پہلی بار میرے شوہر نے مجھے مارا تو میں روتے روتے اس کے پاس گئی۔ میری کہانی سنکر اس کتیا نے کہا کہ تو کتنی احمق ہے۔ پریس کانفرنس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ ڈونر کو بلانا پڑتا ہے۔ میڈیا کو دعوت دینا پڑتی ہے۔ فائیو سٹار ہوٹل میں ہال بک کرانا پڑتا ہے۔ کم از کم ایک ہفتہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ اس دوران تیرے یہ نیل غائب ہو جائیں گے۔

ہاں اگر تیرے شوہر نے تیرے چہرے پر تیزاب پھینکا ہوتا تو تیری کہانی نے سب کو ہلا دینا تھا۔ وزیر اعظم تک خود چل کر تیرے پاس آتا۔ تجھے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتا۔ تجھے لندن یا امریکہ سرکاری خرچے پر بھیجتا علاج کے لئے۔ تیری پلاسٹک سرجری کرا کر تجھے تیرا حسن لوٹا دیتا۔ ان ڈھائی نیلوں کے ساتھ تو پولیس بھی تیری رپورٹ درج نہ کرے۔ میری این جی او تو سیریس ایشوز کو اٹھاتی ہے جو معاشرے میں سنسنی پھیلا دیں۔ ایسے ہی تو گرانٹ نہیں دے دیتا ہر سال ڈونر۔ پوری بنیاد بنانی پڑتی ہے۔ ڈرامہ کرنا پڑتا ہے۔

تو چاہے تو ایک کام ہو سکتا ہے۔ میرے پاس کمال کا میک اپ مین ہے۔ وہ تیرا ایسا میک اپ کر دے گا جیسے چہرہ تیزاب سے جھلسا ہوا ہو۔ ہمارے سو میں سے ننانوے کیسز اسی میک

اپ کا کمال ہوتے ہیں۔ کسی بھی لڑکی کو پکڑ لو۔ میک اپ کر دو۔ پھر ڈونر کو بٹھا کر پریس کانفرنس کر دو۔ لڑکی سامنے نہ بھی ہو تو اسکی میک اپ والی تصویریں سلائیڈ پر چلا دو۔ ان تصاویر میں وہ ایسے ہی دکھے گی جیسے تیزاب زدہ ہو۔ اور پھر گرانٹ کی صورت میں ڈالروں کی بارش ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فارن ٹور علیحدہ۔ یہ باتیں سنکر جانتے ہو میں نے کیا کیا؟'

'کیا کیا؟

ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ صرف تھوک دیا اسکے چہرے پر۔ یہ تھوک تیزاب سے کہیں زیادہ مہلک تھا۔ مگر وہ آگے سے مسکرا دی۔ اس کی بے حیائی، بے غیرتی اور بے شرمی کسی بھی جھلسا دینے والے تیزاب سے کہیں زیادہ مہلک تھی۔' غزالہ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

'آپ درست کہہ رہی ہیں۔ لیکن غلط بھی۔ ابھی تو آپ نے کہا کوئی تھوکتا بھی نہیں ساروی سرمست پر۔ آپ نے تو تھوک دیا۔۔۔' شہباز نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ لاونج کے عقب میں بل کھاتی سیڑھی سے ایک گنجا مرد نمودار ہوا۔

'آپ کب جاگے ڈارلنگ؟'

'کچھ دیر پہلے۔' گنجے نے جواب دیا۔ اسکی عمر غزالہ سے بیس برس تو لازمی اوپر ہو گی۔ پتلا دبلا درمیانے قد کا تھا۔

'ان سے ملئے میرے دوست شہباز۔ اور یہ میرے شوہر افضال۔۔۔'

'بہت خوشی ہوئی آپ سے ملکر۔ تشریف رکھیے۔ مجھے بس ایک پیگ درکار تھا چھوٹا سا۔ آپ دونوں اپنی گفتگو جاری رکھیں۔' پیگ بنا کر وہ غائب ہو گیا۔

شہباز غزالہ سے خاموشی کی زبان میں ایک سوال پوچھ رہا تھا۔ غزالہ کے چہرے پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔

'اگر سچ بولتی تو تم اس وقت ہر گز نہ آتے۔۔۔' وہ "آپ" سے "تم" پر آچکی تھی۔

'افضال کمزور ہے۔ جس دن کمزوری اس پر حاوی ہوتی ہے وہ مردانگی کا مظاہرہ میرے چہرے پر نیل ڈال کر کرتا ہے۔ مجھ سے دیوانہ وار پیار کرتا ہے۔ مردانگی کے اس دورے کے بعد اس پر دوسرا دورہ پڑتا ہے۔۔۔ پچھتاوے کا! پھر وہ مداوا کرتا ہے۔۔۔ حسین طریقے سے۔ مجھے میری مرضی کے مرد کے ساتھ سونے دیتا ہے۔ اس بات کو یقین بنانے کے لئے، کہ میں مکمل خوشی حاصل کر رہی ہوں، وہ وہیں موجود رہتا ہے۔ مجھے راحت، سرور اور سکون کی حالت میں دیکھ کر وہ اپنا پچھتاوا بھول جاتا ہے۔ مجھے ہیجان خیز حالت میں پا کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہی وہ شیر ہے جسکی وجہ سے میں نشاط کی بلندیوں پر ہوں۔'

'کتنا عرصہ ہوا تمہاری شادی کو؟' اب شہباز بھی غزالہ سے بے تکلف ہو چکا تھا۔

'نو برس!'

'کتنے بچے ہیں؟'

'دو بیٹے ہیں۔۔۔ لندن میں۔'

'کس سے؟'

'افضال سے۔۔۔'

'پر وہ تو نامرد ہے۔۔۔'

'ہمیشہ نہیں رہتا۔۔۔ دونوں اسی سے ہیں۔ میں باسٹرڈ جننے کے خلاف نہیں مگر افضال نہیں چاہتا گھر میں حرامی بچے۔۔۔'

'وہ کیوں مجبور کرتا ہے تمہیں گناہ پر؟'

'کب کہا وہ کرتا ہے؟ تم صحافی لوگ الفاظ دوسروں کے منہ میں ڈال کر کوٹ کر دیتے ہو۔۔۔ جب اس سے کچھ نہیں ہوتا تو میرے اندر طوفان اٹھتا ہے۔ اب اسے کون تھامے؟ افضال کو پھر احساس کمتری ہوتا ہے جسے وہ مجھے مار کر دور کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اسے ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بہت پچھتاتا ہے۔ بچوں کی طرح روتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے۔ گھنٹوں میرے قدموں میں گڑگڑاتا ہے۔ پھر کہتا ہے جو تم کہو گی میں کروں گا۔ میں کہتی ہوں مجھے مرد لا کر دے جو مجھے سنبھال سکے۔ اور تو اسے دیکھ کر کچھ سیکھ۔ تلاطم خیز موجوں کو پر سکون ہوتے دیکھ کر وہ بھی پر سکون ہو جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں دوبارہ سے ہنسی خوشی رہنا شروع ہو جاتے ہیں۔' غزالہ نے کہا۔

'تو تمہیں بھی اچھا لگتا ہے کہ افضال وہیں رہے اور سب کچھ دیکھے۔۔۔' شہباز نے پوچھا۔

'آف کورس!' غزالہ نے جواب دیا۔

حیرت زدہ شہباز اس کہانی کو سرے سے ہی جھوٹ قرار دے دیتا اگر اس نے دنیا نہ دیکھی ہوتی۔ لیکن ایسی داستان کا واسطہ اسے اپنے کلچر میں پہلی بار پڑ رہا تھا۔

'تمہیں بدنامی سے خوف نہیں آتا؟'

'مجھے نہیں دوسروں کو آتا ہے میرے ساتھ سو کر۔۔۔ کہیں میں انہیں رسوا نہ کر دوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ البتہ شریف زادی ضرور کرتی ہے! جب حمام میں سب ننگے ہوں تو کوئی کسی کو بدنام نہیں کرتا۔'

'میں تو کر سکتا ہوں۔۔۔ میں ننگا نہیں حمام میں۔' شہباز نے کہا۔

'تم نہیں کروگے۔۔۔تم اس حمام میں اتروگے۔۔۔چند لمحوں بعد۔۔۔پھر ایسا اتروگے کہ عمر بھر نکلنے کی تمنا نہ کروگے!

یہ کہہ کر غزالہ نے اپنے آپ کو نائٹی کی غلامی سے آزاد کرالیا۔لباس قالین پر ایسے جھوم کر گرا جیسے کوئی پتہ خزاں کے موسم میں اپنے درخت سے گرتا ہے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی اور ہوگی اس پوری کائنات میں جو غزالہ سے زیادہ حسین ہو؟ کسی ایک زاویے سے؟ نہیں۔۔۔ناممکن! اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت کیونکہ اسے کھلی آنکھوں سپنے دیکھنے کی عادت تھی۔ وہ ہر سپنا ڈائری میں لکھنے کا عادی تھا۔ گرم گرم حمام میں اتر کر پتہ لگایا جا سکتا تھا کہ خواب کیا ہے اور حقیقت کیا۔ حمام کے گرم پانی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس حرارت سے اس کا اپنا بدن بھیگے جا رہا تھا۔ وہ تھکے ہوئے جسم کو آرام پہچانا چاہتا تھا۔

غزالہ اب سیڑھیوں کے جانب بڑھ رہی تھی۔ شہباز اسکے بل کھاتے جسم کا پیچھا کرتے کرتے ایک بڑے سے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ وہ بیڈ پر گر گئی۔

'کپڑے مجھے دے دیجئے!' پیچھے سے ایک مردانہ آواز آئی۔

'آپ؟' شہباز نے مڑ کر دیکھا تو افضال کو سامنے پایا۔

'جی آپکا خادم!' افضال نے کہا۔ اور اسکے کپڑے بیڈ کے سامنے پڑے دیوان پر دھر دیے۔

'میں کسی تیسرے کی موجودگی میں نامرد ہو جاتا ہوں!' شہباز نے غزالہ کی جانب دیکھتے کہا۔

'میں تمھیں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط مرد بنا دوں گی۔' یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اٹھی۔ شہباز کے روبرو کھڑی ہوئی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ نیچے سرکتی گئی جیسے آسمان سے پیراشوٹ نیچے اترتا ہے۔ نیچے جاتے وہ سر اٹھا کر شہباز کے چہرے کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے غزالہ کو زمین پر اترتے دیکھ رہا تھا۔ شہباز غلط ثابت ہوا۔ اسکی مردانگی کئی گناہ بڑھ چکی تھی اس کے باوجود غزالہ کے سامنے اس کی حیثیت آندھی میں تنکے جیسی تھی۔

باب 4

مولوی کی محبت!

'بہت مشکل ہے اس کا بچنا۔ اللہ ہی معجزہ کرے تو بچے! خون کا گروپ چیک کر کے فوراً چند بوتلوں کا بندوبست کرو۔ کون ہے اسکے ساتھ؟' ڈاکٹر پروین ایمر جنسی وارڈ میں لائی گئی ایک عورت کا معائنہ کرتے اپنے سٹاف سے بولی۔

'اسکا شوہر ہے باہر۔' ایک نرس بولی۔

'اسے ڈرپ لگاؤ۔' یہ کہہ کر وہ باہر آ گئی۔ اسے دیکھ کر ایک باریش مرد نے پوچھا:

'بچ جائے گی؟'

'تم شوہر ہو اسکے؟'

'جی۔'

'نام کیا ہے تمہارا؟'

'قاری نواز محمد۔'

'کیا کرتے ہو؟'

'امام مسجد اور مولوی ہوں۔'

'بیوی کا نام؟'

'شکیلہ۔'

'کیا کیا ہے تم نے اسکے ساتھ؟' پروین نے غصے سے پوچھا۔

'کچھ نہیں ڈاکٹر صاحبہ۔ چولہا پھٹ گیا تھا۔'

'بکواس نہیں کرو۔ شرم نہیں آتی؟ امام مسجد ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔ پورا یوٹرس اڑا ہوا ہے اس کا۔ چولہا پھٹنے سے ایسا ہوتا ہے؟ جلنے کا نشان تک نہیں جسم پر۔

'میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔۔۔'

'پولیس کیس ہے۔۔۔'

'اللہ کا واسطہ پولیس کو رپورٹ نہ کریں۔ خواہ مخواہ بدنامی ہو گی۔۔۔'

'اچھا۔۔۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔۔۔ ابھی فون کرتی ہوں!' پروین یہ کہہ اپنے دفتر کی جانب بڑھی اور قاری غائب ہو گیا۔

پولیس کو فون کرنے کے بعد اس نے یہ صورت حال اپنی صحافی دوست رابعہ کو بتائی جو ایسے موضوعات پر دبنگ فیچرز کیا کرتی تھی۔

'اسے ہوش میں آنے دو تب ہی انٹرویو کیا جا سکتا ہے۔۔۔' رابعہ نے پروین سے کہا۔

'دو تین دن لگ جائیں گے۔' پروین بولی۔

'کوئی مسئلہ نہیں۔' رابعہ نے پروین کو تسلی دیتے کہا۔

'ڈاکٹر صاحبہ تھانیدار صاحب آئے ہیں۔' نرس نے پروین کو بتایا۔

'بھیجو۔۔۔'

'اسلام و علیکم ڈاکٹر صاحبہ!'

'وعلیکم السلام۔ سر کوئی بہت ہی درندہ صفت انسان ہے۔ اسے چھوڑیئے گا نہیں!'

'ہوا کیا؟'

'ایک مولوی ہے۔۔۔' پروین نے ساری بات بتائی۔

'ہوں۔۔۔ بچ کے کہاں جائے گا قانون کی گرفت سے؟ تھانیدار مونچھوں کو تاؤ دیتے بولا۔

تھانیدار نے قاری کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے۔ وہ اپنے کسی طالب علم کے گاوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ حکومت کو اسکی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے انعام رکھنا پڑا۔ روپے کے لالچ میں شاگرد ہی پولیس کا مخبر بن گیا۔ اب قاری نواز پولیس کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔

'بول حرامی کیوں کیا تونے ایسا؟' تھانیدار قاری کو ننگا الٹا لٹکا کر اس پر تشدد کر رہا تھا۔

'سر وہ مذہب کی بے حرمتی کیا کرتی تھی۔ کئی بار اسے سمجھایا کہ ایسا نہ کرے۔ لیکن وہ باز نہ آتی۔ آخری بار جب اس نے یہ حرکت کی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے فیصلہ کیا اسے ایسا سبق سکھاؤ گا کہ دوبارہ ایسی حرکت چاہنے کے باوجود نہ کر سکے۔' قاری بولا۔

'مذہب کی بے حرمتی؟ کیا مطلب؟' تھانیدار نے قاری سے پوچھا۔

'سر وہ کھیرے، کیلے، گاجر اور مولی جو اللہ تعالی نے ہمارے لئے اس دنیا میں بطور رزق پیدا کئے ان کی بے حرمتی کرتی تھی۔'

'کھل کر بتا حرامزادے۔۔۔'

'سر شرم آتی ہے۔'

اس جملے پر تھانیدار نے قاری کو ایک تھپڑ رسید کرتے کہا: 'جو حرکت تو نے کی اس پر تجھے شرم نہیں آتی؟'

'میں نے کچھ غلط نہیں کیا سر۔ مجھے فخر ہے جو کچھ بھی میں نے کیا۔ کوئی بھی غیرت مند اور صاحب ایمان انسان اگر میری جگہ ہوتا تو یہ ہی کرتا جو میں نے کیا!'

اس پر قاری کو تھانیدار سے ایک اور تھپڑ ملا۔

'ادھر ادھر کی کہانیاں نہ سنا۔ سیدھا سیدھا بتا اس بیچاری نے ایسا کیا کر دیا تھا جو تو نے اسکی یہ حالت بنا ڈالی، ورنہ تجھے زندہ نہیں چھوڑونگا۔'

'وہ یہ چیزیں اپنی شرمگاہ کے اندر ڈال کر جنسی تسکین حاصل کیا کرتی تھی۔ بس مجھ سے برداشت نہ ہوا۔' قاری نے کہا اور تھانیدار کا سر چکرا گیا۔ اس نے پروین کو فون لگایا۔

'یہ کہہ رہا تھا وہ مردود قاری! سچ ہے کیا؟ مجھے تو شکیلہ نے اپنے بیان میں ایسا کچھ نہیں بتایا!' تھانیدار نے پروین کو ساری بات بتاتے کہا۔

'کیا بتائے؟ اپنے آپ کو بدنام کروائے کیا؟' پروین نے جواب دیا۔

'تو قاری سچ بول رہا ہے۔۔۔۔'

'کیا شکیلہ کا ایسا کرنا قاری کے جرم کو جواز فراہم کرتا ہے؟ آئے آپ بہت بڑے ہمدرد اس شیطان مولوی کے! اور قانون کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ عورت کا ایسا کرنا جرم ہے؟' پروین نے غصے سے کہا۔

'میں اس کا ہمدرد نہیں۔ بہت مارا ہے اسے۔ تھوڑا اور مارتا تو مر جاتا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ شکیلہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ کیا وہ نفسیاتی مریضہ ہے؟'

'وہ نارمل ہے اور ایسا کرنا بھی نارمل۔ مرد بھی خود لذتی جیسے عمل کرتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کی وجہ بھی وہی مولوی ہے۔۔۔۔' پروین بولی۔

'کیا مطلب؟ قاری نواز نامرد ہے؟'

'نہیں۔ لڑکوں کا شوقین ہے۔ شکیلہ ابھی تک کنواری ہے!' پروین کے سچ نے تھانیدار کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگر اس کا بس چلتا تو قاری کا ماورائے عدالت قتل کر دیتا۔

شکیلہ کی جان بچ چکی تھی مگر زندگی مردوں سے بدتر تھی۔ یوٹرس مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق قاری نے ایک آہنی راڈ اسکے یوٹرس میں گھسیٹر کر دوسرے کونے سے بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ شکیلہ کا علاج ملک سے باہر ہی ممکن تھا۔

قاری شکیلہ کا خالہ زاد بھائی تھا۔ شکیلہ کے والدین وفات پا چکے تھے۔ آگے پیچھے کوئی اور نہ تھا۔ اسی لئے وہ قاری کے رحم و کرم پر تھی۔ بے اولاد تھی۔ رابعہ پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے ساتھ تھی۔ فوٹوگرافر تصویریں لے چکا تھا۔ یہ گھریلو تشدد کی تاریخ کا انتہائی شرمناک واقعہ تھا۔ رابعہ کا بس چلتا تو قاری کو چوک میں پھانسی چڑھا دیتی۔

صبح ملک کے سب سے بڑے اور اثرورسوخ والے انگریزی روزنامے میں شکیلہ کی دکھ بھری کہانی صفحہ اول پر شائع ہوئی۔ فوٹوگرافر درست لمحے پر شٹر دبا کر دنیا کو وحشی مولوی کی بربریت دکھا چکا تھا۔

رپورٹ گو کہ انگریزی میں تھی۔ عوام تک تو نہ پہنچ سکی کیونکہ وہ انگریزی سے نابلد تھے۔ مگر مقتدر حلقوں تک بات اچھی طرح پہنچ گئی جنہیں رابعہ کی جراتمندانہ اور کھری رپورٹنگ سے ہمیشہ تکلیف ہی رہتی۔ اگر وہ بااثر باپ کی بیٹی نہ ہوتی تو کب کی اٹھا لے گئی ہوتی۔

باپ بیٹی کے کام میں مداخلت کا قائل نہ تھا۔ البتہ اسے اکثر سمجھایا کرتا کہ بھاشن بازی اور نیتا گری بےکار ہے۔ اس ملک میں لکھنے سے کبھی کچھ نہیں بدلا۔ نہ بدلے گا! جنھوں نے ساری عمر جذبے سے لکھا وہ بھی ہمت ہار بیٹھے۔ ان کا نئی نسل کو اب یہ پیغام ہے کہ میاں امیگریشن لو اور امریکہ، کینیڈا یا یورپ میں اپنا مستقبل تلاش کرو۔ ہم نے ساری عمر جھک ماری۔ لکھا، ڈنڈے کھائے، کوڑے پیٹھ پر سہے، نوکریوں سے ہاتھ دھوئے، ہمارے معصوم بچوں کو قتل کیا گیا۔ اغوا کیا گیا۔ ان پر تشدد کیا گیا۔ کسی کی تشدد زدہ لاش تین ماہ بعد ملی تو کسی کی ملی ہی نہیں۔ اور یہ سب کچھ جن کے لئے کیا وہی مجرموں سے مل گئے۔ ہماری قربانیاں خاک میں مل گئیں۔ یہ ملک غریبوں کے لئے نہیں امیروں کے لئے بنایا گیا تھا جس میں امیر دن بہ دن امیر ہو سکے اور غریب غربت سے مر جائے۔ اور اس مقصد کے لیے اسلام کا ہتھیار استعمال کیا گیا۔

نظریاتی لوگوں کے گھر والے چیخ چیخ کر اب ان سے پوچھتے ہیں کہ کیوں جھوٹے سپنے دکھائے لوگوں کو؟ کیوں انہیں اپنے زور قلم سے جھوٹی جنت دکھائی؟ کیوں ایک سراب پیدا کیا؟ جو بھی اس سراب کے پیچھے دوڑا واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ اس سراب نے ہزاروں لوگوں کی جانیں لیں۔ ہزاروں گم ہو گئے۔ گمشدہ لوگوں کی واپسی کی راہ تکتے تکتے ماؤں نے اپنی بینائی کھو دی۔ ہزاروں سہاگ اجڑے۔ لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ کیوں؟ تمہارے قلم کی بدولت! تمہارا قلم اصلی مجرم ہے کیونکہ تم نے سچ نہیں لکھا۔ تم نے خواب گھڑے۔ تم نے جھوٹے خوابوں کا کاروبار کیا۔ سب کو دھوکہ دیا۔ اب تو سچ بولو۔ لکھو اب جو شیکسپیئر نے لکھا۔۔ فیر از فاؤل اینڈ فاؤل از فیئر!

لیکن دانا باپ کی باتوں سے رابعہ اتفاق نہ کرتی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اگر سب ہی ایسا سوچیں گے تو معاشرے میں سدھار کیسے پیدا ہو گا۔ وہ اپنی کاوش کو بارش کا پہلا قطرہ سمجھتی تھی۔ باپ کی نظر میں بیٹی کو زندگی کی تپش کا اندازہ تک نہ تھا۔ وہ تو باپ کی شفقت کے ٹھنڈے سائے میں پلی بڑھی۔ اس لئے وہ بحث بالکل نہ کرتا۔ اپنی بات کر کے لائبریری میں چلا جاتا۔ لیکن رابعہ کو باپ سے بے پناہ پیار تھا۔ وہ ماں سے کم باپ سے زیادہ مانوس تھی۔ ماں کو ہر وقت رابعہ کی شادی کی فکر رہتی۔ گھر میں حکم باپ کا ہی چلتا جس نے بیٹی کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ رابعہ تیس برس کی ہو چکی تھی۔ خوبصورت عورت تھی ہر لحاظ سے۔ شادی کے بارے میں اس نے آج تک نہ سوچا۔ نہ اسکا کوئی بوائے فرینڈ تھا۔ اسے اپنے کام سے ہی عشق تھا۔ وہ دکھی انسانیت کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔

رابعہ کی شکیلہ کے بارے میں رپورٹ این جی اوز اور ڈونر کمیونٹی نے گہری دلچسپی سے پڑھی۔ سرکاری حلقوں میں اسے وزیر اعظم، صدر مملکت اور کئی وزراء نے پڑھا۔ سب کی ہمدردی شکیلہ کیساتھ تھی۔ اگلے دن یہ خبر باقی اخبارات نے بھی دہرائی۔ اس طرح شکیلہ کی کہانی جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ چونکہ خبر دینے والی رابعہ تھی۔ اس لئے ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ دھڑا دھڑ اس سے رابطہ کرنے لگے۔ شکیلہ کو انگریزی تو آتی نہ تھی۔ لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی رابعہ کو اس کا ترجمان بننا پڑ گیا۔ این جی اوز سے اس نے شکیلہ کو بچائے رکھا۔ اسے علم تھا کہ شکیلہ کی آڑ میں یہ مافیا اپنا الو سیدھا کرے گی۔ اور اسکا اندیشہ درست نکلا۔

ساروی سرمست نے رابعہ کو بطور رشوت اچھی خاصی کنسلٹنسی آفر کی۔۔۔ اس شرط پر کہ وہ اسے شکیلہ کے ساتھ ایک پریس کانفرنس کرنے دے جس میں شکیلہ میڈیا کو حقیقت کے علاوہ کئی اور باتیں بھی بتائے جو ساروی اسے بطور سکرپٹ رٹائے گی۔ رابعہ نے ہوشیاری سے یہ گفتگو ریکارڈ کر لی اور اس پر ایک سٹوری کر ڈالی جو ساروی کی گرتی ہوئی شہرت کے لئے ایک اور دھچکا ثابت ہوئی۔ اس نے ایک بہت بڑی گرانٹ کے لئے ڈونر کے پاس پروپوزل جمع کرا رکھی تھی۔ ہاتھی نکل چکا تھا دم رہ گئی تھی۔ سٹوری پڑھ کر ڈونر نے ساروی کو طلب کیا۔ اس نے سٹوری کو جھٹلایا تو ڈونر نے اپنے طور پر تحقیق کی۔ سٹوری سچ نکلی۔ اس کے بعد ڈونر نے ساروی کو گھاس تک نہ ڈالی اور فی الفور یہ پراجیکٹ گوہر کی این جی او کو دے دیا۔

شکیلہ کے کیس میں نو ماہ کی سماعت کے بعد فیصلہ سنایا گیا۔ قاری کی عدالت میں پیشی پر سخت حفاظتی اقدامات کیئے گئے۔ مذہبی رہنما اپنے اپنے لاؤ لشکر سمیت عدالت کے احاطے میں جمع ہوئے۔ دیکھنے والوں نے اس قسم کے بینرز دیکھے جو بہت سوں کو آج بھی یاد ہونگے:

یااللہ یارسول قاری نواز بے قصور!

قاری تیری قربانی رنگ لائے گی

این.جی اوز کی اجارہ داری نامنظور

کافر حکومت سے انصاف کی توقع نہیں

شکیلہ این.جی اوز کی ایجنٹ

جب قاری کو عدالت میں لایا گیا تو ہجوم نے جیل کی وین پر دھاوا بھی بولا۔ وین پر شدید پتھراؤ ہوا۔ مظاہرین کو منتشر کرنے لئے پولیس نے آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جیسے تیسے کر کے قاری کو جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ باہر 'اسلام کا مجاہد اسلام کا ہیرو' کے نعرے لگے۔ قاری اکڑتا ہوا کٹہرے میں آیا تھا اور اس نے بلند آواز میں 'نعرہ تکبیر' بھی بلند کیا۔ اسکے چہرے پر افسوس یا ملال کی جگہ اطمینان تھا۔ اسے تین مختلف جرائم کے تحت تین سزائیں سنائی گئیں۔ ہر سزا دس برس کی تھی۔ تینوں سزاؤں کو اس نے علیحدہ علیحدہ بھگتنا تھا۔ اس طرح اسے کل تیس برس جیل میں گزارنے تھے۔

گھریلو تشدد کے اس کیس میں ملک کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہوا جس میں کوئی مجرم اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کیس کو عالمی شہرت نصیب ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اس پر ہالی ووڈ نے فلم بنائی جو بہت ہٹ ہوئی۔ اس کی دیکھا دیکھی بھارت نے بھی ایک فلم بنائی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ نہ بنائی تو قومی فلم انڈسٹری نے۔ مغرب میں فیمی نسٹس نے شکیلہ پر کئی ناول بھی لکھے۔ لیکن کسی مقامی خاتون یا مرد لکھاری کو ایسا خیال چھو کر بھی نہ گذرا۔ اس کیس کے بھاگوں حکومت نے قانون سازی کے ذریعے عورتوں کی حالت زار کو قدرے بہتر بھی کیا۔ اسے موثر انداز میں منظر عام پر لانے اور پھیلانے میں سب ہی نے رابعہ کی کاوشوں کو سراہا۔ حکومت نے اسے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا جو کہ واقعی ایک اعزاز تھا باوجودیکہ ایسے ایوارڈ ملک میں ریوڑیوں کی طرح خوشامدیوں، چاپلوسوں اور سیاسی وفاداروں میں بانٹے جاتے تھے۔ دراصل ان ایوارڈز کو رابعہ کے قابل فخر کام سے نوازا گیا تھا۔

وزیر اعظم کی ذاتی توجہ اور ہمدردی کے وجہ سے شکیلہ کو سرکاری خرچ پر علاج کے لئے لندن بھیجا گیا۔ وہ ٹھیک تو ہوئی مگر اسے تاحیات ایک یورین بیگ اپنے جسم کے ساتھ باندھنا پڑا۔ وہ باقی ماندہ زندگی نارمل انسان کی طرح گذارنے سے قاصر رہی۔ مقامی ڈاکٹروں کی نظر میں برطانوی ڈاکٹروں کا اتنا کمال بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اگر وہ ملک میں ہی رہتی تو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ پاتی۔

اس کیس کو اچھی طرح سے تیار کرنے پر تھانیدار کو پروموشن دے کر ڈی ایس پی بنایا گیا۔ سب خوش تھے کہ ہر کسی کی کاوش رنگ لائیں۔ قاری اپنے انجام کو پہنچا۔ دکھ صرف اس بات کا تھا کہ یورین بیگ شکیلہ کو ہر لمحے قاری کے انسانیت سوز سلوک کی یاد دلاتا رہے گا۔ وہ کبھی مسکرا تک نہ سکے گی!

میڈیا کی گہری دلچسپی کی بدولت شکیلہ راتوں رات سٹار بن چکی تھی۔ این جی او زرابعہ کا پتہ گول کرنے کے چکر میں تھیں کیونکہ شکیلہ مکمل اس کے اثر میں تھی۔ سب سے زیادہ تکلیف ساروی سرمست کو تھی۔

'اس حرامزادی کی بڑی گڈی چڑھی ہوئی ہے آج کل۔ روز فارن میڈیا کو انٹرویو دیتی ہے۔ سنا ہے چھنال کتاب بھی لکھ رہی ہے۔ خوب پیسہ بنا رہی ہے اس مظلوم کے نام پر۔' ساروی جو منہ میں آئے بکے چلی جا رہی تھی۔

'کون چھنال، کون حرامزادی اور کونسی کتاب؟' عمرانہ نے پوچھا جو ساروی کی خوبصورت ترین پروگرام آفیسرز میں ایک تھی۔

'تو کس چیز کی تنخواہ لیتی ہے؟ اتنا بڑا ایشو چل رہا ہے اور ہماری پروگرام آفیسر بے خبر بیٹھی ہے۔ ارے وہ گشتی۔۔۔ رابعہ۔۔۔ وہ حرافہ لکھ رہی ہے کتاب شکیلہ پر۔ اور ہم ایک فوٹو تک نہ کھنچوا سکے شکیلہ کے ساتھ۔ اگر یہ ہی حال رہا تو ہم سب گھر بیٹھ جائینگے۔ ڈونر گرانٹ روک لے گا۔ یہ شکیلہ سونے کی چڑیا ہے جسے اس کنجری نے اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔' ساروی نے عمرانہ کو کھری کھری سناتے کہا۔

'میڈم آپ نے کونسا مجھے کسی پروگرام پر غور و فکر کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔ میں، ستارہ اور دیگر لڑکیاں وہی کرتے ہیں جس کام کی آپ تنخواہ دیتی ہیں۔ ہم اگر منسٹرز اور ڈونرز کا بستر گرم نہ کریں تو آپکی یہ نام نہاد این جی او چار دن نہ چلے۔ اپنے اصلی پروگرام آفیسر رانا سے پوچھیں۔ اور آپ زبان سنبھال کر بات کیا کریں۔ ہم برداشت کر جاتے ہیں۔ باہر والے منہ

توڑ دینگے آپ کا اگر انکے سامنے ایسی زبان استعمال کی۔ ہم تو کسی اور این جی او میں بھی جا سکتے ہیں۔ رانی بی بی سے تو ہمیں چوبیس گھنٹے آفر رہتی ہے۔ ان کی این جی او تو بہت بڑی ہے۔ پراجیکٹس، گرانٹس اور اثر ورسوخ اس کا زیادہ ہے۔ اور وہ سٹاف کو بچوں کی طرح عزیز رکھتی ہے۔'عمرانہ جو ساروی سے شدید بیزار تھی آج اپنی ہی باس پر پھٹ پڑی جس سے ساروی وقتی طور پر اپنی اوقات میں لوٹ آئی۔

'ارے تو توبر امان گئی۔ میر ایہ مطلب نہیں تھا۔ اچھا آئی ایم سوری! بلاتی ہوں رانا کو۔' ساروی بولی۔ کچھ دیر میں رانا بھی وہاں موجود تھا۔

'راناصاحب۔ ہم شکیلہ والے کیس میں کہیں نظر ہی نہیں آرہے؟ کیا وجہ ہے؟' ساروی نے پوچھا۔

'میڈم ہمارے پاس کام کرنے والے لوگ نہیں!' یہ بات کہتے رانا نے عمرانہ کی جانب دیکھا۔ دونوں خواتین اس کا طنز سمجھ گئیں لیکن مصلحتاً کچھ نہ بولیں۔ پورے ادارے میں رانا ہی ایک پروفیشنل تھا جو تنظیم کو چلارہا تھا۔ اسے نکال دو۔۔ دفتر محض ایک چکلہ تھا۔ رانا کو اس کی قابلیت کے حوالے سے تنخواہ بھی نہ ملتی۔ مرد ہونے کی وجہ سے مار کھاتا۔ پینتالیس برس کا ہو چکا تھا۔ ایم فل تھا۔ بیس برس سے فیلڈ میں تھا۔ کئی بار بڑے بڑے اداروں نے اسے انٹرویو کے لئے بلایا۔ سب ہی اسکے کوائف کو سراہتے پر نوکری کوئی نہ دیتا۔ نوکری ہر بار کسی نالائق سے لڑکی کو ہی ملتی جس کا باپ کسی نہ کسی بااثر عہدے یا منصب پر ہوتا۔ یا پھر وہ لڑکی فتنہ انگیز حسن کی مالکن ہوتی اور ادارے کے ہر کرتے دھرتے کا بستر برضا ور غبت گرم کرنے کے لئے ہر دم تازہ رہتی۔

'ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ ابھی تک کسی این جی او نے شکیلہ کے لئے کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ صرف پریس کانفرنس پر پریس کانفرنس ہو رہی ہے۔ قاری ابھی تک مفرور ہے۔ کیوں نہ ہم پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دیں کہ شکیلہ کو انصاف دو۔ قاری کو گرفتار کرو۔ اسی تھیم پر مختلف پلے کارڈز اور بینرز بنائے جائیں۔ پریس والے بھی آجائینگے موقع پر اور آپ کا انٹرویو خود بخود کر لینگے۔ لیکن ہمیں دیگر این جی اوز اور ٹریڈ یونین والوں کو بھی ساتھ ملانا ہو گا۔' رانا نے تجویز پیش کی۔

'آئیڈیا اچھا ہے مگر دوسروں کو ساتھ ملایا تو ملائی وہ کھا جائینگے۔ ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔!ساروی نے کہا۔

'ہماری این جی او میں مالی، ڈرائیور اور ٹی بوائے ملا کر بیس بندے نہیں۔ ان کی مدد سے ہم دھرنا دینگے پارلیمنٹ کے آگے ؟' اتفاق میں برکت ہے۔ دھرنا تاریخی اہمیت کا حامل ہو جائے گا۔' رانا بولا۔

'نہیں۔ جوائنٹ وینچر تو ہرگز نہیں کرینگے۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ اگر ہم شہر کی مختلف کچی آبادیوں سے عورتوں سے بھری دس پندرہ بسیں لا کر ان کے ہاتھ میں پلے کارڈ اور بینرز پکڑا کر دھرنا یا مظاہرہ کریں تو کیسا ہے ؟ دھرنے کے بعد انہیں کسی گراونڈ میں کھانا کھلا دینگے۔ ساتھ میں سو دو سو روپے بھی ہاتھ میں پکڑا دینگے۔' ساروی نے تجویز دی۔

'یہ تو واقعی کمال کا آئیڈیا ہے۔ ہمیں اس پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔' عمرانہ بولی۔

'یہ آئیڈیا وومن ڈے پر چل سکتا ہے لیکن شکیلہ کیس میں نہیں۔ رابعہ کو تو پہلے ہی ہمارا کچا چھٹا معلوم ہے۔ ایک فیچر چھاپے گی اور آپکی اس این جی او پر اگلے ہی روز تالہ پڑا ہو گا۔ ایسی حماقت ہرگز نہ کیجئے گا باقی آپ کی مرضی۔ مجھے اب اجازت دیجئے۔ میں نے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔' رانا یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساروی عمرانہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔

'رانا صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ میری مانیں تو جوائنٹ وینچر کر لیں۔' عمرانہ نے کہا۔

'تو لکھ لے میری بات۔ کوئی بھی جوائنٹ وینچر پر راضی نہیں ہو گا۔ اور ایسا کرنا ناممکن ہے۔' ساروی بولی۔

'کیوں ناممکن ہے ؟

'

'ہم سب نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے۔ اوپر اوپر سب دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ مگر سب پیٹھ میں چھرا گھونپنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آمنے سامنے سیمینارز میں سب ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں۔ اندر اندر گالیاں دے رہے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی کامیابی پر خوش ہونے کے بجائے بین ڈالتے ہیں۔ ہم بھی اسی منافقت کے ٹولے کا حصہ ہیں۔ ہماری کوئی یونین نہیں۔'

'ہم آئسولیشن میں کام کرتے ہیں۔ اس لئے ایسا ہونا ناممکن ہے۔ لیکن ایک ترپ کا پتہ ہے میرے پاس۔ ہم ایک ڈاکومینٹری بناتے ہیں۔ کچھ اداکار تیار کر لینگے۔ انہیں کسی دیہی علاقے میں لیجا کر فلم بنا لینگے۔ سکرپٹ پہلے سے تیار ہو گا کہ بھئی ہم یہ سوال کرینگے تو یہ جواب دینا۔ اس فلم سے ہم یہ ثابت کرینگے کہ ہم قاری نواز کے گاؤں گئے تھے۔ ان لوگوں سے ملے جو اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ ہمارے اداکار اس کے خلاف زہر اگلیں گے۔ اسکے اندر کے وحشی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرینگے۔'

یہ ڈاکومنٹری ہم میڈیا کے لئے نہیں ڈونر کے لئے تیار کرینگے۔ انگریزی میں ڈب کر دینگے۔ڈونر نے کونساوہاں جاکران لوگوں سے مل کر تصدیق کرناہو گی۔اور یہ ڈاکومنٹری ہو گی ہمارے اس کوارٹر کی پراگریس رپورٹ۔ڈونر کاباپ بھی اسے مانے گااور اس فلم کی بدولت چارنئے منصوبوں کی گرانٹ دیگا۔پھر میں تیری سیلیری ڈبل کر دونگی۔پر ڈونر کو تونے مایوس نہیں کرنا!'ساروی بولی۔

'پہلے کبھی مایوس کیا؟'عمرانہ بولی اور ساروی مسکرادی۔

باب 5

دوسری ملاقات!

شہباز اور غزالہ کو ملے تین ہفتے بیت چکے تھے۔ غزالہ نے اس دوران اس سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ طے یہ پایا تھا اگر شہباز نے خود رابطہ کیا تو یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔ وہ خود رابطہ کرے گی۔۔۔جب دل کرے گا! لیکن وہ ایک نشہ تھی جس سے جان چھڑانا اب ناممکن تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحے اسی رات کا نظارہ گھومتا جسے غزالہ امر کر چکی تھی۔ کاش اس رات کے بعد سورج دوبارہ طلوع نہ ہوتا۔ وقت تھم جاتا! ایک پچھتاوا بھی تھا۔۔۔کاش وہ گنجا افضال کمرے میں نہ ہوتا۔ اس کے ہونے سے اس رات کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار پھر غزالہ کی آغوش میسر ہو جائے۔ صرف ایک بار! لیکن کوئی تیسرا نہ ہو۔ ایسا معجزہ دوبارہ کب ہو گا؟ وہ ان سوچوں میں غرق تھا کہ فون بجنا شروع ہو گیا۔

'میں بول رہی ہوں!'

'بہت لمبی عمر ہے۔۔۔تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'

'جو مجھ سے ایک بار مل لے وہ میرے علاوہ کچھ اور سوچنے کے قابل رہتا ہی نہیں۔ ابھی اسی وقت آسکتے ہو؟'

'کیوں نہیں!'

'کتنی دیر میں؟'

'پندرہ منٹ!'

'دیر نہ کرنا!'

وقت مقررہ سے پہلے ہی شہباز غزالہ کے گھر پر تھا۔ آج اس نے کالے رنگ کی فل سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ لینن کی سلیٹی پینٹ اس کے ساتھ خوب میل کھا رہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کا کڑا تھا جس میں رنگ برنگے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ لال رنگ کی سرخی لبوں پر اور گلابی نیل پالش ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں پر۔ گلے میں لیمن کلر کا دوپٹہ۔۔۔شہباز کو یہ غزالہ پہلی والی سے کئی درجے زیادہ حسین نظر آئی۔ لباس میں ڈھکی چھپی خوبصورتی برہنگی سے ہزار درجے زیادہ حسین تھی۔ اور تباہ کن حسن اس کی سادگی میں تھا۔

'حیران ہو رہے ہو کہ میں کپڑے بھی پہنتی ہوں!'

'ہرگز نہیں۔ تم کپڑوں میں کہیں زیادہ حسین لگ رہی ہو۔'

'میں ہر روپ میں ایک نیا حسن اور ادا لے کر وجود میں آتی ہوں۔'

'کیا تم فلسفی ہو؟' شہباز نے پوچھا۔

'ماسٹرز ان انٹرنیشنل ریلیشنز!' غزالہ نے کہا۔

'اس دن تم بالکل برہنہ تھیں اور آج۔۔۔' شہباز بولا۔

'تم چاہتے ہو سب کپڑے اتار دوں؟' اتار دیتی ہوں!' یہ کہہ کر اسکے ہاتھ اپنی شرٹ کے بٹن کے طرف گئے۔

'مت اتارو۔ اس طرح زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔'

'تم نے اس دن مجھے برہنہ دیکھا اور آج کپڑوں میں دیکھ رہے ہو۔ میں تمہیں اسوقت سے لیکر اب تک ننگا ہی دیکھ رہی ہوں۔ اور اس دن جب تم نے سب کپڑے اتارے تو میں نے تمہیں بھوکا بھی دیکھا۔ پھر تم مجھے افلاس زدہ لگے حالانکہ تم پیتے سکاچ ہو۔ میں تو اس دن بھی برہنہ تھی۔ آج بھی ہوں۔ یا پھر یوں سمجھو کہ میں اس دن بھی باپردہ تھی۔ اور آج بھی مکمل پردے میں ہوں۔ اندر اندر تمہارے دل میں یہ آرزو مچل رہی ہو گی کہ غزالہ ٹرانسپیرینٹ بلیک نائٹی میں کیوں نہیں ہے؟ آج مجھے اس کی بریسٹ، نپلز، ہیری پزی اور ہیری آرم پٹ کیوں نہیں نظر آرہے؟ آج یہ صوفے پر کیوں نہیں جھکی مجھے بلو جاب دینے کے لئے؟ یہ ہی سوچ ہے نا تم سب مردوں کی؟'

شہباز حیران رہ گیا۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ عورت میڈم نور جہاں کی طرح اس قسم کی کھلی ڈھلی گفتگو کر سکتی ہے۔ میڈم سے اسکی بہت دوستی تھی۔ حالانکہ میڈم عمر میں اسکی والدہ سے قریب پندرہ برس بڑی تھیں۔ پھر بھی وہ اس سے اکثر بڑی کھلی ڈھلی گفتگو کیا کرتیں۔ ایسی ایسی گالیاں دیتیں کہ شہباز کے کانوں سے دھواں نکلنا شروع ہو جاتا۔

کچھ ایسی ہی گالیاں میڈم نے ایک سیاستدان کو بھی دیں۔ اسوقت وہ کچھ بھی نہ تھا۔ جب وزیر اعظم بنا اور تو کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا، میڈم کے پیچھے انکم ٹیکس والوں کو لگا دیا اور انکا فون ٹیپ کروانا شروع کر دیا۔ جب وہ رپورٹ مانگتا تو خفیہ والے کہتے کہ سر باقی تو سب ٹھیک ہے پر میڈم بہت گندی گندی گالیاں دیتی ہیں۔ لیکن غزالہ کی زبان میڈم کی زبان کے سامنے انتہائی مہذب لگ رہی تھی۔

'شاید تم مجھے بہتر طور پر جان سکو کچھ عرصے بعد۔۔۔' شہباز نے کہا۔

'مزید جاننے کی ضرورت نہیں۔ تم بہت کمزور انسان ہو۔' غزالہ بولی۔

'کمزور تمہارا شوہر ہے۔۔۔'

'نہیں۔۔میں اس کمزوری کا ذکر نہیں کر رہی۔ اس دن تم مجھے حاصل کئے بنا رہ نہ سکے۔ میں تمہاری کمزوری بن گئی۔ تم نے ہمیں یہ کہا تھا کہ تم کسی اور کے سامنے یہ کام نہیں کر سکتے۔ تم نامرد محسوس کرتے ہو۔ میں نے تمہاری یہ بات بھی غلط ثابت کر دی۔ تم نے ہم دونوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔'

وہ واقعی غزالہ کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس دن وہ اس کے برہنہ جسم کے آگے خم ہوا اور آج اسکی دانش کے آگے۔ اسے اپنا قد اس عورت کے مقابلے میں بہت چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

'تمہارا شوہر کہاں ہے؟

'کون شوہر؟'

'افضال۔۔۔اور کون؟'شہباز نے حیرانی سے پوچھا۔

'تمہیں کس نے کہا وہ میرا شوہر ہے؟'

'تم ہی نے تو کہا تھا۔ تم پاگل تو نہیں؟'شہباز بولا۔

'پاگل تم ہو جو دماغ لڑائے بغیر میری ہر بات کا یقین کر لیتے ہو۔ افضال میرا بھائی ہے۔ اکلوتا اور سگا!'غزالہ نے کہا۔ اس کا یہ انکشاف شہباز کے لئے ناقابل یقین تھا۔

'تمہارے دو بیٹے۔۔۔وہ کس سے ہیں؟'

'افضال سے ہی ہیں!'

'یہ کیسے ممکن ہے؟ بہن بھائی اکیلے رہ رہے ہیں اور دو بچے بھی ہو گئے اور لوگوں کے علم میں بھی نہیں!'شہباز بولا۔

'لوگوں کے علم میں تو بہت کچھ نہیں۔ اور جو ہے وہ سب غلط ہے۔ یہ میرے شوہر کا ہی گھر ہے۔ وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتا ہے۔ افضال گاہے بگاہے آتا رہتا ہے بہن کی خبر گیری کے لئے۔ آخر بھائیوں کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں!'

'پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ تم بات کو سیدھے انداز میں کیوں نہیں کرتیں؟'شہباز نے کہا۔

'ہمارے یہاں کے دانشور سیدھی بات کرنے والے کو احمق، جاہل، ان پڑھ اور پینڈو سمجھتے ہیں۔ جب تک دیدے گھما کر، منہ کو لقوے کے انداز میں ٹیڑھا میڑھا کر کے بات نہ کی جائے، بات کرنے والے کو گنوار سمجھا جاتا ہے۔ افضال کا اور میرا رشتہ بچپن سے ہے۔'

'تمہیں کیسے یقین کہ دونوں بیٹے افضال کے ہیں۔ تم نے تو کہا تھا وہ نامرد ہے۔'شہباز نے پوچھا۔

'وہ جھوٹ تھا۔ اس عمر میں بھی تم سے زیادہ مضبوط ہے۔'غزالہ بولی۔

'کیا تمہارا شوہر نامرد ہے؟'

'میں نے یہ کب کہا؟ بھئی دونوں بیٹے افضال پر ہی گئے ہیں۔ ہو بہو اس کی نقل ہیں۔ میرا شوہر بھی تم سے زیادہ زور آور ہے۔'

'تو پھر مجھے کس لئے بلاتی ہو؟'

'تاکہ تم پاگل خانے جانے سے بچ جاؤ!'

'میں سمجھا نہیں؟'

'اگر تمہیں نہ بلاؤں تو تم ہوش و حواس کھو بیٹھو۔ تمہارے گھر والے تمہیں کسی اسائلم میں داخل کرا دینگے۔'

'تمہارے شوہر کو پتہ ہے سب کچھ؟'

'ہرگز نہیں۔ لیکن اسکی ماں اسے یہ دم دیتی رہتی ہے کہ تیرے دونوں بیٹے تجھ پر نہیں اپنے ماموں پر ہیں۔ لیکن میرے شوہر کا ماننا ہے کہ جنیاتی طور پر بچے ماں کے طرف سے بھی مکمل اثر لے سکتے ہیں۔'

'وہ اس وقت کہاں ہے؟'

'دبئی یا یورپ میں۔۔۔ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا۔'

'مجھ سے کتنا زیادہ طاقتور ہے؟ ہم تینوں میں سب سے زیادہ قوت کس کے پاس ہے؟' شبہاز نے بے صبری سے پوچھا۔

'احمقانہ سوال۔ عورت چاہے تو نامرد کو اپنا دل دے بیٹھے۔ اور اگر دل کو نہ بھائے تو کسی راجہ اندر تک کو گھاس نہ ڈالے۔ دل آئے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے!'

'کتنے مردوں سے تعلقات ہیں تمہارے؟

'کیوں، مردم شماری کرنی ہے؟ میں نیکیوں اور مردوں کا حساب نہیں رکھتی!'

'ارے واہ۔ تم نے تو مجھے میڈم نور جہاں کی یاد دلا دی۔'

'وہ کیسے؟'

'ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ میڈم آپ نے اب تک کتنے گانے گائے تو انہوں نے کہا کہ میں گانوں اور گناہوں کا حساب نہیں رکھتی!'

'وہ ولی عورت تھی!' غزالہ نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

باب 6

نئی نوکری کی تلاش!

'اسلام و علیکم سر! آپ کیسے ہیں؟ میں بہت بڑا پرستار ہوں آپکے کام کا۔ کوئی کالم نہیں چھوڑتا آپ کا۔ اوہو۔ سوری۔ میں نے آپکو بیٹھنے تک کا نہ کہا۔ بیٹھیں بیٹھیں۔ اوئے فرقان جا ذرا بھاگ کر سر جی کے لئے زبردست سی دودھ پتی لے کر آ ملائی مار کے۔ بیٹھیے نہ سر آپ بیٹھتے کیوں نہیں؟' شاہ نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

شہباز سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ ایسے ایسے نمونے بھی ہو سکتے ہیں اتنے بڑے ادارے میں جو ملک چلانے والوں کو دن رات گورنس کے بھاشن دیتے ہیں۔ لیکن اس کے پاس اس مسخرے کو برداشت کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ خالص ترقی کو ایک میڈیا آفیسر درکار تھا۔ شہباز امیدوار تھا۔ گوہر نے اس کا انٹرویو کرنا تھا۔ اسی مقصد کے لئے وہ خالص ترقی آیا ہوا تھا۔ شاہ چونکہ ایڈمن مینیجر تھا۔ لہذا وہ اس کے کیبن میں موجود تھا۔ لیکن شاہ کی بک بک سے وہ شدید بیزار تھا۔

'شکریہ قادری صاحب۔'

'شاہ جی! قادری نہیں۔ شاہ جی کو دفتر میں سب شاہ جی ہی کہتے ہیں!' یہ شاہ کا ایک اور چمچہ تھا۔ شہباز کو 'شاہ جی' کہہ کر پکارنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ اس ملک میں ہر ٹٹ پونجیا اپنی ذات میں اک "شاہ جی" ہی تھا۔ اس کے موجودہ دفتر میں بھی ایک شاہ تھا جسے نپولین جی بھر کے ذلیل کرتا اور وہ اس ذلت کو فخر سمجھتا۔

'سر آپ کا روحانیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ لو جی دودھ پتی آ گئی۔ یار کیک بھی لے آتا۔ سادی دودھ پتی لے آیا۔ جا بیٹا بھاگ کر کیک پکڑ لا۔' شاہ بولا۔

'میں سو فیصد روحانیت میں یقین رکھتا ہوں۔ لیکن کونسی روحانیت؟ یہاں ہر شخص روحانی بنا ہوا ہے اور اپنے اپنے مقصد کی روحانیت کی تعریف جیب میں لئے پھرتا ہے۔ میرے نزدیک اس سے بڑی روحانیت کیا ہو گی کہ انسان کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچائے۔ حتی الوسع انسانیت کی بے لوث خدمت کرے۔ مذہب، فرقے، رنگ و نسل اور عقیدے کی بنیاد پر کسی سے نفرت نہ کرے۔ آپکا کیا خیال ہے؟' شہباز نے شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ایک ہی لمحے میں وہ جان گیا کہ شاہ کو روحانیت کی یہ تعریف بالکل پسند نہیں آئی۔

'نہیں سر۔ یہ روحانیت نہیں۔ میر امطلب ہے فرض کریں کسی کے بیٹا نہیں ہو رہا۔ اور وہ کسی پیر فقیر کی خدمت کر تا ہے۔ پھر اللہ اسے بیٹے سے نواز دیتا ہے۔ یہ روحانیت کا ثمر ہے۔ اللہ تعالی اس پیر یا فقیر کو قریب رکھتا ہے کیونکہ اللہ اسکی روح میں رہتا ہے اور اس کے صدقے اسکے مرید کو اولاد سے نواز دیتا ہے۔' شاہ نے چہرے پر مصنوعی انکساری پیدا کر کے کہا۔ اس دوران وہ باقاعدہ آنکھوں کو گھماتا رہا۔ پیشانی پر بل ڈالتا رہا اور ہاتھوں کو نچاتا رہا۔ اللہ کہتے ہوئے انگلی شہادت بلند کرتا رہا۔

'میرے نزدیک اللہ سے بڑا پیر کوئی نہیں۔ اس نے قرآن مجید میں کہہ دیا کہ شرک گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا کام کوئی اور کر سکتا ہے وہ مشرک ہے۔ اور یہ سب پیر فقیر جعلی ہیں۔ ہمارے سیاستدان گدی نشین ہیں۔ انہوں نے ہی ملک کا بیڑہ غرق کر دیا۔ ہمارے مولوی دن رات امریکہ اور ہندوستان کی تباہی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ پر وہ نیست و نابود ہونے کے بجائے دن بہ دن ترقی کر رہے ہیں۔

جس انٹرنیٹ پر آپ اس وقت دفتر کے ٹائم میں تاش کھیل رہے ہیں یہ بھی امریکہ یا کفار کی ہی دین ہے۔' شہباز نے شاہ کی طبیعت صاف کر دی اور وہ کھسیانا ہو کر اپنی کرسی میں دبک کر بیٹھ گیا۔ فرید اسے گوہر کے دفتر تک لے کر گیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے کہا:

'سر آپ نے شاہ جی کو ناراض کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب ذرا ہوشیار رہیے گا۔' شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گوہر کمرے میں ہی تھی۔

'ویلکم شہباز۔ کیسے ہو تم؟ اس نے پوچھا

'بالکل ٹھیک!'

'یو آر آل ریڈی ہائرڈ۔ یہ انٹرویو نہیں ٹاسک ہے۔ اگلے ماہ ایک اہم سیمینار ہے۔ تم اسے بہترین کوریج دلواؤں۔ یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ ہم لوگوں کی بقا کوریج پر ہی ہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں۔ آپ نے اس ادارے کو آسمان پر چڑھا دیا جس کی خدمات ہمارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ سال میں ایک ٹریننگ کرا کے آپکا چھوٹو نپولین ایسے اچھلتا ہے جیسے چتوڑ کا قلعہ فتح کر آیا ہو۔' گوہر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

'میں پوری کوشش کرونگا۔'

شہباز نے وہی گھسا پٹہ جملہ بولا جو سب ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ اس نے سیمینار کے لیے بڑی تعداد میں میڈیا کو گھیر گھار کر لانا تھا۔ لیکن موضوع دیکھ کر اس نے سر پکڑ لیا۔ کون آئے گا اس سیمینار میں اگر موضوع اس قدر مضحکہ خیز ہو گا؟ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔۔۔ ایجنڈہ سیٹ کرنا اسکے اختیار میں نہ تھا۔

نپولین نے شہباز کو نہ صرف عزت سے رخصت کیا بلکہ اسکی خدمات بطور کنسلٹنٹ بھی
حاصل کر لیں۔

باب 7

نابیناؤں کی پارٹی!

رانی کے گھر پر دیوالی جیسا سماں تھا۔ ماریہ کے اعزاز میں اس نے چراغاں کیا ہوا تھا۔ لاونج میں مدہم روشنی اور دیے رومانوی ماحول پیدا کئے ہوئے تھے۔ اسکے تینوں باورچی صبح سے کام میں جتے ہوئے تھے۔ بریانی، مٹن کڑھائی، چکن قورمہ، باربی کیو، فیرنی اور گاجر کا حلوہ مین ڈشز تھیں۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ بس مہمانوں کا انتظار تھا۔ اس نے اپنی این جی او کی دو ماتحت لڑکیوں صوفیہ اور شاہینہ اور ڈونر باس میکس کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ ڈونر این جی او کا باپ ہوتا ہے۔ رب بھلے راضی ہو نہ ہو اس باپ کو راضی رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

رانی لاونج میں صوفے پر آنکھیں موندھے پڑی تھی۔ پورچ میں گاڑی داخل ہونے کی آواز آئی۔ افسانے تھی۔ رانی دروازے کی طرف بڑھی۔

'ہیلو مائی ڈئیر۔ کیسی ہو تم؟' رانی اس سے بغلگیر ہوئی۔ جب اس کے جسم سے افسانے کا جسم چھوا تو اسے سختی اور تناؤ کا اندازہ ہوا۔ دوں وں خواتین کی بھاری بھر کم چھاتیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو ایک بگ بینگ وقوع پذیر ہوا مگر دونوں کے اندر۔ افسانے سفید رنگ کی روائیتی شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ سادہ لباس تھا مگر لڑکی کا اپنا حسن اتنا بے پناہ کہ کچھ بھی پہن لے قیامت ہی لگتی۔

'ہیلو رانی!'

'ارے واہ، میں نہ کہتی تھی تمہاری زبان پر میرا نام چڑھ جائے گا! آج اپنی میڈم کو "ماریہ" کہنا۔ وہ خوش ہو جائے گی۔' رانی اسے اندر لے آئی۔ دونوں ایک صوفے پر براجمان تھیں۔

'کیا پیو گی؟'

'کوئی بھی سافٹ ڈرنک۔۔۔'

'وہ چیز پیا کرو جو بڑے لوگ پیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم زندگی میں بہت اوپر جانا چاہتی ہو۔ صرف اور صرف میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتی ہوں۔' رانی بولی۔

'کیسے؟'

'اگر کیسے، کیوں، کب اور کہاں کے چکر میں پڑو گی تو پھر کچھ نہیں کر سکو گی۔ یہ پوچھنے کے بجائے ایک ہی بات پلو سے باندھ لو اگر واقعی کچھ بننا ہے۔۔۔'

'وہ کیا؟'

'پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے بحث نہیں کرو گی۔ جو میں کہوں گی اس پر من و عن عمل کرو گی۔ پھر دیکھنا آسماں نہ جھکا دیا تمہارے قدموں میں تو رانی نام نہیں میرا!'

'مجھے بحث تو نہیں البتہ سوال کرنے کی عادت ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپکی ہر بات مانوں گی۔' افسانے نے اپنی میزبان کو یقین دلاتے کہا۔

وہ رانی سے بے حد متاثر ہو چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ رانی کے پاس علم غیب ہے۔ کیسے وہ لوگوں کے دماغ پڑھ لیتی ہے۔ اور وہ بھی درست۔ ایک ایک چیز۔ جبکہ وہ کوئی نجومی نہ تھی۔ ہوتی بھی تو اس نے کون سا ہاتھ دکھانا تھا۔ وہ اپنی غربت کو بہت پیچھے چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ بھی کسی پوش علاقے میں رہنا چاہتی تھی جہاں اس کا اپنا بڑا سا گھر ہو۔ گاڑیاں ہوں۔ نوکر چاکر ہوں۔ بوبی اس کے ساتھ ہی رہے۔ وہ بوبی کے بغیر کوئی بھی سپنہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسکے گھر میں سوئمنگ پول ہو جہاں بوبی تیر رہا ہو اور وہ اسے نہلائے۔ اس قسم کے سپنے وہ کئی بار دیکھ چکی تھی۔

'سوال پوچھنا تو اچھی بات ہے۔ لیکن بحث سے مجھے سخت چڑ ہے۔ آج تم صوفیہ اور شاہینہ سے ملنا۔ وہ بتائیں گی تمہیں کہ کس مقام پر تھیں میرے پاس آنے سے پہلے اور اب کہاں ہیں۔ زندگی بنادی ہے میں نے دونوں کی۔'

'یہ دونوں کون ہیں؟'

'میری این جی او میں پروگرام آفیسرز ہیں۔ بسوں ویگنوں میں دھکے کھایا کرتی تھیں۔ میں نے انہیں برانڈ نیو گاڑیاں دی ہوئی ہیں۔'

'میں ان سے بھی آگے جانا چاہتی ہوں۔' نہ جانے کیوں یہ جملہ افسانے کے منہ سے ایسے نکل گیا جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

'مجھے معلوم ہے۔ تب ہی تو میں نے کہا کہ آسماں کو تمہارے قدموں میں لے آؤنگی۔'

'مجھے کیا کرنا ہو گا؟'

'کچھ بھی ایسا نہیں جو مشکل ہو۔ جو کچھ کرنا ہو گا وہ سب تمہارے بائیں ہاتھ کا کام ہو گا۔ میں تمہیں مکمل گائیڈ کرونگی۔ سب سے پہلے تو سافٹ ڈرنک والی سوچ کو ترک کرو۔ بڑے لوگ وائن یا وہسکی پیتے ہیں۔ تم بھی یہ عادت ڈالو۔'

'اب میں اتنی بھی پینڈو نہیں۔ ایک دفعہ پی تھی میں نے وہسکی ماریہ کے گھر۔ بہت کڑوی تھی۔ دوبارہ نہ پی سکی۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ پھر میں نے جوس منگوالیا۔'

'گڈ! غور کیا تم نے؟ "ماریہ" بولا اس بار۔ میڈم یا میم نہیں بولا ہمیشہ کی طرح۔ ویری گڈ۔' رانی نے کہا اور پھر دونوں ہنس دیں۔

'تم بلیک لیبل پیو۔ چسکی چسکی۔ سوڈا برف ملائے بغیر۔ ہونٹوں کو اس سے تر کرو اور زبان ہونٹوں پر پھیر لو۔ اس طرح قطرہ قطرہ اندر کر لو اپنے جسم میں۔ کچھ دیر بعد تم پر سرور کی کیفیت طاری ہونا شروع ہو جائے گی۔ بس یہ ہی طریقہ ہے نئے پینے والے کے پاس۔ اور اس طرح پینے میں تمہیں مزہ بھی آئے گا۔ ماریہ کو بھی پینا میں نے ہی سکھایا تھا۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ میری شاگردہ ہو کر تمہیں نہ سکھا سکی۔' رانی نے اپنی مہمان سے کہا۔

'میں کوشش کرونگی۔ نشہ زیادہ تو نہیں چڑھے گا مجھے؟'

'نشہ تمہیں نہیں بوتل کو چڑھے گا تمیں دیکھ کر!' رانی نے قہقہہ لگایا۔

اس نے اپنے لئے ایک بڑا اور افسانے کے لئے ایک چھوٹا ڈرنک بنایا۔ دونوں عورتوں نے جام سے جام ٹکرایا۔ لڑکی نے رہبر کی ہدایت کی روشنی میں ہلکی سے چسکی لی۔ زبان اور تالو پر ذائقہ محسوس کیا اور اس قلیل مقدار کو حلق کے نیچے اتار لیا۔ ایسا کرنے میں اسے واقعی لطف محسوس ہوا۔ اسکی اگلی چسکی پہلے سے بڑی اور اس سے اگلی پہلی سے دگنی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے سرور آنے لگا۔ رانی اپنا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ استاد اور شاگرد کا فرق واضح ہو گیا۔

سرور و نشاط کی کیفیت میں رانی نے افسانے کا بدن سہلانا شروع کر دیا۔ اس حرکت نے افسانے کو پہلے عارف کی یاد دلائی اور پھر بوبی کی۔ تینوں کے سہلانے کا انداز مختلف تھا مگر سرور کی تاثیر ایک ہی تھی۔ کیا بوبی، عارف اور رانی ایک ہی تھے؟ لیکن وہ ایک کیسے ہو سکتے تھے؟ اگر وہ مختلف تھے تو پھر کیفیت مختلف کیوں نہ تھی؟ یہ بھی ممکن تھا کہ کیفیت یکساں نہ ہو۔ مختلف ہی ہو پر وہ اسے محسوس کرنے سے قاصر ہو؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی۔ کچھ دیر بعد اسے رانی کا ہاتھ اس جگہ محسوس ہوا جہاں شادی والے دن عارف کا تھا اور گھر پر ہمیشہ بوبی کا ہوتا تھا۔

یہ انتہائی حسین منزل تھی۔ اس مقام پر تھکے ہارے مسافروں کو راحت میسر آنا شروع ہو جاتی تھی۔ رانی افسانے کے بدن کو سرمنڈل کی طرح چھیڑ رہی تھی اور اس کا ہر سُر بلا رہی تھی۔ اب اسے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ بوبی کے پاس ہے، عارف کے یا رانی کے؟ کھلی آنکھیں تو اسے رانی کا چہرہ ہی دکھلا رہی تھیں۔ پھر یہ سرور اسے بوبی اور عارف کی یاد کیوں دلا

رہا تھا؟ گھنٹی کی آواز نے اسے ان بکھری ہوئی سوچوں سے نجات دلا دی۔ اب وہ حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ چکی تھی۔

رانی ٹشو پیپرز سے اپنی انگلیاں پونچھ رہی تھی۔ پھر اسی ٹشو پیپر سے اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ائر کنڈیشن زبردست کام کر رہا تھا۔ پھر بھی رانی پسینے پسینے تھی۔ فضا میں سمندر کے نمک کی مہک تھی۔ رانی نے ایک نئے ٹشو پیپر سے افسانے کے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اس لمحے افسانے پر یہ راز منکشف ہوا کہ نمکین خوشبو کا منبع رانی کی انگلیاں تھیں۔ خود افسانے بھی اسی خوشبو سے معطر تھی۔

دونوں خواتین نے لباس درست کیا۔ رانی نے دروازہ کھلا۔ سامنے میکس تھا۔

'اسلام وعلیکم رانی۔ تم کیسی ہو؟' میکس ان سے اردو میں بات کر سکتا تھا کیونکہ وہ اسی مٹی میں پیدا اور پلا بڑھا تھا۔ اسکا باپ گورا اور ماں مقامی تھی۔ کوئی پینتالیس برس کا ہو گا۔ امریکہ کی ایک بہت بڑی ڈونر ایجنسی کا سربراہ تھا۔ لمبا چوڑا خوبصورت مرد۔۔۔ ابھی تک کنوارہ۔ بہت طاقتور اور اختیار والا تھا۔ اس کا باپ کانگرس کا سینیٹر تھا۔ خطیر سے خطیر گرانٹ میکس کے قلم کی نوک پر رہتی۔ ہر این جی او اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ اچھے اخلاق کا انسان تھا۔ رانی کو بہت پسند کیا کرتا تھا۔ اسکی خوبصورتی اور قائدانہ صلاحیتوں سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ کئی بار رانی کو وقت سے پہلے ہی مطلع کر دیا کرتا تھا کہ فلاں موضوع پر نئے پراجیکٹس کھل رہے ہیں وہ پروپوزلز تیار کر کے رکھ لے۔ پروپوزلز بنانے میں رانی کی مدد بھی کرتا۔ اسطرح رانی کی پروپوزل کبھی مسترد نہ ہوتی۔

'وعلیکم السلام۔۔۔ خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ میری نئی دوست افسانے سے ملو۔ اور افسانے یہ ہیں میکس۔ ہم بھوکے مر جائیں اگر یہ نہ ہوں!' رانی چاپلوسی کا ہتھیار استعمال کرتے بولی۔ اس کے ترکش میں بہت سارے تیر ہمیشہ ہی ہوتے۔ کوئی خوشامد کا، کوئی دھونس دھمکی کا، کوئی بلیک میلنگ کا، کوئی پیسے کے لالچ کا اور کوئی حسن کا۔ یہ حسن اس کا اپنا بھی ہو سکتا تھا اور کسی اور کا بھی۔ وہ اب بھی کسی قاتل حسینہ سے کم نہ تھی۔ بدن کو بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ روز پیراکی کیا کرتی تھی۔

میکس افسانے کو اچھا لگا۔ سنہرے بال، کسرتی جسم۔ ہالی ووڈ کا ہیرو لگتا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے افسانے کو اس کا لمس بہت نرم محسوس ہوا حالانکہ اسکا جسم تن ساز کی طرح کا تھا۔ ادھر میکس افسانے کا ہاتھ تھامتے ہی کہیں کھو سا گیا۔ اسے اپنا طاقتور جسم افسانے کی ہتھیلی میں پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ 'اتنا گرم ہاتھ!' وہ یہ سوچ رہا تھا کہ گھنٹی بجی۔ باقی مہمان بھی پہنچ چکے تھے۔ رانی نے سب کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔

ماریہ بہت خوش تھی کہ اب اسکی سٹوڈنٹ اسے اس کے نام سے پکارنا شروع ہو چکی تھی۔ جھجک دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ فاصلے کم تر ہو رہے تھے۔ دوسرے پیگ کے ساتھ ہی کھانا شروع ہو چکا تھا۔ ہر شے بہت لذیز اور ذائقے دار تھی۔

'تو دلہن کیسی گذر رہی ہے شادی شدہ زندگی؟' رانی نے رابعہ سے پوچھا۔ اب کھانے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ کوئی کافی پی رہا تھا کوئی سبز چائے۔ صرف رانی ہی تھی جو ابھی تک بلیک لیبل سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ افسانے دو پیگ پینے کے بعد سرور کی ابتدائی کیفیت سے روشناس ہو چکی تھی۔ رانی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کچھ اور لے۔ اس سے پہلے کہ وہ کافی چائے یا اس قسم کی کسی چیز کی فرمائش کرتی، اس نے اسے جھٹ سے تیسرا پیگ پیش کر دیا۔ افسانے اس پیشکش کو مسترد نہ کر سکی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی، وہ وعدہ کر چکی تھی کہ رانی کی ہر بات مانے گی۔ دوسری وجہ وہ سرور تھا جسے کی گہرائی میں وہ مزید اترنا چاہتی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی گہرائی کتنی ہے۔ شاید اسے اندازہ نہ تھا کہ غم اور خوشیاں لامتناہی ہوتے ہیں۔ سوال تو یہ تھا کہ کون ان سے کیسے بغلگیر ہوتا ہے!

'یہ سوال آپ کو کم از کم ایک سال کے بعد کرنا چاہیے! ابھی تو ایک مہینہ ہی ہوا ہے ہماری شادی کو۔ ہنی مون پریڈ تو ختم ہونے دیں۔' ماریہ نے کہا۔

'تمہیں اور عارف کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ ہنی مون کا دور ساری عمر چلے گا! اللہ تم دونوں کو تاحیات خوش و خرم رکھے۔' رانی بڑی بوڑھیوں کی طرح دلہن اور دلہا کو دعا دے رہی تھی۔ لیکن ایسے جیسے وہ ماریہ کی نائکہ ہو اور عارف ایک امیر گاہک!

'آپ دونوں بہت خوش و خرم لگ رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے!' میکس نے کہا اور سب اس کی معصومیت پر ہنس دیے۔

'آپ اردو بولتے ہوئے بہت سوئیٹ اور انوسینٹ لگتے ہیں!' اس بار شاہینہ بولی۔ اس عورت کی عمر کوئی تیس برس ہو گی۔ سانولا رنگ۔ درمیانہ قد۔ سلم۔ سیکس اپیل بے پناہ۔ لوگ اسے شبانہ اعظمی کہا کرتے تھے۔ بی اے پاس تھی۔ انگریزی رانی کے پاس رہ رہ کر اچھے سے بولنے کے قابل ہو چکی تھی۔ بائیس برس کی عمر میں آئی تھی 'تاریخ نسواں پاک' میں۔ ٹی این پی کے نام سے یہ این جی او عورتوں کے مختلف ایشوز پر کام کیا کرتی تھی۔ رانی کے مخالفین اسے ٹٹس اینڈ پزیز

Tits N Pussies (TNP)

کے نام سے پکارتے تھے۔ پر رانی کو کسی کی بھی پرواہ نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ٹی این پی دن بہ دن ترقی کر رہی تھی۔ یہ رانی کی بصیرت اور میکس کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔

گرانٹس کے علاوہ وہ کئی جگہ کنسلٹینسیز لئے بھی ٹی این پی کو متعارف کرواتی۔ اسطرح اس کے پاس مختلف پراجیکٹس کی بھرمار رہتی۔ ایک ختم ہوتا تو کئی اور شروع ہو جاتے۔ ان میں کچھ مختصر اور کچھ طویل مدت کے منصوبے ہوتے۔

ستمبر گیارہ کے حملوں کے بعد ساری دنیا کے ڈونرز ملک میں ڈیرہ جما چکے تھے۔ برسوں سے بندیو ایس ایڈ دوبارہ زندہ ہو چکا تھا۔ گورا پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ عالم یہ تھا کہ ڈالرز کی گنگا بہہ رہی تھی۔ جس نے بھی ہاتھ دھونے ہیں آکر دھولے۔ اتنا پیسہ تو سوویت یونین کے خلاف جہاد کے دور میں بھی نہ آیا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ دہشت گردی کیخلاف عالمی جنگ میں پورا مغرب امریکہ بہادر کا پٹھو تھا۔

'اچھا تو میں اردو بولتے معصوم دکھائی دیتا ہوں۔ انگریزی بولتے کیا مانسٹر نظر آتا ہوں؟' میکس نے شاہینہ کی بات کے جواب میں کہا اور سب ہنس دیے۔

'کبھی کبھی آپ ایک بہت جوشیلے مانسٹر بھی لگتے ہیں۔ اس جوش میں آپ بھڑکتی ہوئی آگ میں بھی کود جاتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ پر آگ اثر نہیں کرتی!' صوفیہ بولی جو رانی کی ایک اور انتہائی خوبصورت پروگرام آفیسر تھی۔ عمر بتیس برس کے قریب۔ دراز قد، گوری چٹی۔ یہ بھی بی اے پاس تھی اور کافی عرصے سے رانی کے سائے میں پھل پھول رہی تھی۔

'جب مجھے کوئی مشتعل کرتا ہے تو مانسٹر بننا ہی پڑتا ہے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا عارف صاحب؟' میکس نے کہا اور نہ صرف عارف بلکہ دوسروں نے بھی اسکی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ بھئی وہ ڈونر ہے!

افسانے اب وال کلاک کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ رانی نے اسے ٹائم دیکھتے دیکھ لیا۔

'تم میری طرف کیوں نہیں رک جاتیں آج؟ گھر فون کر لو۔ ماریہ بات کرلے گی تمہاری والدہ سے اور اچھے سے سمجھا دے گی۔' رانی بولی۔

'یہ ناممکن سے بھی آگے کی چیز ہے۔ آپ اسے اسی وقت گھر ڈراپ کروا دیں۔' ماریہ بولی۔ رانی نے ضد نہیں کی اور ڈرائیور کو کہہ دیا کہ لڑکی کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دے۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔

'میرے خیال میں اب ہمیں بھی چلنا چاہیے۔' افسانے کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد عارف نے کہا۔ ماریہ نے اپنے شوہر کی بات کی تائید کی۔ ان دونوں کو رخصت کرنے سب پورچ تک آئے۔ سب ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سب دوبارہ لاؤنج میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک پارٹی اختتام کو پہنچی۔ دوسری شروع ہو رہی تھی۔ یہ پارٹی میکس، رانی، صوفیہ اور شاہینہ کے اعزاز میں تھی۔ یہ ہی اس پارٹی کے میزبان بھی تھے اور مہمان بھی۔ دیے مدہم ہو رہے تھے۔ صورتیں ہیولے بن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اب کوئی کسی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ محسوس ضرور کر سکتا تھا۔ نابینا لوگوں کے چھونے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ لمس سے چہرے پہچان لیا کرتے تھے۔ یہ ایسے ہی لوگوں کی پارٹی تھی۔ جب محفل رنگ پر آئی تو ایک صدا بلند ہوئی۔ صوفیہ چلا رہی تھی:

'میکس، یو آر اے مانسٹر، یو آر اے مانسٹر۔۔۔'

رانی کی پارٹی سے گھر پہنچ کر افسانے بہت سست پڑ چکی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ زیادہ چڑھا چکی تھی۔ لیکن خوشی بھی تھی۔۔۔ آخر کار اس کی ذات اس چیز کے ذائقے سے اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی جس سے وہ شروع میں کچھ زیادہ متاثر نہ تھی۔ وہ اتنا تھک چکی تھی کہ ان ہی کپڑوں میں دھڑام سے بستر پر گر گئی۔ بوبی ایک دم چلایا: 'ہائے!' اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ 'کون ہے، کون ہے!'

اسے پتہ ہی نہ لگا کہ جس جگہ وہ گری وہاں بوبی سویا ہوا تھا۔

'ابے چپ کر۔ میں ہوں۔ کوئی چور نہیں۔ سوری۔ اندھیرے میں پتہ نہیں لگا۔ اور تو میرے بستر پر کیوں سو رہا تھا؟' افسانے نے کہا۔

اس مختصر سے کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر بوبی دوسرے پر افسانے سویا کرتی تھی۔ چونکہ کمرہ چھوٹا تھا۔ لہٰذا دونوں میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔ پلنگ آپس میں ایسے جڑے تھے کہ ڈبل بیڈ کا تاثر دیتے۔

'باجی میں اپنے ہی پلنگ پر سویا تھا۔ آپ نہیں تھیں اس لیے کروٹ لیتے لیتے آپکی سائیڈ پر آ گیا۔'

'چل سو جا۔ مجھے بھی سونے دے۔'

وہ بے خبر سوتی رہی۔ جب اٹھی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ ماں حسب معمول کام پر روانہ ہو چکی تھی۔ بوبی صحن میں لٹو چلا رہا تھا۔

'بہت گہری نیند سو رہی تھیں آپ باجی۔ میں نے کئی بار جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ مجھے لگا آپ گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی ہیں۔'

'واہ۔ گدھے گھوڑے بیچ کر سونا! تو اب محاورات کا درست استعمال کرنا شروع ہو گیا ہے عام بول چال میں۔ شاباش۔ انگریزی بھی ایسے ہی سیکھ۔'

'آپ محنت تو کر رہی ہیں مجھ پر۔ ضائع نہ ہونے دونگا۔'

'تو نے ناشتہ کیا کہ نہیں؟'

'اماں نے بنا دیا تھا۔'

'تیرا گرمیوں کی چھٹیوں کا کام کتنا رہ گیا ہے؟'

'میں نے سپیڈ لگا کر سارا مکمل کر لیا ہے حالانکہ ابھی سکول کھلنے میں پورا ایک مہینہ باقی ہے۔۔۔

ارے میں بتانا بھول گیا کہ شمیم باجی نے پیغام بھجوایا تھا کہ آپ ان سے مل لیں۔'

'کوئی خاص بات؟'

'کچھ نہیں بتایا۔۔۔'

'نہا دھو کر جاتی ہوں۔ ذرا بالٹی تو بھر غسل خانے میں۔'

'اچھا جی۔'

افسانے الماری سے کپڑے نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔ گنگناتے گنگناتے غسل کرتے اسے یاد آیا کہ تولیہ تو وہ لائی نہیں۔ ایسا کرنا اسے اکثر یاد نہ رہتا۔

'بوبی ذرا تولیہ تو پکڑا دے۔' غسل خانے کا دروازہ آدھا کھول کر افسانے نے کہا۔

'ابھی لایا باجی۔'

بوبی نے تولیہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس دوران اس کی نظر بھی افسانے پر پڑی۔۔۔ سر سے پیر تک۔ یہ نظر اسے ہمیشہ اک خوشگوار احساس مہیا کرتی۔ اسے ایک بار پھر زینت اماں یاد آئی۔

افسانے کپڑے پہن کر غسل خانے سے باہر نکلی۔ اسکے گھنے بالوں سے پانی ابھی بھی قطرہ قطرہ ٹپک کر اسکی قمیض پر گر رہا تھا جو پہلے ہی اس کے بدن پر تنی ہوئی تھی۔ بوبی کو پتہ لگ گیا کہ اس کی ضرورت دوبارہ پڑے گی کیونکہ افسانے نے نیچے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ ایک چیز قمیض کے نیچے ضرور پہنا کرتی تھی اور یہ کام اس اکیلی کے بس کا نہ تھا۔ اس دن بوبی نے ہک کھولنے اور آج اسے باندھنے میں افسانے کی مدد کی۔

کچھ دیر بعد افسانے شمیم کے پاس تھی۔ رانی کا فون آیا تھا۔ افسانے نے رانی کو فون کیا۔ مختصر گفتگو ہوئی۔ رانی اس سے ملنا چاہتی تھی۔ کچھ لمبے ٹائم کے لئے۔ طے یہ پایا کہ کل صبح دس بجے اس کا ڈرائیور افسانے کو گھر سے اٹھائے گا۔ دوپہر کا کھانا وہ رانی کے ساتھ کھائے گی اور

مغرب سے پہلے گھر واپس پہنچ جائے گی۔ افسانے نے ملنے کی حامی بھر لی۔ اس ملاقات میں اسکے مستقبل کے حوالے سے کچھ منازل کا تعین کیا جانا تھا۔

'کون ہے یہ رانی؟ کس ملک کی ہے یہ رانی؟' شمیم نے پوچھا تو افسانے نے مکمل تعارف کرایا۔ شمیم بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

'مجھے بھی کوئی نوکری دلا دے اس کی این جی او میں۔ مجھے بھی بہت شوق ہے گاڑی چلانے کا۔'

'پہلے مجھے تو مل جائے نوکری۔ پھر تیری بھی پکی ہو جائے گی۔' افسانے نے شمیم کو یقین دلایا۔ اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کی کزن بھی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ تعلیم کی وجہ سے مار کھاتی تھی۔ صرف میٹرک پاس تھی۔ عمر میں افسانے سے چند برس بڑی تھی۔

'کتنی بار تجھے سمجھایا کہ پرائیویٹ ایف اے اور بی اے کر لے۔ میری بات مانی ہوتی تو اسوقت گریجویٹ ہوتی۔ انگریزی کے دو جملے تو بول نہیں سکتی۔ میں تیری حوصلہ شکنی نہیں کر رہی۔ اگر کسی بڑے دفتر میں نوکری کرنی ہے تو انگریزی فر فر آنی چاہیے۔ اور تعلیم کم از کم بی اے ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کا علم بھی ہونا چاہیے۔ میں تیری مدد کر سکتی ہوں پر تو اس بے کار کے بیوٹی پارلر میں پڑی ہوئی ہے۔ ساری عمر لگی رہ اپنے گھر سے۔ اس پارلر سے محل کھڑا نہ کر سکے گی۔'

'تو درست کہہ رہی ہے۔ میں آج ہی سے ایف اے کی تیاری شروع کرتی ہوں۔ بھاڑ میں گیا یہ بیوٹی پارلر۔'

'ارے اسے بھی چلا۔ کافی ٹائم ہوتا ہے تیرے پاس۔ تو دونوں کام کر سکے گی۔ اور ایف اے یا بی اے کرنا کوئی تیر مارنا نہیں۔ پانچ سال کے پرانے سوالنامے لے لو۔ انکے جوابات رٹ لو اور امتحان میں بیٹھ جاؤ۔' افسانے بولی۔

'ہاں تو کیا سوچا تم نے؟' رانی نے افسانے سے پوچھا جو پچھلے دو گھنٹوں سے گہری سوچ میں غرق تھی۔

رانی کا ڈرائیور ٹھیک دس بجے افسانے کو اس کے گھر سے اٹھا کر بنگلے پر لے آیا تھا۔ وہ اس وقت کسی میٹنگ میں جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ لیکن اسکے پاس کم از کم پندرہ منٹ تھے افسانے سے گفتگو کے لئے۔ یہ بہت اہم اور تیر کی طرح سیدھی گفتگو تھی بغیر کسی لگی لپٹی کے!

وہ اس کے سامنے دو راستے پیش کر کے میٹنگ پر جا چکی تھی۔ اسے کچھ دیر بعد واپس آنا تھا۔
افسانے اس وقت سے مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ کون سے راستے کا انتخاب کرے۔

رانی زمانہ شناس عورت تھی۔ وہ اس بات کا اندازہ اچھی طرح لگا چکی تھی کہ یہ لڑکی اونچی ہوا میں پرواز کرنا چاہتی ہے۔ پیر تو اسکے زمین پر ہیں پر نگاہیں آسمان پر ٹکی ہوئی ہیں۔ اسے بس اتنا سمجھانا تھا کہ زمین سے آسمان تک کی بلندی کا یہ سفر آسان نہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ آسمان کی بلندی پر کیسے ٹک کر رہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ گر پلے نہ ہو تو ہر اوپر جانے والی شے جلد ہی نیچے آ جاتی ہے۔ اور اگر نیچے بھی آ رہی ہو تو کیا دھڑام سے گر کر چکنا چور ہو جائیگی یا آرام سے ہولے سے زمین پر قدم رکھے گی۔۔۔ ایسے کہ خراش تک نہ آئے۔ کھیل کھیلنا آتا ہو تو انسان تاحیات آسمان کی بلندیوں پر رہ سکتا ہے۔ صرف موت ہی اسے اس کے اصلی مقام تک پہنچا سکتی تھی۔ مگر کچھ لوگ تو موت سے بہت پہلے اوقات پر آ جاتے ہیں۔ ان کا آسماں کی بلندیوں کو چھونے کا تجربہ چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے۔ رانی نے تو آنکھ ہی آسماں کی وسعتوں میں کھولی۔ اس دن سے وہ نئی نئی وسعتیں تلاش کر رہی تھی۔ لیکن ایسا خود بخود نہیں ہوتا۔ اسکی قیمت چکانا پڑتی ہے۔

رانی کو افسانے سے یہ باتیں کرتے احساس ہوا کہ وہ اسے غور سے سن رہی تھی۔ کافی حد تک سمجھ بھی رہی تھی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ وہ ان باتوں کا درست مطلب ذہن نشین کر لے اور کسی قسم کا ابہام نہ ہو، اس نے اسے یہ بھی اچھی طرح واضح کر دیا کہ قیمت کس کس شکل میں چکائی جا سکتی ہے اور یہ کہ افسانے کے پاس چکانے کو واحد قیمت کیا تھی۔ یہ باتیں کر کے وہ میٹنگ میں چلی گئی۔ جب لوٹی تو افسانے کو گہری سوچ میں ڈوبا پایا۔

'کیا فیصلہ کیا پھر؟' رانی نے پوچھا۔

'میں نے بہت دیر تک سوچا ان باتوں کے بارے میں جو آپ نے کہیں۔ آپ درست کہہ رہی ہیں۔ قیمت تو چکانا پڑے گی۔ سفید پوشی کی قیمت بھی تو ہم چکا ہی رہے ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟' افسانے نے جب یہ کہا تو رانی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے جھٹ سے اس کا ماتھا چوما اور گلے سے لگاتے کہا: 'بہت خوب بیٹی۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ مجھے یقین ہے تم مجھے کبھی مایوس نہیں کرو گی۔

'

اپنے لئے بیٹی کا لفظ رانی کے منہ سے افسانے کو بہت اچھا لگا۔ 'میں آپکو ہمیشہ خوش رکھوں گی جیسے میں اپنی ماں کو رکھتی ہوں۔ آپ نے مجھے بیٹی کہا۔۔۔ میں بیٹی کا حق ادا کر کے دکھاؤں گی۔'

'تو چلو جشن مناتے ہیں اس اہم دن کا! رانی نے کہا۔ وہ پینٹری کی جانب بڑھی۔ شیمپین کی بوتل نئی ماں کے ہاتھ میں نئی نویلی بیٹی کے لئے موجود تھی۔

'یہ نہیں۔۔۔وہی۔۔۔اس دن والی!' افسانے نے کہا۔

'واہ۔ یہ ہوئی نہ بات۔ تم بہت ترقی کرو گی۔' رانی نے وہسکی کا ایک پیگ اسکے لئے اور دوسرا اپنے لئے بنایا۔

'اس دن زیادہ نشہ تو نہیں چڑھا تمہیں؟'

'سر گھوم رہا تھا اور ایک سرور کی کیفیت تھی۔ میں تو کپڑے بھی نہ تبدیل کر سکی اور دھڑام سے بوبی پر جا گری۔ وہ بیچارہ درد سے چلا اٹھا! ہائے میرا چھوٹا بھائی!'

'تم اپنے بھائی کے ساتھ سوتی ہو؟' رانی کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی یہ سوال داغتے۔

'ہاں۔۔۔ہمیشہ سے۔ وہ میرے ہی ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ بہت مانوس ہے مجھ سے۔'

'گھر والے اعتراض نہیں کرتے؟ کتنی عمر ہو گی بوبی کی؟'

'تیرہ سال۔ اماں نے سمجھایا تھا مجھے کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اسے نہلانا تو چھوڑ۔۔۔'

'کیا؟ تم اسے نہلاتی ہو؟ کیا وہ خود نہیں نہا سکتا؟ معذور ہے؟' رانی نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے پوچھا۔

'اللہ نہ کرے! بالکل تندرست ہے۔ نارمل ہے۔ خوبصورت بچہ ہے۔ بس مجھ سے مانوس ہے۔ ناراض ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں ہی نہلاتی ہوں۔ پر ایسا نہیں کہ خود نہ نہا سکے۔ خود بھی نہا لیتا ہے۔ میں کبھی کبھی نہلاتی ہوں۔ لیکن میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ اماں یا ابا کو یہ بات نہ بتائے۔ خواہ مخواہ شور ڈالیں گے۔'

'تو کیا تمہاری اماں کو پتہ نہیں چلتا جب تم اسے نہلاتی ہو؟'

'نہیں۔ ابا اور اماں کام پر چلے جاتے ہیں۔'

'وہ دونوں کیا کرتے ہیں؟ گھر اپنا ہے یا کرائے کا؟'

'ابا پرائیویٹ جاب کرتے ہیں۔ اماں قریب میں ایک بڑے گھر میں کام کرتی ہیں۔ میں چند بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیتی ہوں۔ گھر چھوٹا سا ہے لیکن اپنا ہے۔ اسطرح سفید پوشی میں گذارہ ہو جاتا ہے۔'

رانی کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس لئے اس نے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ طریقے سے، آہستہ آہستہ سلسلے وار باتیں اگلواتی رہی افسانے کے منہ سے۔

'بھئی تمہاری میری کہانی ایک جیسی ہے۔'

'کیا مطلب ؟'

'بھئی میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ہی ہاتھوں میں پلا بڑا۔ اور اسے بھی میں ہی نہلاتی تھی۔ اور ہم دونوں کا کمرہ بھی ایک ہی تھا۔' رانی سچ بول رہی تھی۔ بالکل ایسا ہی تھا۔

'وہ کہاں ہے اب ؟'

'دکھ بھری داستان ہے۔۔۔' یہ کہتے رانی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

'کیا ہوا؟ کیا وہ اس دنیا میں۔۔۔' اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی رانی نے اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: 'وہ اسی دنیا میں ہے اور خوش و خرم ہے۔ ایک چڑیل نے چھین لیا مجھ سے میرا پیارا بھائی!'

'کون چڑیل ؟'

'اسکی بیوی!'

'آپ اسکی بیوی کو چڑیل کیوں کہہ رہی ہیں ؟'

'اس لئے کہ وہ بہت حساس ہے اپنے شوہر کے بارے میں۔ اسے اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتی ہے۔ کسی عورت کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی اسے۔ اگر غلطی سے اسکی نگاہ کسی غیر عورت پر پڑ بھی جائے تو ہنگامہ برپا کر دیتی ہے۔ میرا سیدھا سادا بھائی جورو کا بے دام غلام نکلا۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'

'لیکن آپ تو اس کی بڑی بہن ہیں۔ غیر عورت تو نہیں۔ پھر کیوں ؟

'بوبی کی طرح وہ بھی میرے ساتھ سونے کا عادی تھا۔ ایک بار اس چڑیل نے عدیل کو میرے بیڈ روم میں دیکھ لیا۔ بس سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ ڈائن کہنے لگی کہ یا مجھے چھوڑ دو یا یہ گھر۔ میرے بھائی نے مجھے ہی چھوڑ دیا۔'

'کتنی عمر ہے اس کی ؟'

'کس کی ؟ عدیل کی ؟ اوہ! میں سمجھی ڈائن کی عمر پوچھ رہی ہو۔ عدیل اس وقت بتیس برس کا ہے۔ اسکی بیوی اس سے دس برس بڑی ہے۔' رانی نے کہا۔

'دس برس! بہت تو بہت بڑا فرق ہے۔ بہت حسین ہو گی!' افسانے بولی۔

'عام سی ہے۔ جادو گرنی ہے۔ جادو ٹونہ کر کے اپنے جال میں پھنسا لیا میرے بھولے بھالے بھائی کو۔' رانی بولی۔

'وہ شادی کے بعد بھی آپ کیساتھ رہتا تھا؟'

'کیوں نہ رہتا! بھئی یہ گھر اسکا بھی تو ہے۔ ہمارے والدین نے بنایا تھا یہ گھر۔ بہت یادیں وابستہ ہیں اس گھر سے۔'

'لیکن اگر اس نے عدیل کو آپکے بیڈ روم میں دیکھ لیا تھا تو اس میں واویلا مچانے کی کیا ضروت تھی؟'

'وہ اکیلا نہیں تھا۔ میں بھی اسکے ساتھ تھی بالکل اسی حالت میں جس میں تم اور بوبی ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہو!' رانی کا جواب سنکر چند لمحوں کے لئے افسانے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جلد اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل حالت میں واپس لے آئی اور پھر رانی سے ایک سوال کیا: 'آپ نے کب دیکھا مجھے بوبی کے ساتھ؟'

'افسانے جتنی تمہاری عمر ہے اس سے زیادہ میرا تجربہ ہے۔ سچ بتاو کیا تم اور بوبی بالکل برہنہ حالت میں ایک دوسرے سے لپٹ کر نہیں سوتے؟ تم دونوں کے بیچ کسی قسم کا کوئی پردہ نہیں ہوتا۔۔۔ مجھ سے جھوٹ بولو گی تو یہ دوستی ٹوٹ جائے گی۔' رانی نے اسکی آنکھوں میں جھانکتے پوچھا۔ افسانے نے سر جھکا کر اعتراف حقیقت کر لیا۔

'کم آن اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ وی آر فرینڈز۔'

'میں آپ سے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولونگی بے شک سچ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ بوبی کا چھونا مجھے اسوقت سے اچھا لگتا تھا جب وہ دودھ پیتا بچہ تھا۔ مجھے ماں سمجھ کر میری چھاتیوں پر ہاتھ مارا کرتا تھا۔ میں اسے ماں کی طرح دودھ پلانے لگ جاتی حالانکہ میری بریسٹ میں تو دودھ نہیں تھا۔ وہ نپل چوستے چوستے سو جاتا۔ مجھے اس میں بہت لطف آتا تھا۔ میں یہ لطف بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کا ٹچ ہمیشہ راحت دیتا ہے جو نا قابل بیان ہے۔'

'تمہیں بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے بھلا؟ میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری کیفیت۔ میں ان حالات سے گزر چکی ہوں۔ میں بھی ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ یہ بہت نیچرل ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اس دن بوبی کیساتھ کیا ہوا تھا؟' رانی بات کی تہہ تک جانا چاہتی تھی۔

'میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں۔ میں بستر پر گرتے ہی سو گئی۔ پر بوبی کا کیا پوچھنا۔ اندر سے ابھی تک دودھ پیتا بچہ ہے!'

یہ سنتے ہی رانی کے منہ سے اک ہوک سے نکلی اور اس نے کہا: 'تو کتنی خوش قسمت ہے افسانے!'

'آپ نے مجھے اپنا دوست بنایا۔ اس سے بڑھ کر خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے!' افسانے نے کہا اور رانی کی طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ مسکرانے لگی۔ افسانے کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اسکی نئی دوست کو خوشامد بہت پسند ہے۔ کس انسان کو نہ ہو گی!

دونوں خواتین اس گفتگو کے دوران دوسرا پیگ ختم کرچکی تھیں۔ تیسرا شروع ہوچکا تھا۔ سرور کی کیفیت میں افسانے کو رانی میں بوبی اور رانی کو افسانے میں عدیل نظر آرہا تھا۔ اب اس کیفیت کالازمی تقاضا یہ ہی تھا کہ دونوں اوپر بیڈروم میں چلی جائیں!

باب 8

عورت کا اصلی مسئلہ!

آج صبح سے ہی خالص ترقی کے دفتر میں ہل چل تھی۔ جوش و خروش سے سیمینار کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایسے سیمینار میں شرکت کے لئے شرکاء کی تعداد کبھی بھی تیس سے اوپر نہ رہی۔ گوہر کی سختی سے ہدایت تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سارا عملہ سیمینار میں آیا کرے جس کی اہمیت ایک اندرونی میٹنگ سے زیادہ نہ تھی۔ سیمینار کی مشہوری پریس ریلیز کے ذریعے کر دی جاتی جسے اردو اخبارات ردی کی ٹوکری کے لئے استعمال کرتے۔ انگریزی پرچے اپنے:

TODAY'S EVENTS

میں چھاپ دیا کرتے جسے پڑھ کر چند نام نہاد دانشور آ جاتے۔ عام سے رپورٹرز آتے جنہیں موضوع کا اندازہ بھی نہ ہوتا۔ وہ کچھ اوٹ پٹانگ نہ لکھیں، اس بات کو یقینی بنانے کے لئے خالص ترقی پہلے سے ہی تین چار خبریں ان کے لئے تیار کر کے رکھتا جو لفافے میں ایک نوٹ کے ساتھ انہیں دے دی جاتیں۔ ان سیمینارز کی کوریج کی رپورٹ ڈونرز کو بھیجی جاتی۔ وہ خوش ہوتا۔ اس طرح گرانٹ آتی رہتی۔ سیمینار شروع ہونے سے پہلے دفتر کے ملازمین آدھی سے زیادہ کرسیوں پر قبضہ جما لیتے۔ صرف صحافیوں کو علم ہوتا کہ کون اصلی سننے والا ہے اور کون بھاڑے کا۔ جوں جوں مہمان آتے خالی کرسیاں بھرتی جاتیں۔ سٹاف نوٹ کرتا رہتا کہ کب کس نے اٹھنا ہے اور اپنی کرسی اصلی سننے والے کے لئے خالی کرنی ہے۔ عموماً دس کے قریب اصلی شرکاء تو آ ہی جاتے۔ باقی کرسیوں پر سٹاف براجمان ہوتا جس کا کام باسیاں لینا ہوتا۔ شہباز کے تعلقات کی وجہ سے سیمینار میں رونق تھی۔

گوہر نے اپنی سہیلی زینت کو بطور سپیکر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس کی رائے میں زینت سے بہت زیادتی ہوئی تھی۔ رابعہ اس قسم کے سیمینار کور نہیں کیا کرتی تھی۔ یہ بہت چھوٹا اور معمولی کام تھا۔ کسی جگہ جاؤ۔ بکواس سنو۔ چائے سینڈوچ ٹھونسو۔ پریس ریلیز اپنی بائی لائن سے چھاپ دو۔ وہ فیلڈ میں کام کیا کرتی تھی۔ عام لوگوں سے رابطے میں رہتی۔ کچی بستیوں میں جاتی۔ لوگوں کے مسائل سنتی۔ سیلاب زدگان کے مسائل اجاگر کرتی۔ اگر شہباز اصرار نہ کرتا تو وہ کبھی خالص ترقی نہ آتی۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اس قسم کے پروگرامز وہ این جی اوز منعقد کیا کرتیں جن کا واحد کام عورتوں کے حوالے سے ہوتا۔ خالص ترقی ہمیشہ یہ دعوی کرتا کہ وہ

صرف بڑے بڑے موضوعات چھیڑتا ہے۔ چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا وجہ ہے کہ اب خالص ترقی معمولی کام میں دخل دے رہا ہے۔ اصل میں گوہر ادارے کو مشن پر کم اور اپنی ذاتی پسند یا ناپسند پر زیادہ چلاتی۔ اس پر بدر اپنی مایوسی کا اظہار کرتا۔ وہ اسکی باتوں کو درخوراعتنانہ سمجھتی۔ انتہائی ضدی عورت تھی۔ یہ پہلی بار ہوا کہ خالص ترقی کا میٹنگ ہال کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ اور یہ بھی پہلی بار ہوا کے شرکاء کے لئے اضافی کرسیاں منگوانی پڑیں۔ گوہر نے سیمیناز کا آغاز کیا۔

'زینت صاحبہ ایک نجی تعلیمی ادارے میں پرفارمنگ آرٹس پڑھاتی ہیں۔ ان کے ساتھ بہت ناانصافی ہوئی۔۔۔ انکی زبانی سنیئے۔'

یہ گوہر کے ابتدائی کلمات تھے۔ زینت پچاس برس کی ہو گی۔ گوری تھی مگر موٹی۔ قد بھی ناٹا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کالی۔ بس یہ ہی واحد خوبصورتی تھی اسکی۔

'گڈ ایوننگ اینڈ ویلکم!' زینت نے کہا۔

'سلام کرنا تو یہ لوگ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔' رابعہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ رابعہ نے تعلیم امریکہ سے حاصل کی تھی۔ مگر اسے مشرقیت سے پیار تھا۔ وہ کوئی شدت پسند مسلمان نہ تھی۔ مگر اسلام کی روح کو سمجھتی تھی۔ قرآن وحدیث سے شدھ بدھ رکھتی تھی۔

'میں پچھلے دو برس سے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں پرفارمنگ آرٹس پڑھا رہی ہوں۔ میرے تمام طالب علم مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ میں بھی انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا ایک طالب علم جو دراصل میرا سب سے فیورٹ سٹوڈنٹ تھا کچھ عجیب طریقے سے ایکٹ کر رہا ہے۔ لیکچر کے دوران چھت کو گھورنا شروع کر دیگا۔ میری طرف بالکل توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بیٹا کیا بات ہے تمہارا ذہن کہیں اور رہتا ہے۔ تو کہنے لگا مس آپ ساڑھی پہن کر کلاس نہ لیا کریں۔ آپکا نیم عریاں جسم میری توجہ پڑھائی کی طرف نہیں جانے دیتا۔ میں نے اپنے طالب علم کو کہا کہ میں تو تمہاری ماں جیسی ہوں۔ تم مجھے ماں سمجھ کر میری طرف توجہ دیا کرو۔ تو حضرات جانتے ہیں اس باسٹرڈ نے آگے سے کیا جواب دیا۔۔۔ میری ماں کو گالی مت دو۔ وہ تمہاری طرح بے شرم و بے غیرت نہیں!'

'میری تو وہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کس نے اتنی گندگی بھر دی اس کے دماغ میں۔ یہ تو نارمل بچہ تھا۔ یکدم اتنا بے ہودہ کب ہو گیا؟ خیر میں نے بچہ سمجھ کر معاف کر دیا۔ اور جو کونسلنگ ہو سکتی تھی وہ کر دی۔ کچھ دن تو بچے نے ٹھیک ریسپانس دیا مگر پھر وہی۔ وہ میری طرف دیکھنے کے بجائے کلاس کی چھت کو گھورتا۔ اس بار

میں نے سختی سے باز پرس کی۔ اب کے اس نے کہا کہ مس آپ کافروں والا لباس پہنتی ہیں جو ستر پوشی کے لیے کافی نہیں۔ اسلام نے عورتوں کو اپنی زینت چھپانے کا حکم دیا ہے نہ کہ اسے ظاہر کرنے کا۔ آپ مجھے کہتی ہیں کہ ماں سمجھ کر میری طرف دیکھو۔ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسلام میں تو سگی ماں سے بھی پردے کا حکم ہے۔ آپکے جسم کا ہر وہ جو حصہ جو غیر مرد کو نظر آئے قیامت کے دن آگ میں جلایا جائے گا۔ اور میں آپ سے آئندہ نہیں پڑھوں گا۔ آپکو اپنا لباس بدلنا پڑے گا۔'

'مجھے اس کی بات سنکر بہت دکھ ہوا۔ غصہ بھی آیا اس مولوی کے بچے پر۔ اسکی اتنی جرات کہ مجھے بھاشن دے۔ میں وائس چانسلر کے پاس گئی جو کہ خود بھی ایک خاتون ہیں۔ اور اس بچے کی شکایت کی کہ یہ شدت پسند ہے۔ آگے جا کر یونیورسٹی کے دوسرے بچوں کو بھی ورغلائے گا۔ انکی برین واشنگ کر کے رکھ دے گا۔ انہوں نے اس لڑکے کو بلایا۔ پوری بات سنی اور اس کے بعد مجھے یہ کہہ دیا کہ بی بی یونیورسٹی کا ایک ڈریس کوڈ ہے جو فالو کرنا لازمی ہے۔ اگر آپ ملازمت جاری رکھنا چاہتی ہیں تو ساڑھی کو ترک کرنا ہو گا! دیکھیے کتنی بڑی زیادتی ہے۔'

یہ کہتے کہتے زینت کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ گوہر نے اسے ٹشو پیپر دیا۔ اسکے بعد ایک گلاس پانی بھی دیا۔ آنسو پونچھ کر، پانی پی کر زینت شرکاء سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔
'اب فلور اوپن ہے آپکے سوالوں کے لئے۔'

'اس سے پہلے کہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو میں کچھ ایڈ کر دوں۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک کہانی ہے۔ ہمیں اور ہمارے ادارے کو زینت سے مکمل ہمدردی ہے۔ ہمیں حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر کو برطرف کیا جائے۔ مولوی کے بچے کو یونیورسٹی سے نکالا جائے۔ ایسے دہشت گردوں کی درست جگہ مدرسہ ہے۔ جی اب آپ سوال پوچھ سکتے ہیں۔' گوہر نے کہا۔ کوئی درجن بھر ہاتھ کھڑے ہوئے۔

'ایک ایک کر کے۔ سب سے پہلے اپنا مختصر تعارف کرائیں۔ پھر سوال پوچھیں۔ سوال مختصر ہو۔ سوال صرف سوال ہو کمنٹ نہ ہو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔' گوہر نے کہا۔

'جی میرا نام مشہور علی خان ہے۔۔۔۔'

'جی سر آپ کو کون نہیں جانتا!' گوہر بولی۔

'دراصل سب لوگ مجھے نہیں جانتے یہاں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ پہلے اپنا تعارف تفصیل سے کروا دوں۔ اور اس سے پہلے اتنے لوگ بھی کبھی نہیں آئے۔ بہت سے نئے چہرے موجود ہیں۔ لہذا تعارف دوبارہ کرانا پڑے گا۔ مشہور بولا۔

'جی سر جی سر۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں! سوری میرا مطلب اسے اپنا ہی فورم سمجھیے۔'

'تھینک یو۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ میرا نام مشہور علی خان ہے۔ میں ایک مشہور ایکس بیوروکریٹ ہوں۔ میں قریب پندرہ برس قبل بطور سیکریٹری ریٹائر ہوا۔ کئی منسٹریوں میں رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے ایک ضخیم معرکتہ الا آرا کتاب لکھی جس میں میں نے یہ بات بتانے کی کوشش کی کہ ہمارے ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ میں نے اوروں کی طرح محض مسائل کی نشاندہی نہیں کی بلکہ ہر مسئلے کا حل بھی پیش کیا۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اصل مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ مہنگائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ دماغ کہیں اور جاتا ہی نہیں۔ بس آلو پیاز ٹماٹر میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ پھر اوپر سے کرپشن ہے جو اب ایک ناسور بن چکا ہے۔ اور ہمارے سیاستدان انتہائی کرپٹ لوگ ہیں۔ آپ یقین کیجئے میں نے اپنے چالیس برس کے کیریئر میں ہر پرائم منسٹر کے ساتھ کام کیا اور کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہ کیا۔

اسکے علاوہ سینکڑوں منسٹرز کے ساتھ بھی کام کیا۔ بہت سے تو مجھے اپنا استاد آج بھی مانتے ہیں۔ میں نے کبھی بھی دباؤ کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا۔ جب بھی مجھے کوئی غلط کام کرنے کو کہا گیا میں جھٹ لمبی رخصت پر چلا گیا۔ اور جب تک اس حکومت کو گھر نہ بھیجا گیا، آرام سے گھر بیٹھا رہا۔ میری یہ کتاب ملک کے سب سے بڑے اشاعت گھر "الحاج پبلشر" نے چھاپی ہے۔ بہت عمدہ کاغذ ہے۔ ہارڈ باونڈ ہے۔ باہر اسکی کاپیاں بھی پڑی ہیں۔ قیمت صرف دس ہزار روپے ہے اتنے میں آج کل چھوٹے گوشت کی ران بھی نہیں ملتی! میرے آٹوگراف آپ کو فری میں مل جائینگے۔ اگر مجھ سے خریدیں گے تو پچیس فیصد ڈسکاونٹ بھی ملے گا۔' مشہور بولتا ہی رہتا اگر زینت اسے ٹوک کر یہ نہ کہتی: 'سر آپ کا سوال کیا ہے؟'

'آہ۔۔۔ میرا سوال۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا سوال یہ تھا کہ۔۔۔ ہاں بہت درست فرمایا آپ نے۔ میں آپ سے متفق ہوں!' مشہور نے کہا۔

'لیکن سر آپ نے سوال تو پوچھا ہی نہیں؟' اس بار رابعہ بولی۔ وہ مشہور علی کی بات سن کر پیچ و تاب کھا رہی تھی اور باقی لوگ شدید بیزار تھے۔

'او بیٹا سوال تو میں بھول گیا۔ کچھ دیر میں یاد آجائے گا۔ پھر پوچھ لونگا۔'

سب نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

'جی سائرہ عبید اللہ صاحبہ آپ۔۔۔' گوہر نے اس عورت کو دیکھتے کہا۔ یہ ایک بدتمیز اور منہ پھٹ قسم کی فیمی نسٹ تھی۔ مردمار ٹائپ۔ ستر سے اوپر عمر۔ ایک چھوٹی سی این جی او چلاتی

تھی۔ اس کی شادی نہ ہو سکی۔ مردوں سے اسے شدید نفرت تھی۔ چلا چلا کر گلا پھاڑ کر بات کرنے کی عادی تھی۔

'جیسا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ کسی تعارف کی محتاج تو ہوں نہیں۔ اس لئے وقت ضائع کیے بغیر ایک ہی بات کہوں گی۔ ایسے جاہل لڑکوں کے والدین انہیں پرفارمنگ آرٹس میں کیوں داخلہ دلاتے ہیں؟ انہیں منشی فاضل کرنا چاہیے یا مفتی کا کورس۔ اس ملک میں پہلے ہی اتنی گھٹن ہے۔ اب ہم ساڑھی بھی نہیں پہن سکتے کیا؟ مرد تو یہاں نیکر پہن کر دندناتا پھرے اور اس کے بعد جی بھر کے ریپ کرے۔ مگر عورتیں ساڑھی بھی نہ پہن سکیں۔ ساڑھی تو مشرق کا کلچر ہے۔ فوج کی ڈاکٹرز اور نرسیں بھی تو ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ کیا انہیں ساڑھی پہننے پر نوکری سے نکال دیا جاتا ہے؟ اور اگر اس لونڈے کا ایمان خراب ہوتا ہے تو نہ گھورے اپنی استانی کو! میرا حکومت سے مطالبہ ہے کہ ساڑھی کو قومی لباس قرار دیا جائے اور بلاؤز کے ڈیزائن اور اسکے مختصر یا بڑے ہونے پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔ وائس چانسلر کو شرم آنی چاہیے۔ عورت ہونے کے باوجود ایک مرد کو سپورٹ کرتی ہے۔ اس کو برطرف کیا جائے۔ اور لڑکے کو بھی یونیورسٹی سے نکالا جائے۔ زینت ہمیں تم پر فخر ہے۔ تم نے ہم عورتوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ شاباش!'

منہ سے جھاگ اڑاتے سائرہ ہذیانی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔ اسکا بولنا ختم ہوا تو سب زور و شور سے تالیاں بجانا شروع ہو گئے۔ کچھ جوشیلی فیمی نسٹس ڈیسک بھی بجا رہی تھیں۔

'اس کے علاوہ میں گوہر سے یہ درخواست کرونگی کہ ہمیں زینت کے حق میں پرائم منسٹر کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ ہماری آواز بڑے ایوانوں میں پہنچ سکے۔ اگر ہم یہ نہ کر سکے تو یہ مرد ہمیں ساری عمر اپنے پیر کی جوتی بنا کر رکھیں گے!' سننے والوں کا جوش و خروش سائرہ کا حوصلہ مزید بڑھا چکا تھا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بھاشن دے رہی تھی جیسے کوئی سیاسی لیڈر ہو اور سننے والے اس کے اندھے بہرے گونگے ووٹرز۔

'تھینک یو سائرہ۔ آپ نے بالکل درست آئیڈیا پیش کیا۔ ہم سینئر سٹاف میٹنگ میں مظاہرے کے حوالے سے بات کرینگے جس میں آپکو بطور معاون خصوصی مدعو کیا جائے گا۔'

'ذرہ نوازی ہے آپ کی!' سائرہ بولی۔

'رابعہ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟' گوہر نے اچانک پوچھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ رابعہ معمولی صحافی نہیں۔

'نہیں میرا کوئی سوال نہیں۔۔۔'

'آپ کچھ کمنٹس کرنا چاہیں؟'

'آپ اصرار کرتی ہیں تو ضرور۔۔۔' رابعہ نے کہا اور کچھ یوں آغاز کیا:

'میں یونیورسٹی کی وائس چانسلر کی بات کو سپورٹ کرتی ہوں۔ ہر جگہ کا ایک ڈریس کوڈ ہوتا ہے۔ جسے فالو کرنا ہم پر فرض ہے۔ اس کے علاوہ مقامی کلچر اور رسم و رواج کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے تعلیم امریکہ میں حاصل کی۔ وہاں پر تو کلب تک میں ڈریس کوڈ ہوتا ہے۔ آپ جاگنگ سوٹ پہن کر کسی ڈسکوٹیک میں نہیں جاسکتے۔ آپ برہنہ ساحل پر کپڑے پہن کر نہیں جاسکتے۔ یہ جو آپکے ڈونرز ہیں۔۔۔ گورے۔۔۔ یہ سب آپ لوگوں سے زیادہ عزت دیتے ہیں ہمارے کلچر کو۔ ہر مرد سفیر کو بتایا جاتا ہے کہ کس مقامی خاتون سے ملاقات کرتے ہوئے وہ مصافحہ کرسکتا ہے اور کس سے نہیں۔ اسکے علاوہ ایک کلاس میں مختلف بیک گراونڈ رکھنے والے کئی طالب علم ہوسکتے ہیں۔ اور ساڑھی تو اس ملک کا کلچر نہیں۔ کیا نارتھ میں پہنی جاتی ہے؟ ساوتھ میں؟ ایسٹ میں؟ ویسٹ میں؟ ایلیٹ کلاس میں پہنی جاتی ہے زیادہ تر۔ یا پھر وہ خواتین پہنتی ہیں جو ہمسایہ ملک سے یہاں آئیں۔ ملک کی جتنی بھی آبادی ہے، ان میں کتنی فی میلز ساڑھیاں پہنتی ہیں؟ فوج کی ڈاکٹرز اور نرسیں ساڑھی پہنتی ہیں۔ لیکن وہ ساڑھی جسم کو مکمل کور کرتی ہے۔ کوئی بھی لباس اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ فل آستین کا بلاوز ہوتا ہے۔ جسم کا کوئی بھی حصہ ننگا نہیں ہوتا۔ معذرت کے ساتھ جس قسم کا بلاؤز زینت صاحبہ نے پہن رکھا ہے وہ مجھے مشہور بھارتی اداکارہ زینت امان کی فلم "ستم شوم سندرم" کی یاد دلاتا ہے۔ فوجی عورتوں کے ایک بلاوز میں جتنا کپڑا لگتا ہے اس میں زینت بی بی کے چار بلاوز آرام سے تیار ہوسکتے ہیں۔ اگر آپکے شاگرد نے آپ کے بجائے چھت کو گھورا تو وہ یقیناً حضرت یوسف کا فالور ہے۔ آپ لوگوں کو اسے تمغہ دینا چاہیے۔ اور جانبداری کا عالم ملاحظہ ہو۔ آپ نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اس طالبعلم کو انوائیٹ ہی نہیں کیا۔ سب یک طرفہ شروع ہوگئے! آپ کو شرم آنی چاہیے زینت بی بی۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیے۔ ابھی بھی اس بلاؤز میں آپ کا آدھا سینہ ابل ابل کر باہر نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ یہ کس قسم کی۔۔۔'

رابعہ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ زینت نے غصے کے عالم میں اسے "بچ" یعنی کتیا کہہ دیا

Hold your tongue Ms Zeenat!

ایک بھاری اور بلند مردانہ آواز میٹنگ روم میں گونجی۔ یہ بدر تھا۔

'You must apologise. It is not a brothel!'

بدر نے اپنی بات میں اضافہ کرتے کہا۔ اسکی تائید میں شہباز بھی بول اٹھا۔ گوہر کو ان دونوں پر بہت غصہ آیا۔ زینت اس کی بہت قریبی دوست تھی۔

'لیکن یہ تو انگریزی کا محاورہ ہے۔ عام بولا جاتا ہے۔ میرا مطلب گالی دینا تو ہر گز نہ تھا۔' زینت بولی۔

'ڈاکٹر بدر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپکو اپنے الفاظ فوراً واپس لے لینے چاہییں۔' اس بار مشہور علی بھی بول پڑا۔ گوہر نے زینت کو کہنی ماری۔ وہ سمجھ گئی۔

'میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ مجھے ایسا ہر گز نہیں کہنا چاہیے تھا۔' زینت بولی۔ رابعہ دوبارہ شروع ہوئی:

'کوئی بات نہیں زینت! میری بہت ساری انڈین فرینڈز ہیں۔ ورکنگ وومین ہیں۔ وہ اب ساڑھی نہیں پہنتیں۔ کہتی ہیں ساڑھی بہت وقت لیتی ہے۔ بات درست ہے۔ وہ زیادہ تر شلوار قمیض یا جینز شرٹ پہنتی ہیں۔ تو دیکھیے معاشرے میں تبدیلی کے ساتھ پہناوے بھی بدل جاتے ہیں۔ سائرہ بی بی مجھے افسوس ہوا آپ نے اس معصوم لڑکے پر اپنی استانی کو گھورنے کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ زینت بی بی نے تو اپنی گفتگو میں اس بات کا اشارہ تک نہ دیا۔ وہ تو ہمیں یہ ہی بتاتی رہیں کہ طالب علم چھت کو گھورتا رہا۔ جبکہ زینت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ شاگرد انہیں دیکھے۔ زینت بی بی نے اپنی گفتگو میں اپنے طالب علم کی بے عزتی کی مثلاً انہوں نے اسکے لیے حرامی یعنی باسٹرڈ کا لفظ استعمال کیا۔ پھر یہ کہا کہ کس نے اتنی گندگی بھر دی اس کے دماغ میں! ایک طرف وہ یہ دعوی کرتی ہیں کہ سب طالب علم ان سے بے حد پیار کرتے ہیں اور یہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ کیا یہ کھلا جھوٹ اور منافقت نہیں؟'

'بالکل ہے اور ہمیں اسکی مذمت کرنی چاہیے۔' شرکاء میں سے ایک آواز آئی۔

'آپ نے لڑکے کو مولوی کا بچہ کہہ کر اسکی تضحیک کی۔ یہ غیبت بھی ہے۔ کیا آپ لوگ مسلمان نہیں؟' شرکاء میں سے کوئی اور بولا۔

'ہمارا مذہب انسانیت ہے!' یہ کریمہ تھی۔ ادارے میں ریسرچ اسسٹنٹ۔ رابعہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

'یہ کس انسانیت کے صحیفے میں لکھا ہے کہ کسی معصوم پر بہتان تراشی کی جائے؟ ویسے میں آپ کی شادی میں موجود تھی۔ آپ کے والد نے آپکو مسجد سے رخصت کیا تھا۔ اور آپکا نکاح مولانا اطہر عثمانی نے پڑھایا تھا۔ اور آپ نے اپنے بیٹے کا عقیقہ بھی دھوم دھام سے کیا تھا۔ اس بارے میں کیا خیال ہے آپکا؟' رابعہ نے کریمہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کریمہ کی زبان گنگ تھی۔

'میں سمجھ رہی تھی کے آپ لوگ کوئی سنجیدہ بات کرینگے۔ یہ کیا مسخرہ پن ہے! اس پورے ملک میں کتنی خواتین کا یہ مسئلہ ہے کہ انہیں قابل اعتراض ساڑھی پہن کر تعلیمی اداروں میں پڑھانے کی اجازت ہو؟ کونسا ظلم ہوا ہے زینت بی بی کیساتھ؟ کیا شکیلہ سے زیادہ

ظلم ہوا ان پر؟ آپکو وہ انسانیت سوز ظلم کیوں نظر نہیں آتا؟ کیا آپ نے شکیلہ کے حق میں ایک بھی ایسا سیمینار کیا؟ نہیں کیا! اس لئے کہ وہ آپکے ایجنڈے کو سوٹ نہیں کرتا۔ شرم کا مقام اس خاتون وائس چانسلر یا اس بچے یا اسکے والدین کے لئے ہر گز نہیں بلکہ آپ سب کے لئے ہے۔ افسوس۔۔میں نے یہاں آکر وقت برباد کیا!' رابعہ بولی۔ اسکی آواز میں تاسف صاف محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحوں کے لئے میٹنگ روم میں سناٹا طاری رہا۔ پھر بوڑھا مشہور علی کھڑا ہوا۔ وہ جوش و خروش سے تالیاں بجا رہا تھا۔۔ایسے جیسے فٹبال کا فائنل اس کی پسندیدہ ٹیم جیت چکی ہو۔ چند لمحوں بعد شہباز اور اس کے بعد سب نے اس کی پیروی کی۔ زینت اور گوہر اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان رہے۔ جب انہیں احساس ہوا کہ اگر وہ نہ اٹھے اور تالیاں نہ بجائیں، تو داد کا یہ شور تھمنے کا نہیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جب انہوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں تو یہ سلسلہ جلد رک گیا۔ جب خاموشی چھا گئی تو مشہور علی چلا کر بولا: 'مجھے سوال یاد آگیا۔ مجھے سوال یاد آگیا! کیا میں اب کر سکتا ہوں؟'

'جی کر لیجئے۔۔۔اب رہ ہی کیا گیا ہے؟' گوہر نے بیزاری کے عالم میں کہا۔

'دراصل میرا حافظہ مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔ اس لئے سب سے معذرت۔ میں یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا جو اس دلیر بیٹی رابعہ نے مجھ سے زیادہ موثر انداز میں کہہ دیا!' مشہور بھولپن سے بولا اور محفل کشت زعفران بن گئی۔ مگر سب کے لئے نہیں۔ گوہر، زینت اور سائرہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو سب سے پہلے رابعہ اور اسکے بعد باقیوں کو کچا چبا جاتیں!

بدر اور شہباز گوہر کے کمرے میں تھے۔ وہ ان دونوں پر برس رہی تھی۔

'مجھے یقین ہے کہ یہ خبریں آپ دونوں نے یہاں آنے سے پہلے پڑھ لیں ہو نگی!' وہ ہر لفظ چبا چبا کر ادا کر رہی تھی۔ لہجے میں طنز واضح تھا۔

'خالص ترقی کا مضحکہ خیز سیمینار۔'

'عریانی کا سب سے بڑا ٹھیکیدار۔۔۔خالص ترقی۔!

'خاتون صحافی نے فیمی نسٹس کو سیمینار میں ننگا کر دیا۔'

'یہ بکواس چھپی ہے اردو پریس میں۔ اس قسم کی لغویات ہمارے بارے میں آج تک نہیں چھپیں۔ کس نے کہا تھا اردو پریس کو بلاؤ؟ کیا اس بدنامی کے لئے ہم نے آپکو رکھا تھا؟

ڈونرز انگریزی اخبارات پڑھتے ہیں، اردو نہیں۔' گوہر نے چند اخبارات زور سے شہباز کے طرف پھینکتے کہا۔ یہ انداز اسے اچھا نہ لگا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

'اس رابعہ کو تو اردو پریس والوں نے ہیرو بنا دیا۔ سب اسی کے گن گا رہے ہیں اور ہم پر تھو تھو ہو رہی ہے۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ نہ جانے کیا گل کھلائے گی سنڈے میگزین کے فیچر میں۔ وہ تو انگریزی میں لکھتی ہے۔ ڈونر پڑھے گا تو بہت بدنامی ہو گی۔ اتنی نیک پروین تو ہے نہیں کہ چپ سادھ لے۔ کیا اسے کوئی بھاری کنسلٹینسی دے کر خاموش کیا جا سکتا ہے؟'

'پیسہ اس کا مسئلہ نہیں ہے ڈاکٹر گوہر۔ سب جانتے ہیں وہ جدی پشتی امیر ہے۔ ایسی آفر کبھی بھول کر بھی نہ کر بیٹھیے گا۔ الٹا اداریہ چھاپ دے گی ہمارے خلاف!' شہباز بولا۔

'رابعہ نے تو مایوس کیا سو کیا۔ پر آپ دونوں نے جو چھرا ہماری پیٹھ میں گھونپا، اس کا افسوس تاحیات رہے گا۔۔۔'

'کیسا چھرا؟ ہم نے ایسا کیا کیا؟' بدر نے پوچھا۔

'اپنے قبیلے کو کوئی بھی برا نہیں کہتا بھلے قبیلہ اندر سے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ آپ لوگوں نے جس تھالی میں کھایا اسی میں سوراخ کیا۔ زینت کو سپورٹ کرنے کے بجائے آپ رابعہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔' گوہر بولی۔

'اگر ڈاکٹر بدر ایسا نہ کرتے تو بات بہت آگے جا سکتی تھی۔ زیادہ تر لوگ رابعہ کے موقف سے متفق تھے۔ اور زینت بی بی کو تو سارا شہر جانتا ہے کہ وہ کافی منہ پھٹ ہیں۔ پھر سائرہ بی بی تو بات ہی بدتمیزی سے کرتی ہیں۔ یہ دونوں مل کر کچھ اور بک دیتیں تو معاملہ بہت زیادہ بگڑ سکتا تھا۔ اسکے علاوہ۔۔۔'

شہباز مزید کہنا چاہ رہا تھا مگر گوہر نے اسے اونچی آواز میں "شٹ اپ" کہہ کر خاموش کرا دیا۔ شہباز کو احساس ہوا کہ اس نے خالص ترقی جوائن کر کے بہت غلطی کی۔ اگر گوہر کی جگہ کوئی مرد باس ہوتا تو وہ طبعیت صاف کر دیتا۔

'یہ جو تم نئے ماڈل کی لینڈ کروزر چلاتے ہو۔۔۔ کیا یہ تمہیں رابعہ کے ادارے نے دی ہے؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کھاؤ اسی کا گن گاؤ۔ تم نے بہت مایوس کیا بدر۔'

'لیکن رابعہ نے کیا غلط کہا؟ کیا زینت شکیلہ سے بڑی مظلوم ہے؟' بدر بولا۔

'تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنی ایک مہینے کی تنخواہ شکیلہ کو دے دیں۔ یہ لینڈ کروزر بیچ کر کوئی کھٹارہ گاڑی خرید لیں اور شکیلہ کا علاج لندن سے کرا لیں! ارے بھئی یہاں کتنے مولوی بچوں سے زیادتی کرتے رنگے ہاتوں پکڑے جاتے ہیں۔ ان مولویوں کا قبیلہ فوراً تھانے پہنچ جاتا

ہے اور ایف آئی آر درج نہیں ہونے دیتا۔ معاملہ بار و بار سیٹل ہو جاتا ہے۔ کسی مولوی کے خلاف دوسرا مولوی گواہی نہیں دیتا۔'

'فوج میں ایک کرپٹ جرنیل دوسرے کو سپورٹ کرتا ہے۔ یہ ہی عالم بیوروکریسی میں ہے۔ ہم تم تو پھر بھی کچھ کرتے ہیں۔ ملک کا پیسہ تو لوٹ کر نہیں کھاتے۔ میری تمہاری تنخواہ عوام کے ٹیکس کے پیسے سے تو نہیں آتی۔ تم نے اگر رابعہ کے گن گانے ہیں تو یہ نوکری چھوڑ کر اس کا اخبار جوائن کر لو۔ میں دیکھتی ہوں کیا تنخواہ دیتے ہیں وہ تمہیں۔ تم مہینے کی تنخواہ سے بجلی کا بل بھی ادا نہ کر سکو گے۔ میں تم لوگوں کی دشمن نہیں۔ ہم ایک قبیلہ ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے۔' گوہر اب ذرا دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

'میں پوری کوشش کرونگا کہ رابعہ میگزین میں ہمارے خلاف کچھ نہ چھاپے۔' شہباز نے گوہر کو تسلی دیتے کہا جو کافی فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔

باب 9

لکھنو کا نواب!

'آج آسکتے ہیں آپ؟'

'سوری، میں پہچانا نہیں۔ آپ کون بات کر رہے ہیں؟ شہباز نے پوچھا۔

'افضال بول رہا ہوں۔ غزالہ کا شوہر۔۔۔'

افضال کے فون نے اسے اچنبھے میں ڈال دیا۔ ایسی کیفیت غزالہ کے فون کرنے پر نہ ہوتی۔ 'یہ کیوں فون کر رہا مجھے؟' وہ سوچ رہا تھا۔

'کوئی خاص بات ہے کیا؟' شہباز نے افضال سے کہا۔

'آپ جب بھی ہمارے گھر تشریف لائے، کبھی عام بات بھی دیکھنے کو ملی؟' افضال نے پوچھا۔

'آپ درست فرما رہے ہیں۔' شہباز بولا۔

'دراصل لاسٹ ٹائم جب آئے تو میں آپ سے مل نہ سکا۔ شہر سے باہر تھا۔ آج فرصت تھی سوچا آپ کو گپ شپ کے لئے بلا لیا جائے۔' افضال بولا۔

'آپ اکیلے۔۔۔'

'جی نہیں میری وائف بھی ہونگی۔' افضال کو جیسے علم تھا کہ شہباز یہ ضرور پوچھے گا کہ غزالہ گھر پر ہوگی یا نہیں۔ اسی لئے اس نے اس کی بات کاٹ دی اور بتا دیا کہ وہ بھی ہوگی۔

'آپکی وائف۔۔۔ مطلب۔۔۔ کون؟' شہباز کا دماغ بری طرح الجھ چکا تھا۔

'غزالہ۔۔۔ اور کون؟ آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے؟

'جی۔۔۔ سوری۔۔۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ تو کوئی خاص بات جو آپ دونوں ملنا چاہ رہے ہیں؟' شہباز نے پوچھا لیکن جواب نہ آیا۔ وہ بار بار ہیلو ہیلو کر رہا تھا اس بات کا یقین کرنے کے لئے کہ کہیں فون کٹ تو نہیں گیا۔ چند لمحوں بعد آواز آئی مگر افضال کی نہیں غزالہ کی!

'تمہیں آنے میں کیا تکلیف ہے؟ کیوں سوال پہ سوال کیے جا رہے ہو؟ میں ہونگی گھر پر!'

'میں ہونگی!' بس یہ ہی اک جملہ شہباز سننا چاہتا تھا۔

'دس بجے پہنچ جانا۔ وائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ پہن کر آنا۔ میں انتظار کرونگی!' غزالہ نے ڈریس کوڈ بھی لاگو کر دیا۔

'تم کیا پہنوں گی؟'

'تم کیا چاہتے ہو؟'

'جو تمہاری مرضی۔ تم ہر روپ میں حسین لگتی ہو!'

'میں یا بالکل ننگی ہو نگی یا طالبان والا شٹل کاک برقعہ پہنوں گی!' غزالہ ہنس دی اور یہ سن کر وہ بھی ہنس دیا۔

شہباز مقررہ وقت پر دونوں کے گھر پر تھا۔ افضال نے اسکا استقبال کیا۔ دونوں لاونج میں بیٹھے اپنے اپنے ڈرنک کا مزہ لینے کے علاوہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرر ہے تھے۔ اچانک افضال نے ایک عجیب سا سوال داغ دیا۔

'آپ پورن فلمیں دیکھتے ہیں؟'

'میرے خیال میں کون نہیں دیکھتا۔۔۔ میں بھی دیکھتا ہوں مگر مجھے صرف پورنوگرافی اچھی نہیں لگتی۔ آجکل کی ان فلموں میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ کوئی اداکاری نہیں ہوتی۔ کوئی بیک گراونڈ میوزک نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف سیکس اور اس میں بھی لوپ کے ذریعے ریپے ٹیشن۔ بہت بور کرتی ہیں یہ فضولیات۔' شہباز نے کہا۔

'میرے بھی کچھ ایسے ہی خیالات ہیں۔ آپکو معلوم ہے جب ڈیپ تھروٹ سنیما پر لگی تھی تو جیکولین کینیڈی اسے دیکھنے آئی تھی۔ کیا آج کل کی کسی پورنوگرافک فلم کو کوئی خاتون اول دیکھنے آئے گی سنیما پر؟' افضال بولا۔

'ہر گز نہیں۔۔۔ جی مجھے معلوم ہے کینیڈی کی بیوی لنڈا لولینس کی ڈیپ تھروٹ دیکھنے سنیما گئی تھی۔ لیکن وہ سکرپٹ کے لحاظ سے خاصی کمزور فلم تھی۔ اس حساب سے کیلی گولا کمال کی فلم تھی گو کہ وہ پورنوگرافگ فلم نہیں۔ لیکن گرافک سیکس نے اسے پورنوگرافی میں ڈھال دیا۔' شہباز نے کہا۔

'آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اگر کیلی گولا سے ایکسپلٹ سیکس نکال دیا جائے تو زبردست ہسٹری فلم ہے۔' افضال بولا۔

'میرے نزدیک بہترین پورن فلموں کا زمانہ ستر کا ہی تھا۔ کچھ اسی کی ابتدا تک اچھی فلمیں بنیں اسکے بعد صرف کچرا پروڈیوس ہوا۔ آپکی فیورٹ پورن ایکٹریس کون ہے؟' شہباز نے افضال سے پوچھا۔

'مجھے اینت ہیون، برجت مونت، جارجینا سپیل ون، سیکا اور کے پار کر پسند ہیں۔ اپنی غزالہ تو بالکل اینت ہیون ہے۔ کیا خیال ہے آپکا؟'

'جی واقعی یہ تمام بہترین اداکارائیں تھیں اپنے وقت کی۔' شہباز کہتا ہے۔

'میں غزالہ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں!'

'کیا؟'

'وہ بالکل اینت ہیون نہیں لگتی؟'

'شکل وصورت سے تو نہیں لگتی!'

'باڈی، شیپ اور فگر تو بالکل ویسا ہی ہے نا؟' افضال نے شہباز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

'غزالہ اینت ہیون سے ہزار گناہ زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے!' شہباز نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ اس لمحے وہ شدت سے غزالہ کو یاد کر رہا تھا۔ افضال نے اس کی بات کے جواب میں ایک شیطانی قہقہہ بلند کیا۔

'بہت قہقہے لگ رہے ہیں۔ کونسا لطیفہ ہے اور کس نے سنایا ہے۔ ہمیں بھی سناؤ!' غزالہ نے سیڑھیوں سے اترتے لاونج میں آتے کہا۔

'بھئی ہم فلموں کا ذکر کر رہے تھے۔ اپنے شہباز صاحب اس معاملے میں ہم جیسا ہی ذوق رکھتے ہیں۔' افضال بولا۔

'کتنی فلمیں دیکھی ہونگی آپ نے اب تک؟' غزالہ نے شہباز سے پوچھا۔

'گنتی تو نہیں کی۔ سیکنڑوں میں ہونگی۔'

'لیکن جو فلم آج ہم آپکو دکھائیں گے اور جس کے لئے ہم دونوں نے یہ میٹنگ رکھی ہے، آپکے ہوش اڑا دیگی۔ آپ بے شک شرط لگا لیں ایسی فلم آپ نے زندگی میں نہ دیکھی ہوگی۔' غزالہ نے کہا۔

آج وہ روایتی شلوار قمیض میں تھی۔ گلے میں دوپٹہ بھی تھا۔ اس مشرقی حلیے میں وہ کسی افسانوی کردار کی شبیہہ پیش کر رہی تھی۔

'ایسی کونسی فلم ہوگی جو میں نے نہ دیکھی ہو؟ اگر دیسی ہے تو پھر مان سکتا ہوں۔ دراصل مجھے دیسی فلمیں تو بے کار لگتیں ہیں۔ اکا دکا بھارتی فلمیں اچھی ہیں۔ اسکے علاوہ سب مال فارمولا ہے۔ فلم تو گورا بناتا ہے۔' شہباز نے جواب دیا۔ غزالہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔

'آپکا اندازہ درست ہے۔ یہ لوکل فلم ہے۔ ایک بار یہ دیکھ لی تو باقی سب فلمیں بھول جائیں گے۔' افضال کہتا ہے۔

'اب تو میرے تجسس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں واپسی پر آپ سے وڈیو لے جاؤنگا اور آج ہی دیکھ لوں گا۔' شہباز نے کہا۔

'وڈیو دینا ناممکن ہوگا۔ البتہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر یہیں دیکھ سکتے ہیں۔' افضال بولا۔

'جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ لوگ خراب کر دیتے ہیں یا واپس نہیں کرتے۔ میرے ساتھ بھی کئی بار ایسا ہوا۔ کوئی دوست کتاب یا وڈیو لے گیا۔ اول تو واپس ہی نہیں کریگا۔ اور اگر کر بھی دی تو تباہ حال میں۔ 'کتابوں پر لکیریں، صفحے پھٹے ہوئے اور فلم کا پرنٹ تباہ۔ کوئی بات نہیں یہیں دیکھ لینگے کسی دن۔ 'شہباز نے کہا۔ وہ فلم دیکھنے تو آیا نہیں تھا۔ وہ تو اس حسن کی دیوی کی پوجا کرنے آیا تھا جو اسکے سامنے کھڑی تھی۔

'کسی دن نہیں۔ آپ آج ہی دیکھیں گے ہمارے ساتھ۔ بلکہ اسی وقت!' غزالہ حکم صادر کرتے بولی۔

شہباز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صورت حال کس طرف جا رہی ہے۔ وہ فلم دیکھنے کے موڈ میں ہرگز نہ تھا۔ اور اسے فلم تنہائی میں ہی دیکھنے کا مزہ آتا تھا۔ وہ اچھے ڈائلاگ اور سینز ریورس کر کے بار بار دیکھنے کا عادی تھا۔ یہ سب کچھ اکیلے ہی ممکن تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ غزالہ نے کہا: 'چلیں اپنا اپنا گلاس اٹھائیں اور تھیٹر روم میں فلم دیکھتے ہیں۔'

یہ سنتے ہی سب سے پہلے افضال کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا اور شہباز کا گلاس پکڑا اور کہا: 'چلیں اوپر چلتے ہیں۔' اس دوران غزالہ سیڑھیوں پر تیسرا قدم رکھ چکی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ تینوں تھیٹر روم میں تھے۔ بڑا سا خالی کمرہ تھا۔ سی ڈی پلیر، ملٹی میڈیا اور سفید سکرین، ساؤنڈ سسٹم۔۔۔ سب لوازمات کمرے میں موجود تھے۔ سامنے صوفے ایسے رکھے تھے جیسے سب کچھ ایک منی سینیما ہال ہو۔ غزالہ اور شہباز صوفے پر بیٹھ گئے۔ افضال نے سی ڈی لگائی اور لائٹس آف کر دیں۔ اسکے بعد وہ غزالہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہو گئی۔

'یہ تو آپکے گھر کا بیرونی منظر ہے!' شہباز کہتا ہے۔

'حضور آگے تو دیکھیے۔۔۔' افضال نے کہا اور چند لمحوں بعد جو سین سکرین پر نمودار ہوا اسے دیکھ کر شہباز کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ یہ اسکی اور غزالہ کی خاص فلم تھی!

'یہ کیا بکواس ہے؟ آپ لوگ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں؟ مجھے پرواہ نہیں بدنامی کی۔ جسے بھیجنا چاہتے ہیں بھیج دیں یہ فلم۔۔۔'

Relax baby relax. Take it easy!

غزالہ بولی۔

'تمہیں بلیک میل کر کے ہم نے کیا کرنا ہے؟ کونسا منصب ہے تمہارے پاس؟ ہمارے پاس تو ایسے طاقتور لوگوں کی فلمیں ہیں کہ تم دیکھنے کے باوجود یقین نہ کرو ان کے کرتوتوں پر! لیکن ہم نے آج تک کسی کو بلیک میل نہیں کیا۔ یہ محض ہماری ہابی ہے۔' افضال بولا۔

'تم لوگ کیا چاہتے ہو! قیمت چاہتے ہو اسکی؟'

'تمہارے اکاونٹ میں جتنے پیسے اس وقت ہیں اس سے کہیں زیادہ میرے خانساماں کے کھاتے میں ہونگے۔ ہم نے پہلے ہی بتا دیا کہ ہم یہ سب کچھ بلیک میلنگ کی خاطر نہیں اپنے شوق کی تسکین کے لئے کرتے ہیں۔ شاید تمہیں ابھی یقین نہ آئے لیکن آہستہ آہستہ آ جائے گا۔' افضال بہت پیار سے شہباز کو سمجھا رہا تھا لیکن اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

'

مجھے چلنا چاہیے۔ اس عزت افزائی کا شکریہ۔' یہ کہتے شہباز کھڑا ہو گیا۔

'ایسے نہیں۔ اب تم ہمارے مرضی کے بغیر نہیں جا سکتے۔' غزالہ نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

'تو شروع کر دی تم نے بلیک میلنگ!' شہباز نے کہا۔

Don’t assume or you will confuse yourself!

میرے پیچھے آو۔' یہ کہہ کر غزالہ تھیٹر روم سے باہر نکل گئی۔ اسکے قدم اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ رہے تھے۔ افضال شہباز کے پیچھے چل رہا تھا۔ غزالہ بیڈ روم میں پہنچ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ افضال اسکے ساتھ چپک گیا۔

'میں نے تمہیں اس دن کہا تھا نا کہ افضال طاقتور مرد ہے۔ آج یہ اپنی مردانگی کا مظاہرہ کرے گا تمہارے سامنے۔ تم صرف دیکھو گے۔ ہم ان لمحوں کو یادگار بنانا چاہتے تھے کسی اچھے اور مخلص دوست کے ساتھ۔ ہمیں اپنے سرکل میں سب سے زیادہ خلوص اور سادگی تم میں دکھائی دی۔ اس لئے اس اہم موقع پر تمہیں مدعو کیا اور تم ہمیں بلیک میلر سمجھتے ہو! اسے ایک بہت عظیم اعزاز سمجھو۔ یاد رکھو ہم مر جائینگے مگر اپنے دوستوں کی عزت پر آنچ نہیں آنے دینگے۔ یہ کہہ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ ایک اور نئی فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔

کیمرہ مین شہباز تھا۔ کیمرہ اس کی آنکھیں تھیں۔ شاید کوئی اور کیمرہ بھی ہو۔ پر شہباز کا فوکس اس وقت کہیں اور تھا۔ افضال بے شک ایک مضبوط مرد تھا۔ یہ اور بات کہ بے غیرت تھا۔ اس لمحے شہباز کے ذہن میں ایک بات آئی۔ افضال تو بے غیرت ٹھہرا۔ تو وہ خود کیا تھا؟ وہ تو اس بے غیرتی کے سٹیج پر گیسٹ آف آنر تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اسکی نظر غزالہ پر گئی۔ وہ اسے انگلی کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ اس طرح غیر تمند اور بے غیرت ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ جب حمام میں سب ننگے تو کیا غیرت کیا بے غیرتی!

وہ جیسے ہی غزالہ کے پاس پہنچا افضال نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا یہ کہتے ہوئے: 'پہلے آپ حضور!' شاید وہ لکھنو کا کوئی نواب تھا!

گھر پہنچ کر شہباز نے رابعہ کو فون کیا۔ وہ یہ کام دفتر سے بھی کر سکتا تھا۔ پر اسے علم تھا کہ بات لمبی ہو جائے گی اور شاید تلخ بھی۔ اس کی توقعات کے برعکس رابعہ اس حد تک اس کی بات مان گئی کہ نزلہ خالص ترقی پر نہیں گرے گا۔ وہ زینت کو مکمل طور پر رگڑ دینا چاہتی تھی۔ اس معاملے میں کوئی رعایت ممکن نہ تھی۔ اور دیکھا جائے تو یہ شہباز کے ادارے کے لئے مسئلہ نہ تھا۔ وہ زینت کے بارے میں جو جی چاہے لکھے بس خالص ترقی پر کوئی حرف نہ آئے۔

وہ ہوشیار صحافی تھا۔ اس نے رابعہ کے دماغ میں ایک نئی کھڑکی کھول دی۔ اس نے اسے کہا کہ وہ یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر اور اس بچے اور اسکے والدین سے بھی تفصیل سے بات کرے اور اس سارے معاملے کو تفصیل سے فیچر کی شکل میں لکھے۔ کوئی بھی پہلو نظر انداز نہ کرے۔ ساتھ ہی اس نے رابعہ کو یہ خبر بھی دے ڈالی کہ جلد ہی گوہر پارلیمنٹ کے سامنے زینت کے حق میں خالص ترقی کے سٹاف کے ہمراہ احتجاجی مظاہرہ کرے گی۔ اس معاملے میں اسے سائرہ عبید اللہ کی تائید بھی حاصل ہے۔

یہ سب باتیں رابعہ کو بتانے کا مقصد گوہر کے زینت کے حق میں مظاہرے کی راہ میں روڑے اٹکانا تھا۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہ تھی کہ ساڑھی میں کلاس لینے پر اعتراض کوئی ظلم و ستم نہ تھا۔ جو شکیلہ کے ساتھ ہوا وہ درندگی تھی۔ پر گوہر اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے زینت کی ساڑھی کا غم کھائے جا رہا تھا۔

رابعہ نے شہباز کا شکریہ ادا کیا۔ اس دوران غزالہ کا فون آ گیا۔ وہ شہباز سے ملنا چاہتی تھی۔ افضال بھی گھر پر نہ تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ چشم زدن میں وہ اسکے گھر پر تھا۔

'تم ایسا کیوں کرتی ہو؟' لاونج میں غزالہ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے شہباز نے پوچھا۔ آج غزالہ پٹھانیوں والے لباس میں تھی۔ گھیرے دار شلوار قمیض اور رنگ برنگی کڑاہی کا کام۔ آج وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اس کے دل میں ایک خواہش نے جنم لیا۔۔۔ کاش وہ اسکی بیوی ہوتی!

'ایسا سوچنا بھی نہ!' غزالہ نے کہا اور وہ حیران ہو گیا۔ پہلے پہل تو اس نے سوچا کہ یہ سوال گندم اور جواب چنا والا معاملہ ہے۔ لیکن اس کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا جب غزالہ نے کہا:

'میں تمہاری بیوی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بیوی کے روپ میں تم مجھے ایک ہفتہ بھی برداشت نہ کر پاؤ گے۔'

'تمہیں کیسے معلوم میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش تم میری بیوی ہوتیں؟' تجسس کے مارے عاشق نے پوچھا۔

'میں لوگوں کا دماغ پڑھ لیتی ہوں۔ تم اس لباس میں اس عورت کو تلاش کر رہے ہو جو تمہاری نظر میں آئیڈیل ہے۔ ایک شرم و حیا والی دوشیزہ۔ ایک مشرقی لڑکی۔ جو خوبصورت بھی ہو اور ذہین بھی۔۔۔'

'میں بالکل ایسا ہی سوچ رہا تھا!'

'لیکن میں تو مشرقی لڑکی ہرگز نہیں ہوں!'

'تم مغرب میں پیدا ہوئی تھیں کیا؟'

'وہ بھی نہیں!'

'پھر تم کیا ہو؟'

'ایک سراب! جس کا تم پیچھا کر رہے ہو۔ ایک دن ایسا آئے گا تم میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ میرے قریب پہنچ جاؤ گے۔ پھر میں تم سے چند گز قدم دور چلی جاؤنگی۔ تم چند قدم آگے بڑھو گے یہ سوچتے کے اب تم مجھے اپنے قابو میں کر لو گے۔ پر جتنے قدم تم بڑھو گے میں اتنے ہی قدم تم سے دور ہوتی جاونگی۔ میرا پیچھا کرتے کرتے تم بھٹک جاؤ گے اور تم ایک ذہنی مریض بن جاؤ گے۔ پھر میں تمہارے پاس واپس آونگی اک مسیحا بن کر۔ اور تم ٹھیک ہو جاوگے۔'

'تم پھر فلسفہ بول رہی ہو۔ اصل میں یہ فلسفہ بھی نہیں ہے۔ اسے اردو میں کہتے ہیں اوٹ پٹانگ باتیں کرنا۔ کوئی سر پیر نہیں تمہاری گفتگو کا!'

'اگر ایسا ہے تو تم اس احمق سے ملنے کیوں چلے آتے ہو؟ کسی سقراط یا حکیم لقمان سے کیوں نہیں ملتے؟'

شہباز کے پاس غزالہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

'کیا تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟'

'کرتا ہوں۔۔۔ پاگلوں کی طرح!'

'نہیں کرتے۔ تم میرے جسم کے لئے آتے ہو۔۔۔'

'یہ زیادتی ہے۔ اگر میں تمہارے جسم کی خاطر آتا تو کبھی بھی اسے افضال کے ساتھ شئیر نہ کرتا!'

'تم مجھے اسکے ساتھ نہیں، وہ مجھے تمہارے ساتھ شئیر کرتا ہے۔ وہ دیتا ہے قربانی کیونکہ وہ مجھ سے سچا پیار کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ مجھے میرا جسم اپنی پسند کے مرد کے ساتھ شئیر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اکثر اوقات خود مجھے مہیا کرتا ہے۔ جیسے اس دن اس نے تمہیں یہاں بلایا۔ وہ مجھے روکتا نہیں۔ وہ مجھے اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ جبکہ تم سب لوگ عورت کو اپنی جاگیر سمجھتے ہو۔ پیر کی جوتی، کنیز یا لونڈی سمجھتے ہو۔' غزالہ نے چھبتے ہوئے انداز میں کہا۔

'اگر وہ تم سے پیار کرتا ہے۔ اور تمہیں تمہارے طریقے سے خوش بھی رکھتا ہے، تو پھر وہ تم پر تشدد کیوں کرتا ہے؟'

'تمہیں کس نے کہا وہ مجھ پر تشدد کرتا ہے۔۔۔'

'یا خدایا۔ تم اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کو کیسی دیدہ دلیری سے جھٹلا دیتی ہو۔ ہماری پہلی ملاقات کی وجہ گھریلو تشدد تھا جو افضال نے تم پر کیا تھا۔ تمہارے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔۔۔'

'وہ میک اپ تھا۔ کمال کا میک اپ۔ اچھا میرا چہرہ دیکھو۔۔۔ کیسا لگ رہا ہے اس وقت؟'

'بہت خوبصورت۔ تروتازہ۔ ہشاش بشاش۔ شبنم کی طرح۔'

'گڈ۔ اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔' یہ کہہ کر غزالہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ شہباز اس کے پیچھے ہو لیا۔ کمرے میں روشنی بہت مدہم تھی۔

'اب آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ اور غور سے دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔' غزالہ نے کہا اور وہ ایک بہت بڑی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنی اشیاء تھیں وہاں بناؤ سنگھار کے لئے۔

'اب تم آنکھیں بند کر لو اور فون پر پندرہ منٹ کا ٹائمر لگا لو۔ جیسے ہی فون بجنا شروع ہو، تم آنکھیں کھول لینا۔ تم مجھے اپنے سامنے پاؤ گے اور حیران رہ جاوگے۔ میں اک نئے روپ میں تمہارے سامنے ہوں گی۔ لیکن وعدہ کرو چیٹ نہیں کرو گے۔ آنکھیں نہیں کھولو گے۔ اگر ایسا کیا تو ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔'

'میں تمہیں کبھی بھی دھوکہ نہیں دونگا۔ میری بند آنکھوں میں بھی تمہاری خوبصورت تصویر ہو گی۔' یہ کہہ کر شہباز نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ غزالہ کیا کرے گی اور کس روپ میں اپنے حسن کو اس پر ظاہر کرے۔ پندرہ منٹ بعد فون بجا۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ کسی نے غزالہ کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ اس کا چہرہ مکمل مسخ ہو چکا تھا۔

'میں نے کہا تھا نہ کہ تم مجھ سے نہیں میرے بدن سے پیار کرتے ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ میک اپ کا کمال ہے۔ میں نے اس دن بھی میک اپ کیا ہوا تھا۔ لیکن وہ نیل ڈالنے کے لیئے تھا۔ افضال تو کیا دنیا کے کسی مرد میں اتنی جرات نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکے۔' غزالہ نے کہا اور اسکے سامنے اپنا میک اپ اتارنا شروع کر دیا۔ منٹوں بعد اس کا حسن واپس لوٹ چکا تھا۔

'میرا شوہر مجھ سے سچا پیار کرتا ہے۔ تم نہیں۔ اسے میری روح سے پیار ہے۔ میں اس گیٹ اپ میں بھی اس کے سامنے جاتی ہوں۔ لیکن اس کے پیار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تمہاری تو چیخیں نکل گئیں میری بدصورتی دیکھ کر۔ تم کیا جانو سچا پیار کیا ہے؟'

'کیا نام ہے تمہارے شوہر کا؟'

'افضال! معلوم تو ہے تمہیں!'

'لیکن وہ تمہارا شوہر نہیں۔۔۔ تمہارا سگا بھائی ہے۔'

'شوہر بھی تو ہے!'

'اسی لیئے تمہیں دوسروں کے ساتھ شئیر کرتا ہے؟' شہباز نے طنز کرتے کہا۔

'تم اپنی بہن سے پیار کرتے ہو؟'

'اس طرح نہیں جسطرح افضال تم سے کرتا ہے۔ نارمل انداز میں کرتا ہوں جیسے ایک بہن بھائی کا پیار ہوتا ہے۔'

'کیا تم نے اپنی بہن کو کبھی ننگا دیکھا ہے؟'

'یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟'

'کیا تم اسکے ساتھ سوئے کبھی۔۔۔ بچپن یا لڑکپن میں؟'

Please shut up! Enough is enough!

شہباز نے چلا کر کہا۔

'تو پھر کیا جواب دوں تمہارے سوال کا؟'

'کونسے سوال کا؟'

'تمہیں تو اپنا سوال تک یاد نہیں رہتا۔ وہی جو تم نے پوچھا تھا۔۔۔'

'کونسا؟'

'یہ ہی کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟ جب تم آئے تھے تب کیا تھا نہ تم نے یہ سوال؟'

'ہاں۔ کیوں کرتی ہو ایسا؟'

'بتایا تو ہے تمہیں!'

'کب؟'

'گھر جا کر سوچنا جو میں نے کہا۔ تمہیں ہر بات کا جواب مل جائے گا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تمہیں اب گھر واپس جانا چاہیے۔ کوئی منتظر ہو گا تمہارا۔ جب تم دروازہ بند کرو گے تو خود بخود لاک ہو جائے گا۔ گیٹ کھلا رکھنا۔ ورنہ گاڑی اندر لانے کے لئے افضال کو نیچے اترنا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے خواہ مخواہ زحمت ہو۔ خدا حافظ!'

'کوئی منتظر نہیں ہوتا میرا۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ صرف تم میری ساتھی ہو۔' شہباز نے وضاحت دیتے کہا۔ مگر غزالہ نے اسکی بات سنی ان سنی کر دی۔ انتہائی روکھے لہجے میں وہ صرف اتنا بولی: 'خدا حافظ!' اور اسکے بعد اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔

شہباز سے یہ بے رخی برداشت نہ ہوئی۔ وہ تیزی سے غزالہ کی جانب بڑھا۔ وہ اسے اپنی بانہوں میں جکڑ کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسکے جسم کے کسی بھی حصے کو چُھو سکتا غزالہ نے بجلی کی سرعت سے ایک لات گھما کر اسکے چہرے پر رسید کی۔ اگلی لمحے اسکی ناک سے خون کا فوارہ بہہ رہا تھا۔ 'یہ عورت تو بروس لی کا فی میل ورژن ہے!' شہباز یہ سوچ رہا تھا۔

'میں نے تمہیں چند لمحوں قبل کہا بھی تھا کہ دنیا کا کوئی مرد میرے اوپر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ آئندہ مجھ سے زور زبردستی نہیں کرنا۔ خدا حافظ!' غزالہ نے کہا اور اک شان بے نیازی سے اپنے بیڈروم میں داخل ہو گئی۔ یہ اک نئی ادا تھی جو شہباز کے دل میں گھر کر گئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے یہ راز بھی اس پر منکشف ہو چکا تھا کہ غزالہ کیوں ایسا کرتی ہے۔۔ کیوں بہت سارے مردوں کے ساتھ سوتی ہے۔ وہ ایسا کر کے مردوں کی انا اور غیرت کی تذلیل کرتی ہے۔ وہ ناموس اور تقدس کے لبادے میں لپٹے ہوئے ہر فرعون کو یہ جتاتی ہے کہ دیکھو اپنا اصلی چہرہ۔ تم سے بڑا بے غیرت کوئی نہیں!

باب10

این جی اوز کا ایجنڈہ فحاشی!

'جناب سپیکر میں نے اس ایوان میں بیٹھے ہر رکن کو پہلے بھی یہ یاد دلایا تھا اور اب دوبارہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مت بھولیے اس معاشرے کی بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے۔ اس کا مطلب لا الہ الا اللہ کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہاں عجیب عجیب حرکتیں ہو رہی ہیں۔ مسلم معاشرے میں فحاشی، بے حیائی اور عریانی پھیلائی جا رہی ہے۔ اور یہ کام سرکاری سرپرستی میں بذریعہ این جی اوز ہو رہا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد تبدیل کی جا رہی ہے۔ جانتے ہیں ایسا کرنے سے کیا ہو گا؟ پوری کی پوری عمارت دھڑام سے گر پڑے گی!'

مولانا ابدالی پارلیمنٹ میں جوش و خروش سے تقریر کر رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہوا میں گھماتا۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی درست کرتا اور دوسرے سے قراقلی ٹوپی۔ تقریر کے دوران وہ کبھی دائیں مڑتا اور کھڑے کھڑے بیٹھے ہوئے اراکین پر ایک نظر ڈالتا جیسے ان سے داد و تحسین کا طلب گار ہو۔ پھر وہ بائیں طرف دیکھتا جیسے دوسروں ممبران سے پوچھ رہا ہو کہ کہیں وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا۔ ایوان میں بیٹھی خواتین کو دیکھتے ہی وہ اپنے چہرے پر حقارت اور فتح کے آثار واضح کرنا نہ بھولتا۔ اسکے کرتے کی آستینیں جب ہاتھوں کو بار بار نچانے سے نیچے اتر آتیں تو وہ انہیں ایسے چڑھتا جیسے اس کے سامنے دشمن ہو وہ اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ بولتے بولتے وہ تھوک کی بارش بھی کرتا کیونکہ جوش خطابت اسکے منہ میں جھاگ پیدا کر رہا تھا۔

'یہ دیکھیے کیا چھپ رہا آج کل پریس میں۔ ایک بڑھیا خاتون پروفیسر یہ آزادی چاہتی ہے کہ وہ بے ہودہ ساڑھی پہن کر اس ملک کے بچوں کو پڑھائے۔ جب ایک مومن بچے نے اس کی قابل اعتراض ساڑھی پر احتجاجاً کلاس میں جانا چھوڑ دیا تو اس عورت نے اس بچے کو "گندے ذہن" اور "گھٹیا سوچ کی پیداوار" کہا۔ اسے مجبور کیا کہ وہ بچہ اس بڑھیا کو بے حیائی والے لباس میں دیکھے۔ اسکی طرف پوری طرح متوجہ ہو۔ مگر اس مجاہد بچے نے چھت کی طرف دیکھنے کو ترجیح دی۔ یہ فتنہ پرور عورت پھر بھی باز نہ آئی اور اس نے نیا جال پھینکا یہ کہہ کر کہ یہ بچہ تو اس کے بیٹے کے برابر ہے۔ جناب سپیکر بے حیائی کی انتہا ملاحظہ ہو۔ کیا کوئی ماں اپنے بیٹے کو دعوت گناہ دے گی؟ اس مجاہد بچے کی شان دیکھیے۔ اس نے اس فاحشہ کہ منہ پر کہہ دیا کہ میری ماں

بے غیرت نہیں تیری طرح۔ پردے دار عورت ہے۔ اس پر اس غلیظ عورت نے اس مجاہد کو "مولوی کا بچہ" قرار دے دیا۔ اپنے طرف سے اس نے اس بچے کی بے عزتی کی۔ لیکن میں اس ایوان کی وساطت پوری دنیا بشمول امریکہ، برطانیہ، اسرائیل اور ہمارے ازلی دشمن بھارت کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس ملک کا ہر بچہ مولوی کا بچہ ہے جو کفار کے مذموم ارادے نیست و نابود کر دے گا۔ ہم جانتے ہیں اس قسم کی عورتوں کے پیچھے کون سے طاقت ہے۔ یہ سی آئی اے، موساد اور را کی مشترکہ سازش ہے۔ انہوں نے بہت ساری خوبصورت عورتیں ہماری تعلیمی نظام میں این جی اوز کی مدد سے لانچ کر دی ہیں۔ ان عورتوں کو یہ ٹاسک دیا گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں نوجوان نسل میں فحاشی پھیلائی جائے تاکہ دوبارہ کوئی صلاح الدین ایوبی، کوئی خالد بن ولید، کوئی طارق بن زیاد یا نور الدین زنگی پیدا نہ ہو۔ ان عورتوں کا کام اپنے جسم کی بدولت طالبعلموں کو اپنے جال میں پھانسنا ہے۔ ان عورتوں نے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو چکلے میں بدل دیا ہے۔۔۔'

'شیم شیم شیم۔ مولانا ابدالی مردہ باد، مردہ باد۔۔۔'چند خواتین ارکان ابدالی کی بات کاٹتے ڈیسک بجاتے بجاتے نعرے لگانا شروع ہو گئیں۔

'میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی جناب اسپیکر!'ابدالی نے احتجاج کیا۔

'آپ کی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔۔۔'سپیکر نے کہا۔

'بس پانچ منٹ میری بہنوں، صرف پانچ منٹ!'ابدالی نے کہا اور دوبارہ شروع ہوا۔

'افسوسناک پہلو یہ ہے کہ این جی او مافیا ایسی بے حیا عورتوں کے حق میں آواز بلند کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آفرین اس خاتون وائس چانسلر پر کہ اس نے اس عورت کو صاف صاف کہہ دیا کہ بی بی اگر پڑھانا ہے تو ساڑھی جیسا بے ہودہ لباس چھوڑو اور ستر پوشی والا لباس اختیار کرو۔ اس پر ہمارے ملک کی کئی این جی اوز اس بد چلن عورت کی حمایت میں کھڑی ہو گئی ہیں۔ اور یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ اس اسلام کے ہیرو بچے کو یونیورسٹی نے نکالا جائے اور خاتون وائس چانسلر کو برطرف کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا ہماری غیرت مر چکی۔۔۔'

'آپ بار بار اسے بد چلن اور بے حیا جیسے گھٹیا اور بازاری القابات سے نواز رہے ہیں۔ آپکو شرم آنی چاہیے۔ وہ ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بزرگوں کی اس ملک اور معاشرے کے لئے بہت قربانیاں ہیں۔ آپ اس عورت کی مسلسل کردار کشی کیے جا رہے ہیں۔ کیا یہ قذف اور بہتان تراشی نہیں؟ آپ اپنے الفاظ واپس لیجئے ورنہ ہم بطور احتجاج ایوان سے باہر چلے جائیں گے۔'ایک خاتون رکن اسمبلی سپیکر اور دیگر ممبران کو ابدالی کی گفتگو کی جانب توجہ دلاتے بولی۔

'میرا مقصد آپ بہنوں کی دل آزاری کرنا نہیں۔ میں تو ان عناصر کا ذکر کر رہا ہوں جو ہمارے معاشرے میں فحاشی پھیلا رہے ہیں۔ جو ہمیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا ایجنڈہ کفر کی ترویج ہے یعنی سیکولر ازم۔ جن کا مشن فحاشی ہے یعنی لبرل ازم۔ جن کا مقصد بے حیائی ہے یعنی روشن خیالی۔ ان تین چیزوں کے ذریعے یہ ہم سے ہماری شناخت چھیننا چاہتے ہیں تا کہ ہمیں اپنے رنگ میں رنگ سکیں۔ اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ جناب سپیکر حکومت کو ان این جی اوز پر نظر رکھنی چاہیے۔ انہیں ہمارے معاشرے کی جڑیں کھوکھلا کرنے کے لیے باقاعدہ تربیت دے کر میدان میں اتارا گیا ہے۔ میرا مطالبہ یہ ہے کہ این جی اوز پر پابندی لگائی جائے۔ یہ کافر ممالک کے ایماء پر کام کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم خود ان کے خلاف جہاد کرینگے۔ اور کسی کا باپ ہمیں روک نہیں سکے گا۔ میرا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت اس بد چلن ساڑھی والی نام نہاد پروفیسر کے بارے میں چھان بین کرے۔ یہ ہم میں سے نہیں۔ اور یونیورسٹی کی وائس چانسلر سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اس اسلام دشمن استانی کو فی الفور ملازمت سے برطرف کرے۔' مولانا ابدالی اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھ گیا۔ عورتیں 'شیم شیم' کے نعرے بلند کر رہیں تھی۔

ملک کے سب سے بڑے مدرسے کی تقریب اسناد میں مولانا ابدالی طالبعلموں سے خطاب کر رہا تھا۔ وہ انہیں ان خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو عصر حاضر میں اسلام کو درپیش تھے اور جن سے نمٹنے کے لئے ایک نئی، مربوط اور جامع حکمت عملی درکار تھی۔

'جہاد کون کرتا ہے؟ ہم مرد کرتے ہیں۔ ہم مرد کیوں کہلاتے ہیں؟ اپنی مردانگی کی وجہ سے۔ مردانگی یہ نہیں کہ انسان طبی لحاظ سے مرد ہو۔ بلکہ بہادری، شجاعت، غیرت اور ناموس کا نام مردانگی ہے۔ لیکن یہ بہادری، یہ شجاعت، یہ غیرت اور یہ ناموس دین کی خاطر ہو تب جا کر یہ مردانگی کہلائے گی۔ اس مردانگی کا مظاہرہ کوئی عورت بھی کر سکتی ہے۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ ہماری ماؤں اور بہنوں نے بھی جہاد کیا اور کفار کے دانت کھٹے کئے۔ اب اگر آپ غور فرمائیں تو باآسانی اسلام دشمن طاقتوں کی چال سمجھ سکتے ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ ڈر کس چیز کا ہے؟ جہاد انکی نیندیں حرام کر دیتا ہے۔ فدائین کے حملے ان کا خون خشک کر دیتے ہیں۔

یہ فدائین کہاں سے آتے ہیں؟ ظاہر ہے آسمان سے تو ٹپکتے نہیں۔ عظیم مائیں۔ پاک مائیں۔ باحیا مائیں۔ غیرت والی مائیں۔ پردے والی مائیں۔ صلاح الدین ایوبی کی ماں جیسی مائیں۔

محمد بن قاسم کی ماں جیسی مائیں اورنگزیب عالمگیر کی ماں جیسی مائیں، ملا عمر اور اسامہ بن لادن کی ماں جیسی مائیں جنم دیتی ہیں اسلام کے ایسے عظیم مجاہدین کو۔ ایسی اولاد جنم دینے کے لئے حیا پہلی شرط ہے۔ مغرب کا مذموم ارادہ یہ ہے کہ ہم سے ہمارا سب سے بڑا ہتھیار۔۔۔یعنی حیا چھین لے۔ مگر چال چل کر۔ ایسی چال جو ہم سمجھ نہ سکھیں۔ اور سمجھ تب آئے جب مات ہو چکی ہو۔ یہ چال میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ ہے این جی اوز کے ذریعے فحاشی پھیلا کر ہمیں حیا سے محروم کرنا۔ نہ ہوگی حیا نہ پیدا ہونگے مجاہدین۔ این جی اوز عورتوں کے حقوق کی آڑ میں اس معاشرے میں فحاشی، عریانی اور بدحیائی کو فروغ دے رہی ہیں۔ مخلوط ماحول کے حق میں سیمینارز کراتی ہیں۔ ٹاک شوز میں اس کا پرچار کرتی ہیں۔ مغرب کی خوشنودی کے لئے بے حیائی، فحاشی اور دین سے بیزاری جیسے موضوعات پر اب کھل کر ڈرامے اور فلمیں بنائی جارہی ہیں۔ مرد و زن کا یہ بے شرم ملاپ اس معاشرے میں مجاہدین نہیں حرامی بچے پیدا کرے گا۔ یہ حرامی بچے مغرب کی اولادیں ہونگی اور یہ اپنے ناجائز باپ کا ایجنڈہ آگے بڑھائیں گی۔'مولانا ابدالی کی بھاری گونج دار آواز سننے والوں کے دل گرما رہی تھی۔ اور وہ وقتاً فوقتاً نعرہ تکبیر بلند کرتے جارہے تھے۔

'آپ نے اس بدکردار استانی کی مکمل کہانی تو اخبارات میں پڑھ ہی لی ہوگی جو اپنا جسم دکھا کر ایک ننھے مجاہد کو بے حیائی کے کاموں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔بالکل زلیخا کی طرح۔ اور ہمارے اس یوسف ثانی مجاہد نے اس فتنہ صفت عورت کے شیطانی بہکاوے میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ حضرات یہ بچہ کسی مدرسے کی پیداوار نہیں۔ بلکہ ایک ماڈرن گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ لیکن اس کی ماں نے اسکی تربیت اسلام کے اصولوں پر کی۔ وہ فاحشہ اسے دعوت گناہ دیتی رہی کہ میرے بلاوز کی طرف دیکھو۔ تم اداکاری کے طالب علم ہوں۔ میرے ناز نخرے ادائیں اور بھاؤ ذرا غور سے دیکھو تاکہ تم اکشے کمار بن سکو۔ گوندہ بن سکو۔ اس عظیم بچے نے انکار کر دیا۔ نظریں چھت کی طرف اٹھا دیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس بچے کو اعلی ترین اعزاز سے نوازا جاتا۔ مگر اس غلیظ عورت نے اسکی شکایت لگائی۔ اب اس گندی نسل کی عورت کو این جی اوز ایک ہیروئین بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ اسکی کہانی پر اب ایک ڈرامہ بنایا جارہا ہے۔ ہمارے لوگ یہ ڈرامہ دیکھیں گے۔ ظاہر ہے اس کا اثر قبول کرینگے۔ کوئی بدکردار عورت اس استانی کا رول ادا کرے گی۔ ظاہر ہے اپنا جسم بھی دکھائے گی۔ اس طرح ہمارے بچے اور بچیوں کو یہ این جی اوز والے اپنی جانب راغب کرینگے۔

اس فاحشہ سے ہمدردی جتانے کے لئے این جی اوز کی کچھ حرافائیں پرائیویٹ سکولوں میں نیم برہنہ ساڑھیاں پہن کر چلی گئیں اور وہاں بچوں کو پڑھانے لگیں۔ یہ کلپ انہوں نے

سوشل میڈیا پر ڈالے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ دیکھو ننگا ہو کر بچوں کے سامنے کلاس لینا عام سی بات ہے۔ فحاشی ایک اچھی اور مثبت سوچ کے طور پر متعارف کرائی جائے رہی ہے بھائیوں۔ نجی ٹی وی چینلز پر کیا کیا گفتگو ہو رہی ہے ذرا یہ کلپ ملاحظہ ہو۔'

مولانا رکا۔ اشارہ کیا۔ بڑی سکرین پر کلپ چلنا شروع ہوا۔ ساروی سرمست چلا چلا کر ٹی وی اینکر کو کہہ رہی تھی کی زینت اگر مکمل ننگی ہو کر بھی کلاس لے تو یہ اسکا پیدائشی حق ہے۔ کس مولوی نے اسے یہ حق دیا ہے کہ وہ اسکے لباس پر اعتراض کرے؟ یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر اس ملک کو جہادیوں اور فسادیوں کا معاشرہ بنانا چاہتی ہے۔ مولانا ابدالی کو شرم آنی چاہیے۔ وہ مولانا نہیں ایک شیطان ہے۔ ہم عورتوں کو ایسے شیطانوں کی ابلیسیت سے آگاہ کرتے رہیں گے۔۔۔'

'گشتی ساروی سرمست۔۔۔ مردہ باد مردہ باد'

پنڈال نعروں سے گونج رہا تھا۔ اور شہباز ابدالی کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے گالم گلوچ سے اتفاق نہ تھا۔ اسکی رائے میں ابدالی کی کچھ باتوں سے اتفاق کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر ساروی بدزبانی اور بدکلامی کا مظاہرہ ٹی وی پر لائیو کرے گی تو مخالفین ایسی ہی زبان استعمال کرینگے۔

'یہ این جی اوز کا ٹولہ کیا کیا خرافات عورتوں کے حقوق پر متعارف کرا رہا ہے۔ کہ جی عورت اور مرد کی مخلوط میراتھن ریس کی اجازت دی جائے۔ انہیں چڈی پہن کر فٹبال اور ہاکی کھیلنے کی آزادی فراہم کی جائے۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی چھت کے نیچے بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں تاکہ گیارہ بارہ برس کی بچیوں کے پیر بھاری ہو جائیں۔ میرے بھائیوں اور بزرگوں اس قسم کی بے حیائی مغرب میں عام ہے۔ یہ ان کا کلچر ہے جس پر انہیں فخر ہے۔ اب مغرب چاہتا ہے کہ ایسا ہی کلچر مسلم معاشرے میں لانچ کیا جائے۔ این جی او مافیا مغرب کی نائکہ بن کر یہ زہر ہماری نئی نسل کی رگوں میں اتار رہی ہے۔۔۔ عورتوں کے حقوق کے نام پر۔ لبرل ازم کے نام پر۔ روشن خیالی کے نام پر۔ جینڈر کے نام پر۔ معصوم بچیوں کے ذہن اس زہر کے نشے میں آ کر بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں یہ خبریں چھپ رہی ہیں کہ فلاں فلاں کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ این جی اوز کی بدولت جناب۔ ان لوگوں کو سورۃ فاتحہ تک تو آتی نہیں اور یہ شرعی مسائل پر فتوے دیتے ہیں۔ یہ ہمیں بتا رہے ہیں کہ ولی کے بغیر عورت نکاح کر سکتی ہے۔ ہمیں۔۔۔ جنہوں نے ساری عمر اسلام سیکھنے میں صرف کر دی۔ کیا اب ہم دین ان سے سیکھیں گے؟ یہ رنڈیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اسلام میں عورت کے لئے سرے سے پردے کا حکم ہی نہیں؟ یہ فاحشائیں ہمیں بتا رہی ہیں کہ توہین رسالت کی سزا موت

نہیں! یہ کیا ہو رہا ہے میرے دوستوں؟ کیا ہم ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں اور انکی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی پر خاموشی اختیار کر لیں؟ نہیں دوستوں۔ ایسا ممکن نہیں۔ این جی اوز ایک دجالی فتنہ ہے۔ ہمیں اسے جڑ سے اکھاڑنا ہو گا۔ ہاتھ اٹھائے جو جو میرے ساتھ ہے!'

ابدالی یہ کہہ کر سننے والوں کی طرف دیکھنے لگا۔ شہباز کے سوا سب ہی ہاتھ کھڑا کر چکے تھے۔ وہ دہشت گردی پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس قسم کے پروگرامز میں شرکت کرنا اسکی پیشہ ورانہ مجبوری تھی۔ ابدالی سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ اس قسم کے پروگرامز میں داخلہ عام نہ تھا۔ حساس معاملات پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں۔ لہذا چیدہ چیدہ لوگ ہی بذریعہ دعوت نامہ بلائے جاتے تھے۔ ویک اینڈ تھا۔ شہباز مدعو بھی تھا۔ لہذا اس نے سوچا کیوں نہ اس تقریب میں شرکت کی جائے۔ تقریر سن کی خطرے کی گھنٹیاں اس کے دماغ میں بجنا شروع ہو چکی تھیں۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بہت فساد ہونے جا رہا ہے۔ 'کاش میرے اندیشے کبھی درست نہ ہوں!' وہ یہ دعا بھی مانگ رہا تھا۔

باب 11

شاہ کی نئی حرامزدگی!

خالص ترقی میں شہباز کی دوستی ایک ایسے ریسرچ سکالر سے ہو گئی جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ وہ عمر میں شہباز کے والد سے چند برس ہی چھوٹا ہو گا۔ ویسے بھی اس کے دوستوں میں زیادہ تر لوگ بڑی عمر کے ہی تھے۔ ایسے لوگوں کی دوستی ہمیشہ فائدہ مند رہتی ہے۔ سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ شہباز کے ایک دوست تو اسکے نانا کے ہم عمر تھے۔

یہ نیا دوست ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھا۔ سب اسے "ڈاکٹر صاحب" کہتے۔ انتہائی نفیس انسان۔ غریبوں کی مدد کرنے والا۔ دبنگ۔ بلاخوف دوسروں کے لئے آواز اٹھانے والا۔ وہ اس نئے دوست کے ساتھ ہی ڈھابے پر دودھ پتی پیتا۔ جس دن ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ ہوتے وہ شاہ کے گروپ سے ذرا پرے بیٹھتا۔ یہ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ شاہ ان دونوں کی گفتگو اور یہ دونوں اسکے ٹولے کی باتیں اس فاصلے سے باآسانی سن سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب بہت مصروف انسان تھے۔ ہر روز ڈھابے پر آنے سے قاصر تھے۔ لیکن جب بھی آتے، شہباز، حیدر اور بدر بھی ان کے ساتھ مل جاتے۔ شاہ کو اس بات سے بہت جلن ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب شہباز کے مضامین شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ انکی تنقید اسے اپنا کام نکھارنے میں بہت مدد فراہم کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ ڈھابے پر شاہ اینڈ کمپنی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بدر اور حیدر بھی موجود تھے۔ شاہ اپنی حرامزدگیوں کا مظاہرہ بہت ڈھٹائی سے کر رہا تھا۔ آج اسکا نشانہ ایک نئی لڑکی بلقیس تھی، شاہ کی نئی ماتحت۔ غریب گھرانے کی تھی۔ اس کا باپ بس ڈرائیور تھا۔ بیٹی کو کسی طرح تعلیم دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ لڑکی تھی بہت حسین۔ گندمی رنگ کی۔ لمبی، سلم سڈول اور بہت دلیر۔ دوپٹہ نام کی چیز نہیں لیتی تھی سینے پر۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھار بھاری اور بے انتہا تنا ہوا تھا۔ جس شے پر انسان کو فخر ہو وہ اسکی تشہیر بڑھ چڑھ کر کرتا ہے۔

اس حسینہ کا سن غالباً بیس اکیس کا ہو گا۔ شاہ کا دل تھا اس پر لیکن اسنے کوئی بھاؤ نہ دیا۔ اس بات کا بڑا غصہ تھا اسے۔ جو لڑکی شاہ کے جال میں آنے سے انکار کر دے، اسے وہ زیادہ تضحیک

کا نشانہ بناتا۔ شاہ نے اچانک اس لڑکی کے بارے میں وہی بازاری گفتگو کرنا شروع کر دی جو وہ ذکیہ کے بارے میں کر چکا تھا۔

'اگر اس کا باپ بس کے بجائے اسے چلاتا تو زیادہ پیسہ کماتا۔ بھئی بس کا کرایہ کم ہوتا ہے اور ٹیکسی کا کہیں زیادہ!' شاہ نے جیسے ہی کہا اور اس کے ماتحت واہ واہ کرنے لگ گئے۔ شہباز کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے کو رپورٹ کرے گا۔ بدر اور حیدر کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات واضح تھے۔ اس اگوہر میں ڈاکٹر صاحب ڈھابے کی طرف قدم بڑھاتے نظر آئے۔ جیسے ہی وہ قریب آئے، شہباز نے حسب معمول و روایت انہیں سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کچھ باتیں ہوئی اور اسطرح یہ روز کا وقفہ تمام ہوا۔ جب شہباز اپنے کیبن میں پہنچا تو شاہ اس کے پاس آیا۔ ایک ہمدرد کے انداز میں شروع ہوا۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا کہ آس پاس کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں شروع ہوا جیسے کوئی بہت بڑا راز افشاء کرنے جا رہا ہو۔

'آپکو معلوم نہیں یہ شخص کون ہے۔ یہ کافر ہے۔ کافر کو سلام کرنے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ آپکو فوراً توبہ کرنی چاہیے اور دوبارہ مشرف بہ اسلام ہونا چاہیے۔ آپ چاہیں تو میں آپکو اپنے پیر صاحب کے پاس لے جا سکتا ہوں۔ انکے ہاتھ پر تجدید اسلام کر لیجئے۔ خوشی سے جو بھی نذرانہ آپ دینگے میرے مرشد قبول کر لینگے۔ پچاس ہزار تو عام لوگ نذر کر دیتے ہیں۔'

شہباز کا تو دماغ گھوم گیا مگر اس نے تحمل سے شاہ کی طبعیت صاف کی یہ کہتے:

'ابے جعلی شاہ سلام اللہ کی رحمت ہے۔ اور اللہ کی رحمتیں تو ہر جاندار کے لیے ہیں۔ سورج اپنی روشنی سے مسلم و غیر مسلم سب ہی کو فائدہ دیتا ہے۔ بارش مسلمان اور دھریے دونوں کے کھیتوں کو برابر سیراب کرتی ہے۔ اور تو جو بکواس کچھ دیر پہلے بلقیس کے بارے میں کر رہا تھا، وہ اسلام میں قذف ہے جس کی سزا کوڑے ہیں۔'

شاہ یہ باتیں سن کر آگ بگولا ہو گیا کیونکہ شہباز اسکی زندگی میں پہلا شخص تھا جو اسے چیلنج کر چکا تھا۔

'آپکو اندازہ نہیں میری طاقت کا۔ آپ لکھ لیں کہ اب اس ادارے میں مزید کام نہیں کر پائیں گے!' شاہ نے اسے دھمکی دی۔ شہباز نے اسے 'شٹ اپ' کہہ دیا۔ شاہ اس کے کیبن سے باہر نکل گیا۔ شہباز نے غصے کو پانی سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہو گیا اور کام کرنے لگا۔ ادھر شاہ اپنے دماغ میں ایک شیطانی منصوبہ تشکیل دے رہا تھا۔ وہ گوہر کو ایک ای میل لکھ رہا تھا:

'آج ہم سب کے سامنے ڈھابے پر شہباز نے خالص ترقی کو ایک چکلہ کہا جہاں بہت سارے بھڑوے کام کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس چکلے کی نائکہ گوہر ہے۔ اس بات کے گواہ فرقان اور فرید ہیں۔ شہباز کو لکھنا بالکل نہیں آتا۔ وہ کسی اور سے پیسے دے کر لکھواتا ہے اور خبریں چھپواتا ہے۔ وہ نالائق اور نااہل ہونے کے علاوہ انتہائی فحش گو ہے۔ ایسے ادارے کو گالی دیتا ہے جو بے بس لوگوں کے حق میں آواز اٹھاتا ہے۔ جو ملک کی بہتری اور استحکام کے لیے دن رات کوشاں رہتا ہے۔ شہباز کی بازاری اور گھٹیا گفتگو سے ہم سب کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ اس کا یہ عمل قابل مذمت ہے۔ ایسے لوگ کسی بھی معزز ادارے میں کام کرنے کے اہل نہیں۔ شہباز کے خلاف انکوائری کی جائے اور اسے نوکری سے نکالا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ادارے کی شدید بدنامی ہو گی۔ کوئی بھی خاتون اپنے آپ کو ادارے میں محفوظ نہ سمجھے گی۔'

شاہ نے ای میل ریٹا کو بھی کاپی کر دی۔ اس کے بعد اسنے فرید اور فرقان کو اپنے پاس طلب کیا۔ ای میل دکھائی۔ اور وہ بیان رٹا دیا جو ان دونوں نے انکوائری کمیٹی کے سامنے دینا تھا۔ اسم ضمن میں طے یہ پایا کہ وہ شام کو دفتر سے باہر ملیں گے اور ایک ایک ڈائلاگ طوطے کی طرح رٹ لینگے تا کہ جرح کے دوران ان دونوں کی باتوں میں تضاد نہ ہو۔ شاہ نے انہیں تنخواہ میں اضافے کی یقین دہانی بھی کرا دی۔ دونوں خوشی خوشی شاہ کی نئ حرامزگی میں مہرہ بننے کو راضی ہو گئے۔

گوہر نے شاہ کی شہباز کے خلاف ای میل دو دن بعد پڑھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ای میل کام والے ہفتے کے آخری دن لکھی گئی۔ وہ ایک سے دوسری میٹنگ میں مصروف تھی۔ ای میل اسی دن نہ دیکھ سکی۔ نئے ہفتے کے کام کا پہلا دن تھا۔ یہ ای میل اس کے ان باکس میں تب ظاہر ہوئی جب اس نے لاگ ان کیا۔ ای میل دیکھتے ہی اس نے شاہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔

'تم آگ سے کھیل رہے ہو سٹیوپڈ۔ تمہیں علم نہیں۔۔۔ اور ہو گا بھی کیسے کیونکہ میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میرا خیال ہے ریٹا کو بھی یہاں ہونا چاہیے۔۔۔' گوہر نے یہ کہہ کر ریٹا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جب وہ آگئی تو اپنی بات دوبارہ شروع کی:

'تم نے شاہ کی ای میل تو پڑھ ہی لی ہو گی۔۔۔'

'جی میں پڑھ چکی ہوں!' ریٹا نے کہا۔

'میں شاہ کو یہ بتا رہی تھی کہ آگ سے کھیلنے کی حماقت نہ کرے۔ اسے علم نہیں کہ بدر اس کی شکایت پہلے ہی کر چکا ہے۔ تم اسے یہ قصہ اپنی زبان سے سنا دو تا کہ اس احمق کو یقین آ جائے۔' گوہر نے ریٹا کی جانب دیکھتے کہا۔ ریٹا نے شاہ کو تفصیل سے اس میٹنگ کے بارے آگاہ کیا جس میں بدر، گوہر اور وہ موجود تھی۔ جس میں بدر نے شاہ کی ذکیہ کے بارے میں گھٹیا اور بازاری گفتگو کی شکایت کی تھی۔ شاہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس بات کا یقین کرنا پڑھا۔

'تو پھر کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اس معاملے میں ایکشن لینے کا ارادہ نہیں رکھتیں؟' شاہ نے دونوں عورتوں کی جانب الو کی طرح آنکھیں گھماتے کہا جو اسکا مخصوص سٹائل تھا۔

'یہ اتنا آسان نہیں۔ اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ تمہارے گواہ اپنے بیانات سے ہر گز نہیں پھریں گے اور دونوں کی سٹیٹمنٹ ہو بہو ہو ایک ہو گی تو شہباز کا پتہ با آسانی صاف کیا جاسکتا ہے۔' ریٹا نے گوہر اور شاہ دونوں کی جانب ایک معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'کچی گولیاں کبھی نہیں کھیلتا میں۔ ویک اینڈ پر دونوں کو گھر بلا کر ایک سکرپٹ رٹا دیا ہے۔ بڑے سے بڑا تیس مار خان وکیل بھی جرح کر لے۔ جتنا مرضی گھما پھرا کر سوال کر لے۔ یہ دونوں ایک ہی بیان پر ڈٹے رہیں گے۔ مجال ہے ٹس سے مس ہو جائیں۔ بس ایک کام کرنا ہو گا۔ آپ کو ان دونوں کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ کرنا ہو گا۔ ویسے بھی مہنگائی بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اب تو میری تنخواہ بھی مہینے کے تیسرے ہفتے کے اندر اندر ختم ہو جاتی ہے۔' شاہ نے شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے کہا۔

'اگر تم اپنی حرکتیں درست کر لو تو یہ ہی تنخواہ سال بھر ختم نہ ہو۔' گوہر نے ترش روئی سے جواب دیا۔ یہ انداز شاہ کو کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اس نے فوراً پینترا بدلتے کہا: 'میں اپنے لئے کچھ نہیں مانگ رہا۔ بس ان دونوں کی تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ چاہیے مجھے!'

'ہو جائیگا۔ تسلی رکھو!' گوہر نے یقین دہانی کراتے کہا۔

'ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔' شاہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ گوہر اور ریٹا وہیں موجود رہیں۔

'شہباز کو بلائیں؟' اس نے ریٹا کی طرف دیکھتے پوچھا۔

'بلا لو۔۔۔'

'کین یو سی می؟' گوہر نے شہباز سے انٹر کام پر رابطہ کرتے کہا۔

'کمنگ۔۔۔' اس نے کہا اور اگلے لمحے وہ اسکے کمرے میں تھا۔

'ریڈ اٹ۔۔۔' گوہر نے ایک کاغذ اسکی طرف بڑھاتے کہا۔

اس نے پڑھنا شروع کیا۔ گوہر اور ریٹا اس دوران اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتے رہے۔ غصہ اس کے ماتھے پر پھیلتا صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا شاہ کی ای میل کا پرنٹ آوٹ تھا۔

'بالکل جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ گھٹیا شخص۔۔۔' شہباز پڑھتا جا رہا تھا اور یہ الفاظ دھرا رہا تھا۔

'سچ تو یہ ہے کہ اسکے خلاف ایک با قاعدہ شکایت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ شخص ڈھابے پر بیٹھ کر ادارے کی خواتین کے بارے میں انتہائی غلیظ اور بازاری گفتگو کرتا ہے۔ اور اس بات کے چار گواہ ہیں۔ فرقان، فرید، حیدر اور بدر۔ اسکے علاوہ یہ بلقیس کو سیکسچولی ہراس بھی کر رہا ہے۔ آپ اسکا اصلی چہرہ نہیں جانتیں۔ یہ انسان نہیں گندی نالی کا کیڑا ہے۔۔۔'

'ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔ اب آپ مرتکب ہو رہے ہیں ایک جرم کے۔ اس کی غیر موجودگی میں آپ ناشائستہ زبان استعمال کر رہے ہیں۔ کسی بھی دفتر میں ایسی زبان استعمال نہیں کی جاتی۔۔۔' ریٹا نے شہباز کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

'اور جو زبان یہ استعمال کرتا ہے۔۔۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟' شہباز نے پوچھا۔

'پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ یہ زبان استعمال کرتا ہے۔ وہ کردار کشی کرتا ہے۔ وہ فقرے بازی کرتا ہے۔ وہ جنسی طور پر کسی کو بھی خوفزدہ کرتا ہے۔ چلو فرض کر لیتے ہیں وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا وہ دفتر کے اندر کرتا ہے؟ وہ تو ڈھابے پر کر رہا ہے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے!' اس بار گوہر بولی۔

'واہ کیا دہرا معیار ہے آپ کا۔ اندر کچھ باہر کچھ۔ یہ تو کھلی منافقت ہوئی۔ ایک ہی حرکت باہر ثواب اور اندر گناہ! واہ بھئی واہ! میں شاہ کے خلاف رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ادارہ اسکے خلاف انکوائری کرے گا؟ میرے خلاف تو آپ لازمی کرینگے۔ کرینگے نا؟' شہباز کا طنز دونوں کو ہرگز اچھا نہ لگا۔

'بالکل کرینگے۔ تم ریٹا کو ای میل کر سکتے ہو۔ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ جو سب کو سنے گی اور فیصلہ صادر کرے گی جو حتمی ہو گا۔ اب تم جا سکتے ہو!' گوہر نے غصے سے کہا اور شہباز بھی پیر پٹختا باہر نکل آیا۔ اس نے رسمی طور پر تھینک یو تک نہ کہا۔ سامنے شاہ کھڑا تھا جس کے چہرے پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

'بدر اور حیدر کو اگلے ہفتے ہونے والی پیرس کانفرنس میں بھیج دو۔ صرف یہ دونوں ہی شہباز کے حق اور شاہ کے خلاف بیان دے سکتے ہیں۔ انکے جاتے ہی اس شکایت کو سن کر ایک

دو دن میں بھگتا دو اور نکال باہر کرو اس شہباز کو۔ کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکال رہا ہے۔' ریٹا گوہر کو نئی پٹی پڑھا رہی تھی اور وہ ہوں ہوں کر رہی تھی۔

' کمیٹی میں کس کس کو رکھ رہی ہو؟' گوہر نے ریٹا سے پوچھا۔

'ہم دونوں کے علاوہ دو مردوں کو۔ دو مرد ہوں تو اچھا ہے ورنہ یہ کمبخت شور ڈالے گا کہ جینڈر کی بات تو بہت کرتے ہے اور کمیٹی میں سب کی سب عورتیں۔۔۔' ریٹا نے کہا۔

'ونڈرفل!' گوہر نے کہا اور اس کے بعد اپنی سیکریڑی کو حکم دیا کہ بدر اور حیدر کی پیرس کانفرنس میں شرکت کے لئے تمام چیزوں کا بندوبست کرلے۔

جس دن حیدر اور بدر پیرس کے لئے روانہ ہوئے، اسی دن سیکسچول ہراسمنٹ کمیٹی حرکت میں آئی۔ چاروں ممبران نے ہر فریق کو باری باری سنا۔ فرید اور فرقان نے شاہ کا تیار شدہ سکرپٹ بڑی مہارت سے رٹا۔ شہباز یہ ہی کہتا رہا کہ حیدر اور بدر کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ اس کے حق میں وہ ضرور گواہی دینگے۔ مگر کمیٹی کی منطق یہ تھی کہ وہ ملک سے باہر ہیں۔ دوسرے اگر وہ ہوتے بھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا کیونکہ فرید اور فرقان کی گواہی کے علاوہ بلقیس بھی یہ بیان دے چکی تھی کہ شاہ سے اسے کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ وہ تو اسے چھوٹی بہن کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ شہباز اپنا منہ بند رکھے گوہر اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر پیش کی۔ اسے سمجھایا کہ وہ خود مستعفی ہو جائے۔ ادارہ اسے بہترین ریکومینڈیشن لیٹر دے گا۔ جب وہ کسی نئی نوکری کے لئے اپلائی کرے گا اور جب نیا ادارہ خالص ترقی سے اسکے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا تو اسے شہباز کے حوالے سے بہت اچھا جواب دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اسے فوراً مستعفی ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ جاب تلاش کرتا رہے۔ جیسے ہی اسے کوئی مناسب جاب ملے وہ ادارہ چھوڑ دے۔ کمیٹی کی کاروائی کو دفتر کے ریکارڈ کا حصہ نہیں بنایا جائے گا۔ باالفاظ دیگر ایسی کوئی انکوائری سرے سے ہوئی ہی نہیں!

شہباز کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اسے یہ پیشکش نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتی۔ جب وہ گوہر کا فیصلہ سن کر اسکے کمرے سے باہر نکلا تو سامنے شاہ کھڑا ہوتا ہے۔۔۔ ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ۔ اسکے دائیں بائیں فرقان اور فرید بھی تھے۔

'میں نے کہا تھا نہ بچُو کہ مجھ سے بگاڑ کر یہاں کام نہیں کر سکو گے۔' جب شاہ نے اس سے یہ کہا تو پہلے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اسے ایک تھپڑ رسید کرے۔ لیکن اچانک اس کے ذہن میں غزالہ کی کہانی آئی۔۔۔ جب اس نے ساروی سرمست کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ یہ

سوچتے ہی شہباز نے شاہ کے منہ پر تھوک دیا۔ عین اسوقت ڈاکٹر صاحب وہاں سے گذر رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر جہاں تھے وہیں رک گئے۔

'تو اس قابل تو نہیں کہ تیرے منہ پر تھوکا جائے۔ لیکن کیا یاد رکھے گا۔ میں نے تجھ پر تھوک کر تجھے عزت بخشی۔ یہ کسی عام انسان کا تھوک نہیں ایک سید زادے کا ہے!' شاہ ایک نظر شہباز پر ڈالتا اور دوسری ڈاکٹر صاحب پر۔

'جا حرام کی نسل یہ شکایت بھی لگا کہ میں نے تجھ پر تھوک دیا۔ تیرے یہ دو چمچے اس بات کی گواہی تو دینگے ہی پر ڈاکٹر صاحب جیسا عظیم انسان بھی دے گا۔ ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہرگز نہ کیجئے گا۔ ضرور گواہی دیجئے گا کہ شہباز نے شاہ کے منہ پر تھوکا اور ڈنکے کی چوٹ پر تھوکا۔'

کسی کی ہمت تک نہ ہوئی کچھ کہہ سکے۔ صرف ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اور شاہ کے ہاتھ میں اپنا رومال پکڑا دیا۔ اور شہباز کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگے: 'آ یار ایک دودھ پتی ہو جائے!'

وعدے کے مطابق فرید اور فرقان کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا۔ بلقیس کو گوہر نے اپنا پرسنل سیکریڑی رکھ لیا۔ اسکی تنخواہ دوگنی کر دی۔ اس پر شاہ بہت سیخ پا ہوا۔ پر گوہر نے اسے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ جب جب اسے گرمی چڑھے گی وہ بلقیس کو کہہ دے گی کہ شاہ کو ٹھنڈا کر دے۔ پھر بھی شاہ کو یہ حرکت اچھی نہ لگی۔ اسے تو چوبیس گھنٹے کی تفریح درکار تھی۔ لیکن اس نے شکر کیا کہ نوکری بچ گئی۔ اگر بدر اور حیدر اس کے خلاف گواہی دے دیتے تو نوکری کے علاوہ تمام مراعات سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے اور مستقبل میں کہیں اور ملازمت بھی نہ ملتی۔

بدر اور حیدر کو گوہر کی اس حرکت سے شدید مایوسی ہوئی۔ انکے پاس دل کو جلانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ شہباز تو پہلے ہی سے نپولین کے لیے کنسلٹنسی کر رہا تھا۔ جب بات اڑتے اڑتے نپولین تک پہنچی تو اس نے شہباز کو دوبارہ اپنے پاس بلا لیا۔

شہباز نے سٹاف کے حوالے سے نپولین کے رویے میں کافی بہتری محسوس کی۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ اب ادارہ پھل پھول رہا تھا۔ اسکی شاخیں ملک کے اہم شہروں میں بھی کھل چکی تھیں۔ سٹاف کئی گناہ بڑھ چکا تھا۔ یہ کامیابی رویے میں مثبت تبدیلی لائے بغیر ممکن نہ تھی۔ لیکن ایک چیز نوٹ کر کے وہ پھر سے شش و پنچ میں مبتلا ہوا۔ مینا کو نپولین نے جنرل مینیجر کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔ اور وہ شخص۔۔ شہسوار۔۔ جس کے نیچے وہ ادارے میں کام کیا کرتی تھی اور جو نپولین کے بعد سب سے زیادہ ذہین اور محنتی ورکر تھا، وہ بھی جنرل مینیجر کے لیول پر ہی تھا۔ اس سے اوپر کوئی اور عہدہ رہ نہ گیا تھا۔ اس سے اوپر نپولین ہی تھا۔

باب12

میرا جسم میری مرضی!

ڈونرز ساروی سرمست کی این جی او کی کارکردگی سے مطمئین نہ تھے۔ اسکی شکایات دن بہ دن بڑھتی جارہی تھیں۔ ایک تو وہ میڈیا سے بہت بدتمیزی سے پیش آتی۔ دوسرے اپنے سٹاف کو زرخرید غلام سمجھتی۔ میڈیا اب صرف اخبارات تک محدود نہ تھا۔ انٹرنیٹ کے بعد نجی ٹی وی چینلز، کیبل ٹی وی اور اب ایک نیا میڈیا وجود میں آ چکا تھا جو ان سب سے زیادہ برق رفتار، کاٹ دار اور مادر پدر آزاد تھا۔ اس کا موجد مغرب ہی تھا جس نے اسے سوشل میڈیا کا نام بخشا۔ اس میں پہلے آرکٹ آیا۔

اسکے بعد فیس بک جس نے خواص و عوام دونوں میں برابر مقبولیت پائی۔ موبائل فون انتہائی سستا ہو کر ایک بھنگی کے ہاتھ تک آن پہنچا تھا۔ اب ان کمنگ کال فری تھی۔ صرف آوٹ گوئنگ کے پیسے کٹتے تھے۔ وہ بھی دن بہ دن سستی ہوتی جارہی تھی۔ بہت ساری موبائل فون سروس کمپنیاں ملک میں مش روم کی طرح پھیل چکی تھیں۔ ہر کمپنی نے خصوصی پیکجز لانچ کر دیے تھے۔ مثلاً رات ایک بجے سے صبح چھ بجے تک آوٹ گوئنگ کال بھی مکمل فری۔ اس طرح معاشرے کی روایات یکایک بدل گئیں۔

اب ہر کوئی رات بھر جاگتا۔ صبح سکول کالج جاتے بچوں کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ صاف پتہ چلتا کہ جگ راتہ کاٹا ہے۔ فحاشی کو خوب فروغ مل رہا تھا۔ لڑکیاں اپنے یاروں کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر بات کرتیں۔ فیس بک پر جعلی اکاؤنٹ بنتے۔ لڑکے لڑکیاں بنکر لڑکیوں سے دوستیاں کرتے۔ انکی تصاویر دیکھ دیکھ کر اپنی ٹھرک پوری کرتے۔ غرضیکہ خرافات کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس نے معاشرے کو یکدم ایک گہری اور تاریک کھائی میں دھکیل دیا۔

اس کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔ حل ایک ہی تھا۔ معاشرے کو یکدم پتھر کے دور میں بھیج دیا جائے۔ ٹیکنالوجی تلف کر دی جائے۔ نا رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! والدین پریشان۔ دفتر میں باس پریشان۔ ہر کوئی دو سکرین کھولے بیٹھا ہے۔ اصلی سکرین فیس بک کی ہے۔ باس آیا تو جھٹ سے سکرین بدل دی۔ باس کو ایسا لگا کہ بندہ ایکسل یا ورڈ پر دفتر کا کام کر رہا ہے۔ جن کے پاس اپنا ذاتی کمرہ یا کیبن تھا ان کی تو وارے نیارے۔ ایک سکرین پورنوگرافی کی اور

دوسری کام کی سجائے وہ دل پشوری کرتے رہتے۔ قوت برداشت دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی۔ فیس بک پر اگر کسی کو کسی کی رائے پسند نہ آئی تو گالم گلوچ کا سلسلہ شروع۔ دوستوں کے درمیان دشمنیاں جنم لینے لگیں۔ تو نے میری فوٹو پر کوئی لائک نہیں دیا۔ اب میں بھی تجھے لائک نہیں دونگا! تونے یہ کیوں لکھ دیا میری پوسٹ پر؟ میں نے تجھے بلاک کر دیا ہے۔ ابے کر دیا تو کر دے۔ میں کونسا تیرے گھر سے کھاتا ہوں۔ تیری ماں کی۔۔۔ ابے سالے ماں تک پہنچتا ہے۔ تیری بہن کی۔۔۔بس اب یہ نیا کلچر راتوں رات نمو پا کر ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ خاندانی لوگوں نے تو فیس بک استعمال کی ہی نہیں۔ بہت سے تو ایسے بھی تھے جنہوں نے موبائل بھی نہ رکھا۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

ساروی کی این جی او صرف ان آفت کی پر کالاؤں پر چل رہی تھی جو ادارے کے کام کی کمی اپنے جسم سے پورا کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ کام کر کے دکھانا بھی لازمی تھا۔ وہ پریشان تھی۔ ساتھ ساتھ سوچ بھی رہی تھی۔ گھنی رات کا وقت تھا۔ اپنے کمپیوٹر پر وہ پورنوگرافی سے فیض یاب ہو رہی تھی۔ یہ ہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب جسم بھینس کی طرح پھولا ہوا ہو۔ رنگت بھی ہو بہو اس جیسی ہی ہو۔ اوپر سے میک اپ کا ڈرم چہرے پر گرا دیا جائے۔ پھر اس بد نما جسم کی نمائش ایک برائے نام ساڑھی پہن کر کی جائے تو دیکھنے والے مر مٹنے کے بجائے ڈر کر بھاگنا ہی پسند کرینگے۔ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوتا۔ ہر سماجی تقریب میں اسی سٹائل میں نمودار ہوتی۔ پوری کوشش کرتی کہ کوئی مرد اس کے قریب آ جائے اور اس کے حسن کی تعریف کر دے۔ جی ہاں! وہ اپنے آپ کو بے انتہا حسین سمجھتی تھی۔ اپنی نظر میں وہ کسی قلوپطرہ سے کم نہ تھی۔ اسکے ماتحت اور مطلبی دوست اسے اٹھتے بیٹھتے یہ ہی دم دیتے رہتے۔ ایک تو اسے سلم سمارٹ سڈول بیوٹی کہا کرتا تھا۔ اور وہ ایسی بکواسیات پر صدق دل سے ایمان لے آتی۔

پورنوگرافی دیکھتے دیکھتے ایک فوٹو اسکی نظر سے گذری۔ مغرب کی کوئی عورت تھی۔ الف ننگی۔ ایک مظاہرے میں۔ یہ تصویر کسی وومن ڈے کے سلسلے میں ہونے والے مظاہرے کے دوران کھینچی گئی تھی۔ اس برہنہ عورت نے ایک پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا جس پر لکھا تھا:

My Cunt My Choice!

یعنی میری شرمگاہ میری مرضی۔ ساروی کے شیطانی ذہن میں ایک نیا خیال کوندا کہ کیوں نہ وہ اس پلے کارڈ کو مستقبل میں وومن ڈے پر استعمال کرے۔ انگریزی زبان میں اگر یہ پلے کارڈ لہرایا گیا تو مولوی ٹوٹ پڑے گے اور توہین مذہب کے الزام میں سب اندر ہو

جائینگے۔ اندر کیا ہونگے، پولیس کے آنے سے پہلے ہی ہجوم مار مار کر اوپر پہنچا دے گا۔ اس پلے کارڈ کو اردو میں ڈھالا جائے۔ یہ سوچ رہا تھا اس کا ذہن مگر ہوشیاری سے کہ کیسے اس نعرے کو عورتوں کے حقوق کے ساتھ نتھی کیا جائے۔

اب ظاہر ہے کہ لفظی ترجمہ کیا تو جوتے پڑیں گے۔ کچھ دیر دماغ لڑانے کے بعد اسکے ذہن میں بہترین ترجمہ آیا: میرا جسم میری مرضی!

اپنے تیئں اس نے ان تمام اعتراضات کا جواب بھی سوچ لیا جو دائیں بازو کی سوچ رکھنے والے اس نعرے پر اٹھا سکتے تھے۔ وہ اسے نعرے کا ذکر سوائے اپنے قابل بھروسہ سٹاف کسی اور سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اصل فنکاری تو یہ تھی کہ کس طرح اس نعرے کو مقامی بیج بنا کر مقامی مٹی میں بویا جائے اور جلد یہ ایک تناور درخت بن جائے۔ کس طرح لوگوں کو اس کی سچائی اور اہمیت کا یقین دلایا جائے۔ کونسا موضوع اس کے ساتھ دم چھلے کی طرح لگایا جائے کہ معاشرے کا ہر طبقہ اس بات پر ایمان لے آئے کہ ان کے تمام مسائل اور برائیوں کا حل اسی نعرے میں پنہاں ہے۔

تین سال کی بچی سے لیکر اسی برس کی بزرگ عورت کی زبان پر یہ ہی نعرہ ہونا چاہیے۔ ان سب کو اس بات کا یقین کامل ہو کہ عورتوں کے تمام حقوق کی کنجی 'میرا جسم میری مرضی' ہے۔ ہر مرد اس نعرے کی عزت کرے۔ اسے واحد فلسفہ حیات جانے۔ اس نعرے کی روح کے تحت ہر مرد عورت کی برتری تسلیم کرے اور اپنے آپ کو عورت کے پیر کی جوتی سمجھے۔ ہر پیدا ہونے والے بچے کے دماغ میں یہ نعرہ ٹھونس دیا جائے۔ سکولوں میں قومی ترانے کے بجائے اسی نعرے کو گایا بجایا جائے۔ کسی کو بھی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ جاری نہ کیا جائے اگر وہ حلف نامے کے ذریعے 'میرا جسم میری مرضی' کا اقرار نہ کرے۔

یہ سوچتے سوچتے سارہ وی پرجوش ہو گئی۔ اپنے خیالوں میں مگن وہ خود کو اس نعرے کے خالق کے طور پر دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف اس کی جے جے کار ہو رہی تھی۔ اس نعرے پر اس کا نام نوبل امن انعام کے لیئے بھیجا جا چکا تھا۔ نوبل کمیٹی نے اتفاق رائے سے اسے نوبل امن انعام بھی دے دیا تھا۔ وہ اقوام متحدہ میں خطاب کر رہی تھی۔

اسے اپنے سامنے بیٹھا ہر شخص احمق دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ ان سب کو سمجھا رہی تھی کہ میرا جسم میری مرضی کیا ہے۔ فیمی نزم کس چڑیا کا نام ہے۔ اپنے آپ کو خوش کرنے کا یہ طریقہ کتنا آسان تھا۔ انسان کو ہر حال میں خوش ہی رہنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ انٹرنیٹ پر مزید سرچ کرنا شروع ہوئی۔ ایک اور خیال اس کے ذہن آیا ہے جو اس نعرے کو مضبوط بنیاد فراہم کر سکتا تھا۔۔۔ پدرسری نظام!

صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ سارہ کا بس چلتا تو اسی وقت ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے میں میرا جسم میری مرضی تھامے میکس کے دروازے پر بھیک مانگنے پہنچ جاتی۔

'میرا جسم میری مرضی۔۔۔واہ میڈم واہ۔ زبردست سلوگن ہے۔ بالکل نیا اور منفرد۔ ایسا نعرہ اس ملک کی تاریخ میں کبھی آیا ہی نہیں اور عورتوں کے حقوق کی ترجمانی اس سے بڑھ کر اور کون سا نعرہ کر سکے گا۔ میں تو کہتی ہوں ڈونر دم بخود رہ جائیگا جب آپ اس نعرے کے حوالے سے بریفنگ دیں گی۔' ستارہ کرسی سے اچھل اچھل کر کہہ رہی تھی۔

ستارہ بھی عمرانہ کی طرح سارہ کی این جی او میں پروگرام آفیسر تھی۔ یہ بھی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا سن تیس کا ہو گا۔ لمبی، گوری اور لمبے بال۔ بھاری بھاری چھاتیوں سے یہ پہاڑ گرا سکتی تھی۔

'بالکل صحیح کہہ رہی ہے یہ میڈم۔ واقعی اپنی نوعیت کا واحد سلوگن ہے اور جس طرح آپ نے اسے تھیم سے لنک کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ صدیوں سے یہ مرد لوگ ہمارے جسموں سے کھیلتے آرہے ہیں۔ اب انکی مرضی ختم۔ بلکہ اب ان کے جسم پر ہماری مرضی چلے گی۔' عمرانہ بولی۔ سارہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس نئے آئیڈیا پر وہ ستارہ، عمرانہ اور رانا کیساتھ گفتگو کر رہی تھی۔ اس پر اصلی کام تو رانا نے کرنا تھا۔ اس کی رائے لینا ضروری تھا لیکن وہ چپ تھا۔

'تم کچھ نہں بولے۔ کیا میرا آئیڈیا پسند نہیں آیا؟' اس نے رانا سے پوچھا۔

'بے کار آئیڈیا ہے!' رانا نے کہا اور سارہ کو غصہ آ گیا۔ پورے ادارے میں یہ رانا ہی تھا جو اسکی چاپلوسی نہیں کرتا تھا۔ الٹا بھری میٹنگ میں اس پر تنقید بھی کر دیا کرتا۔ مگر اسے برداشت کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا اسے غصہ پینا ہی پڑا۔

'پہلی بات، یہ سرے سے آپ کا آئیڈیا ہی نہیں۔ سرقہ ہے۔ دوسری، یہ نیا بھی نہیں۔ تیسری، یہاں کامیاب نہ ہو گا۔ آپ لوگ بار بار بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک اسلامی معاشرہ ہے۔ آپ لوگوں لبرل ازم کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں۔ مگر آپ کسی گنتی میں نہیں۔ کروڑوں لوگوں کے جذبات اس نعرے کی وجہ سے مجروح ہونگے۔ وہ اسکا انتہائی منفی مطلب لینگے۔ آپ نے انٹرنیٹ سے سلوگن کاپی پیسٹ کر لیا۔ ذرا اس کا بیک گراونڈ بھی پڑھ لیا ہوتا۔ یہ پچاس برس پرانا ہے۔ اسکا تعلق مغرب کی عورت کی آزادی سے ہے۔ یہ آزادی کہ اگر وہ چاہے تو بچہ پیدا کرے۔ نہ چاہے تو نہ کرے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ حاملہ ہو بھی جائے اور یہ

حمل اسکی صحت کے لئے اچھا نہ ہو، تو اسے یہ حمل گرانے کی اجازت ہو اور ایسا کرنا قانوناً جرم نہ ہو۔ آپ اس کا تعلق غلط چیزوں سے جوڑ رہی ہیں۔ آپکو اتنا بھی علم نہیں کہ اصل سلوگن ہے:

My body my choice

نہ کہ

My cunt my choice

یا

My pussy my choice

'ڈونر بے وقوف نہیں۔ آپ لوگوں کی مثال ہے الٹے بانس بریلی ہو۔ مگرمچھ کو تیرنا سکھا رہے ہیں۔۔۔ ڈونر کو وہ چیز بیچنے جا رہے ہیں جو اسکے کچن میں روز بنتی ہے۔ جسے کھا کھا کر وہ بیزار ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ آپکو گرانٹ دے گا۔' رانا نے صاف صاف کہا۔ ساروی کو اسکی باتیں پسند نہ آئیں کیونکہ اسکا پول کھل چکا تھا۔ اب وہ کھسیانی بلی کی مانند کھمبا نوچ رہی تھی۔

'وہ ہمیں کیوں گرانٹ دے گا اگر یہ آئیڈیا گھسہ پٹہ ہے؟' ساروی نے رانا سے پوچھا۔

'وہ اس لیے دے گا کہ ہم لوگ ان کا کلچر، ان کی روایات بالالفاظ دیگر ان کا ایجنڈہ متعارف کرائیں گے۔ وہ تو خوش ہو گا کہ چلو میرا جسم میری مرضی کی وجہ سے اب عورتیں کم بچے پیدا کریں گی۔ تیسری دنیا کی آبادی میں کمی واقع ہو گی۔ مسلم دنیا میں جہادی اور شدت پسند کم پیدا ہونگے۔ جب عورتیں کو اپنے جسم پر اختیار ہو گا تو وہ مردوں کی حاکمیت کو چیلنج کر سکیں گی۔

لیکن مغرب کی عورت نے مرد کی حاکمیت کو محض میرا جسم میری مرضی کے تحت چیلنج نہیں کیا۔ اس سے پہلے وہ تعلیم کے میدان میں اپنی حیثیت منوا چکی تھی۔ پھر اس نے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ کئی جگہ تو وہ مردوں سے بھی بہتر ثابت ہوئی۔ تب جا کر یہ سلوگن وجود میں آیا۔ بات کو آسان کرنے کے لئے یوں سمجھیے یہ سلوگن آخری سیڑھی تھی اور تعلیم پہلی۔

ہمارے یہاں تو پہلی سیڑھی ہی موجود نہیں۔ دوسری تیسری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور آپ چلیں آخری سیڑھی پر پیر جمانے! ویسے یہ میرا جسم میری مرضی مغرب کا باسی کھانا ہے جسے اس نے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا ہے۔ اور ہم این جی اوز والے اس ڈرم میں گھس کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ہمارے لوگ اس سلوگن کا ایک ہی مطلب نکالیں گے۔۔۔'

'وہ کیا؟' شاہینہ نے رانا سے پوچھا۔

'یہ کہ عورتیں کو حق چاہیے کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں منہ کالا کریں اور ان کا باپ، بھائی، شوہر، تایا، چچا، ماموں، سسر یا کوئی اور مرد رشتہ دار اس بات پر اعتراض نہ کرے۔ اسکے علاوہ معاشرہ بھی اعتراض نہ کرے۔ اگر ان کا دل کرے تو اپنے ہی بھائی یا باپ کے ساتھ منہ کالا کرلیں۔ اس فعل سے کسی کا لینا دینا نہ ہو۔ کیونکہ یہ شخصی آزادی ہے۔'

'یہ کیا بکواس ہے؟ ہم عوام کی رہنمائی کرینگے۔ انہیں بتائیں گے کہ میرا جسم میری مرضی کی روح کیا ہے۔ یہ آگاہی پھیلانا ہمارا فرض ہے!' ساروی نے کہا۔

'فرض نہیں دھندہ ہے۔۔۔ دھندہ!'

'تم بھی تو شامل ہو اس دھندے میں!'

'جلد چھوڑ دونگا۔۔۔' رانا بولا۔

'حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ ہم نہیں کرینگے تو رانی کر لے گی۔۔۔ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں چاہیے۔ کیا کہتے ہو؟' ساروی نے رانا سے پوچھا۔

'بات تو درست ہے آپکی۔ ہم دوسروں سے بہتر انداز میں کرلینگے۔ اس سلوگن کو آپ اپنے جارحانہ انداز گفتگو سے مشہور کر دیں گی۔ ٹاک شوز والوں کو تو ہر وقت ایک نیا تماشہ چاہیے۔ وہ تو آپ کو چوبیس گھنٹے کے لئے اپنے چینل پر بٹھا لینگے۔ بیسٹ انٹرٹینمنٹ ملے گی عوام کو۔' رانا نے کہا۔

'تو پھر بسمہ اللہ کرو۔ پروپوزل بناؤ۔ وومن ڈے پر ہم یہ نعرہ لانچ کرینگے ایک مارچ کی صورت میں۔ عنوان ہو گا: "میرا جسم میری مرضی۔۔۔ عورت مارچ"۔ ہم یہ مارچ ملک کے اہم شہروں میں منعقد کرینگے۔ اس سلسلے میں فائیو سٹار ہوٹل میں ایک تین روزہ سیمینار ہو گا۔ شہر کی سول سوسائٹی کو مدعو کرینگے۔۔۔ دانشور، اداکار، گلوکار، ادیب، شاعر، صحافی، کالم نگار، فیمی نسٹس، وکلاء اور اینکرز۔ سب کو بلائیں گے۔ آخری دن ایک ڈانس کا پروگرام رکھ لینگے کسی کتھک ڈانسر کو بلائیں گے۔ لاکھوں ڈالرز میں گرانٹ درکار ہو گی۔ یہ سلوگن اپنے تک رکھنا۔ آئیڈیاز بھی چوری ہو جاتے ہیں!' ساروی نے دائیں بائیں دیکھ کر سنسنی پیدا کرتے کہا۔

'اگر اسے آپ چوری کر سکتی ہیں تو سب ہی چرا سکتے ہیں۔ گھسا پٹا سلوگن ہے۔ ممکن نہیں کہ رانی اس سے لاعلم ہو۔ اگر ہم ڈونر کو متاثر کر دیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔' رانا دونوں لڑکیوں کی جانب دیکھتے بولا۔

'ہم کر دینگی ڈونر کو متاثر۔ پہلے بھی کیا ہے۔ اب کیوں نہیں کر سکیں گی؟' عمرانہ بولی۔

'ٹھیک ہے۔ میں بناتا ہوں پروپوزل۔ گڈ لک!' رانا بولا۔

باب 13

چوبیس گھنٹے کا غلام!

'تمہارا گھر اتنا صاف ستھرا اور ترتیب سے سجا رہتا ہے۔ تمہارا لان بھی بیحد خوبصورت ہے۔ پھر بھی میں نے تمہارے گھر پر آج تک کوئی ملازم نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے یہ سب کام تم اکیلے تو کر نہیں سکتیں۔ اس کا راز کیا ہے؟' شہباز نے آج غزالہ سے ایک مختلف سوال کر ڈالا۔

'تم آتے ہی اس وقت ہو جب سب ملازم چھٹی کر جاتے ہیں۔'

'تم بلاتی ہی ایسے وقت ہو۔'

'تو کیا سب کے سامنے بلایا کرو؟ سب کے سامنے ننگی پھرا کروں؟ میرے پاس نوکروں اور غلاموں کی فوج ہے۔ اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور گھر لوٹ جاتے ہیں۔ نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کسی کی محتاجی اچھی نہیں لگتی۔ نوکر سب کام کر ڈالتے ہیں۔ صبح سے شام لگے رہتے ہیں بیچارے۔ گو کہ گھر کے پیچھے چار چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔۔۔ سرونٹ کوارٹرز۔۔۔ مگر مجھے ایک خاص وقت کے بعد مکمل خاموشی اور تنہائی اچھی لگتی ہے۔ اس لئے انہیں چھٹی دے دیتی ہوں۔ اس دوران اگر کوئی چھوٹا موٹا کام نکل بھی آئے تو خود کر لیتی ہوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں امور خانہ داری میں ماہر ہوں۔ بہت اچھا کھانا بناتی ہوں۔ لیکن اب نہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ میرا خانساماں خود بہت اچھے ذائقے دار کھانے بناتا ہے۔ میں تب بناتی ہوں جب وہ چھٹی پر ہوتا ہے۔ یا باہر سے آرڈر کر لیتی ہوں۔' غزالہ نے کہا۔ آج اس نے شہباز کو کافی عرصے بعد یاد کیا۔ افضال گھر پر نہ تھا۔

'تم اس تنہائی میں کیا کرتی ہو؟'

'سوچتی ہوں۔ غور و فکر کرتی ہوں۔ انہیں یاد کرتی ہوں جو مجھ سے پیار کرتے ہیں یا تھے۔'

'مجھے بھی؟' شہباز نے اسکی طرف دیکھتے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔ صرف انہیں یاد کرتی ہوں جن کا پیار بے لوث تھا یا ہے۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ تم میری خوبصورتی سے پیار کرتے ہو۔ میری روح سے نہیں۔ اس کا ثبوت میں تمہیں دے چکی ہوں۔ میں نے میک اپ سے اپنا چہرہ مسخ کیا اور تمہاری چیخیں نکل گئیں۔ تم صرف جسم دیکھتے ہو۔ روح نہیں۔'

شہباز کے خیال میں غزالہ فلسفہ بگھار رہی تھی۔ روح سے پیار کرنے والی بکواس اس سے ہر لڑکی نے کی۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس لئے اس نے غزالہ سے الجھنے کے بجائے ایک اور سوال پوچھ ڈالا:

'کیا میرے علاوہ بھی کوئی اس طرح آتا ہے تمارے پاس؟'

'مجھے پتہ تھا تم ایک نہ ایک دن یہ سوال ضرور کرو گے۔ کتنا گھسا پٹا سوال ہے۔۔۔ کیا میں تمہاری جورو ہوں کہ تم مجھ سے وفاداری کی امید رکھو؟ ایسا فضول سوال تو وہ بھی نہیں کرتا۔۔۔'

'کون نہیں کرتا؟'

'وہ ہی جس کی میں جورو ہوں۔'

'افضال یا تمہارا شوہر۔۔۔ کس کس کی جورو ہو تم؟'

'دونوں کی!' غزالہ نے کہا اور پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے کا خاص انداز تھا۔ معصومانہ۔ جیسے کوئی سات آٹھ برس کی بچی ہو۔

'ایسا سوال وہ ہی کرتا ہے جو اپنی عورت سے وفاداری کی امید رکھے۔ تم تو میرے ایک ادنی سے غلام ہو۔ تمہیں دربار میں بلایا جاتا ہے۔ یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے کہ کون کون تمہارے پاس آتا ہے یا میرے علاوہ تم کس کس کی غلامی کرتے ہو۔ کیا میں نے کبھی ایسا احمقانہ سوال کیا؟' اس نے اپنی بات جاری رکھتے کہا۔

'میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں جب سے تمہارے پاس آیا۔۔۔ اس لمحے کے بعد اب تک کسی اور کے پاس نہ گیا۔ لیکن اس غلام کو بس ایک ہی شکایت ہے کہ اسکی ملکہ اسے شاذونادر دربار میں طلب کرتی ہے۔ کیا یہ غلام چوبیس گھنٹے اپنی ملکہ کی غلامی کر سکتا ہے؟'

'کر سکتا ہے مگر یہ اعزاز حاصل کرنا پڑے گا۔ اور اس کا حصول بہت مشکل ہے۔ شاید ناممکن ہو تمہارے لئے۔' غزالہ بولی۔

'میں سب کچھ کر سکتا ہو اس اعزاز کے حصول کے لئے۔ تم آزما کر تو دیکھو!'

'چھوڑو!'

'نہیں۔ بتاؤ کیا کرنا پڑے گا مجھے؟'

'کیا بتاؤں؟ شادی کرو گے کیا مجھ سے؟'

'ہاں کرونگا!'

'سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔۔۔ تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ لگتا ہے کافی دنوں سے تم نے کچھ کیا نہیں۔ ٹھہرو ابھی اتارتی ہو تمہارے سر سے عشق کا بھوت۔۔۔'

شہباز میٹھی نیند میں اک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ غزالہ کے ساتھ تھا۔ ایک مکمل مشرقی غزالہ۔۔۔ اسکی بیوی کے روپ میں۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کوئی اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ اس کا خواب بکھر چکا تھا۔ واقعی کوئی اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ افضال تھا۔

'گڈ مارننگ سر، کیا آپ کپڑے اتار کر قالین پر سوتے ہیں؟ آپ کو چبھتا نہیں؟' یہ کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا۔ شہباز یہ ہی سوچتا رہ گیا کہ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔۔۔ اور کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا؟'

باب14

عملی زندگی کا آغاز

'اتنے سارے پیسے تو کہاں سے لائی؟ کوئی ڈاکہ تو نہیں مارا؟' ماں نے افسانے سے پوچھا جب بیٹی نے اس کے ہاتھ میں پورے پچاس ہزار روپے تھمائے۔

'میں تمہیں کوئی ڈاکو نظر آتی ہوں؟ یہ میری کمائی ہے۔۔۔ حق حلال کی۔ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ یہ میری پیشگی تنخواہ ہے۔' افسانے نے ماں سے کہا جو بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کبھی اپنی بیٹی کو اور کبھی ہاتھوں میں موجود نوٹوں کی گڈی کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ان گنت سوال صاف پڑھے جاسکتے تھے۔

محمودہ کوئی بدھو یا احمق قسم کی گھریلو عورت نہیں تھی۔ پچھلے بیس برس سے ملازمت کر رہی تھی۔ گھروں میں کیا کیا ہوتا ہے اچھی طرح واقف تھی۔ بس زبان بند رکھتی اور سب کے راز۔۔۔ بشمول اپنے ذاتی۔۔۔ سینے میں دفن کرلیتی۔ افسانے کی پیدائش کے وقت اسکی عمر پندرہ یا سولہ برس سے اوپر نہ ہوگی۔ اب وہ اڑتیس برس کی ہو چکی تھی۔ افسانے ہو بہو اس پر گئی تھی۔ دیکھنے والے جو انہیں جانتے نہیں تھے یہ ہی سمجھتے کہ ایک بڑی اور دوسری چھوٹی بہن ہے۔ محمودہ کو گھر سے باہر کئی دفعہ ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ نوکری بچائے یا عزت۔ اس نے نوکری کو ترجیح دی۔ بوبی افسانے کا بھائی تو تھا مگر آدھا۔ افسانے تو محمودہ اور رحیم بخش کی ہی اولاد تھی۔ بوبی محمودہ کا بیٹا تھا پر رحیم بخش کا نہیں۔ وہ ملک کا بیٹا تھا۔

ملک کی عمر پچاس برس تھی۔ دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اسکی خوش شکل بیوی اسکی کزن تھی۔ زیادہ وقت میکے گذارتی تھی۔ ملک کے دو جوان بیٹے بھی تھے۔ دونوں کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتے۔ ملک کے یہاں محمودہ پچھلے پندرہ برس سے ملازم تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی کہ یہ جو گھر تھا جس میں سب رہتے تھے۔۔۔ یہ ملک کی دین تھا۔ محمودہ کے بدن کی قیمت تھی جو اسنے چکائی۔ کوئی اور ہوتا تو محمودہ کو تنخواہ سے کئی گنا زیادہ رقم دے کر چلتا کرتا۔ مگر ملک خداترس انسان تھا۔ کسی سے زیادتی نہیں کرتا تھا۔ سب کی مدد کرتا تھا۔ بس عورت اسکی کمزوری تھی۔ کس کی نہیں ہوتی؟ ایک دن اسنے رحیم کو بھی اپنے گھر بلوایا۔ دونوں میاں بیوی کو سامنے بٹھایا اور یہ کہا کہ وہ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ان کے لئے خرید رہا ہے۔ اسپر یک منزلہ مکان بنا دیگا۔ اس کے عوض وہ تھوڑی بہت رقم محمودہ کی

تنخواہ میں سے کاٹتا رہے گا۔ لیکن اس نے کبھی بھی کسی قسم کی کٹوتی نہیں کی۔ یہ جھوٹ مصلحتاً تھا تاکہ رحیم کی عزت نفس پر حرف نہ آئے۔

ملک محمودہ پر مرتا تھا اور محمودہ اس پر۔ ملک کا دبنگ انداز محمودہ کو بہت بھاتا۔ اسکی بھاری آواز محمودہ کے دل میں ہلچل سی پیدا کر دیتی۔ رحیم تو اسکا غلام تھا۔ اس لئے محمودہ کو آج تک اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔

ملک کے ساتھ جو بھی رشتہ تھا وہ نوکری میں "سمجھوتے" کے زمرے میں ہرگز نہ تھا۔ ملک نے کبھی زور زبردستی نہیں کی۔ سمجھوتے محمودہ نے کئے۔۔۔ بہت سے۔۔۔ اس جگہ جہاں اس کی اپنی مرضی نہ تھی۔

ملک کی بیوی ملک کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کرتی۔ مگر ملک بیوی کو خوش کرنے کے لئے "سب کچھ" نہ کرتا۔ دو چیزیں کرنا وہ خلاف شریعت سمجھتا جن میں ملک کی بیوی کی خوشی مضمر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ دونوں چیزیں محمودہ کو کرنا پڑتیں۔۔۔ اپنی بیگم صاحبہ کو خوش رکھنے کے لئے۔ اس کام کی اسے بھاری ٹپ بھی ملتی۔

ملک سے پہلی ہی ملاقات کے بعد محمودہ پیٹ سے ہو گئی۔ اسکے پاس بیٹی تو پہلے سے ہی تھی۔ لہذا بوبی کی پیدائش پر میاں، بیوی اور بیٹی بے حد خوش تھے۔ رحیم میں جسمانی طور پر کوئی کمی نہ تھی۔ وہ اب بھی باقاعدگی سے اپنی بیوی کے پاس آتا۔ محمودہ نے کبھی بھی ادوایات کا استعمال نہیں کیا۔ نہ ہی اسکے شوہر نے کوئی حفاظتی تدبیر لڑائی۔ وہ اب بھی ڈھیر سارے بچے پیدا کر سکتی تھی۔ بس اللہ کی مرضی کہ افسانے کے بعد وہ رحیم سے کبھی حاملہ نہیں ہوئی۔ اس نے ملک سے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بوبی جیسا ایک اور تحفہ اسے دے دے۔ مگر وہ نہ مانا۔ مستقبل میں اس کا فلسفہ "احتیاط شرط ہے" رہا۔

محمودہ کو اس بات کا بھی اچھی طرح علم تھا کہ افسانے اور بوبی کے بیچ کیا چل رہا تھا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اسکی بیٹی کا گناہ اس کے اپنے گناہوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ملک کی بیوی کے ساتھ جو رشتہ وہ احسن طریقے سے نبھا رہی تھی۔۔۔ وہ ایک چھوٹا سا سمجھوتہ تھا۔ اس سے بھی بڑا سمجھوتہ اسے ملک کے دونوں بیٹوں کے ساتھ کرنا پڑا۔ محمودہ بعض اوقات اپنے حسن کو کوستی۔ باپ سے زیادہ بیٹے محمودہ سے استفادہ کرتے۔ بعض اوقات باری باری۔ بعض دفعہ اکھٹے۔ محمودہ نے ملک سے کچھ نہ چھپایا۔ دونوں سمجھوتوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا۔ مگر ملک نے خفیف سا ردعمل تک ظاہر نہ کیا۔ اس رویے نے محمودہ کو اس کی اصلی اوقات اچھی طرح یاد کرا دی۔۔۔ وہ اس گھر کی لونڈی ہے جسے جب چاہے جیسے چاہے کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔

ملک کے دونوں بیٹوں کی ایک اچھی بات تھی۔۔۔فلسفہ احتیاط!

محمودہ کو اب تو یاد بھی نہ تھا کہ آخری بار اسے اپنے کئے گئے سمجھوتوں پر کب پچھتاوا ہوا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔۔۔پڑھنے سے زیادہ ڈائیلاگ کی صورت میں فلموں میں سنا تھا کہ پہلا قتل کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ پچھتاوے انسان کو سونے نہیں دیتے۔ دوسرا قتل کرنے کے بعد وہ پچھتاووں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تیسرے چوتھے قتل کا وہ مزہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ برسوں قبل وہ اپنے پچھتاووں سے لطف اندوز ہونا شروع ہو چکی تھی۔ اگر پچھتاووں کی تکرار میں لمبا وقفہ آجائے تو اسے کوفت ہونا شروع ہو جاتی۔ اب وہ مہینے میں چھ سات دن سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔

محمودہ نے کئی بار بوبی اور افسانے کو ایک ساتھ سوتے دیکھا۔ ایسا نہیں تھا کہ بیٹی گھر سے باہر ہو۔۔۔رات گئے واپس آئے اور اسے خبر تک نہ ہوں۔ وہ جاگتی رہتی مگر کسی کو ایسا محسوس نہ ہونے دیتی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ رانی کے گھر سے افسانے شراب پی کر لوٹی تھی۔ کیونکہ یہ ہی شراب وہ ملک کے گھر کئی بار پی چکی تھی۔ اس نے بوبی کو افسانے کی ننگی چھاتیوں سے دودھ پیتے بچے کی طرح چمٹا ہوا بھی دیکھا تھا۔ مگر اس کا ایک فلسفہ تھا۔ اللہ نے اس کا پردہ رکھا ہوا ہے۔ اگر اس نے بیٹی اور بیٹے کا پردہ کھولا تو رب اس کا پردہ کھول دے گا اور وہ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہے گی۔ محمودہ کو اسکی بیٹی بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔۔۔چاہے کتنا ہی زور لگالے۔ اسے معلوم تھا کہ اس دنیا میں کوئی ایسا احمق نہیں جو اسکی بیٹی کو پچاس ہزار روپے کی نوکری دے۔ جبکہ اس نے نہ تعلیم مکمل کی۔ نہ کسی نوکری کے لیے درخواست دی۔ سونے پہ سہاگہ تنخواہ ایڈوانس میں بھی مل گئی۔

'بیٹا دیکھ میں نے تجھے ہمیشہ بیٹی سے زیادہ دوست سمجھا ہے۔ تیری ماں نے دنیا دیکھی ہے۔ مجھ سے سچ بول چاہے کتنا ہی بھیانک کیوں نہ ہو۔ بھلے تو کسی کے ساتھ اپنی عزت کا سودا کر کے آئی ہو مجھے دکھ نہ ہو گا۔ دکھ ہو گا تو تیرے جھوٹ سے۔ آج ایک جھوٹ بولے گی تو کل سو اور گھڑے گی۔ اسطرح ہمارا دوستی والا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ تو اپنی ماں پر بھروسہ کر کے تو دیکھ۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ سچا، مخلص اور رازدان دوست تجھے نہیں ملے گا!' یہ کہہ کر محمودہ افسانے کی طرف اس امید سے دیکھنے لگی کہ وہ اب سچ بولے گی۔ وہی سچ جو ماں پہلے سے جانتی تھی اپنے تجربے کے بل بوتے پر۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی کہ افسانے اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیسے وہ اسے یقین دلائے اپنی باتوں پر جسے سنکر بیٹی سچ بول اٹھے۔ اسکے دماغ میں ایک خطرناک ترکیب آئی۔

'افسانے بیٹی احتیاط کیا کر۔ کہیں تیرے پیٹ میں تیرے اپنے بھائی کا بیج پلنا شروع نہ ہو جائے!' یہ کہتے ہوئے محمودہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ ایک بے مثال جرا تمندی کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ سچ سامنے آ چکا تھا۔ اب جھوٹ بولنے کا فائدہ نہ تھا۔ افسانے نے حرف بہ حرف سچ اگل ہی دیا۔ ماں نے اسے گلے لگایا اور ماتھا چوما۔ بالکل ایسے جیسے رانی نے گلے لگایا تھا اور ماتھا چوما تھا۔ نہ جانے اس لمحے اسے کیا سوجھی کہ ماں کو اچانک کہہ دیا:

'اماں یہ بوبی کہیں سے بھی ابا پر نہیں گیا۔ ہو بہو آپ ہی کی نقل ہے۔'

لمحہ بھر کے لئے ماں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے افسانے اسکا بھید جانتی ہو۔

افسانے بہت خوش تھی کہ ماں نے اس کے سچ پر کسی قسم کا منفی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ بہت حیران بھی تھی۔ اس نے ماں سے کچھ نہ چھپایا۔ جو کچھ رانی کے ساتھ طے ہوا سب من و عن ماں کے سامنے پیش کیا۔ ماں نے پھر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا! اور وہ بہت افسردہ بھی تھی۔ افسردہ یوں کہ آج اسے اپنی ماں اور کسی نائکہ میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ نائکہ اپنی بیٹی کے لئے گاہک خود تلاش کرتی ہے۔ خود قیمت طے کرتی ہے۔ اچھا گاہک ملنے پر خوش ہوتی ہے۔ جشن مناتی ہے۔ مٹھائیاں بانٹتی ہے اپنی برادری کے لوگوں میں۔ اور ادھر بیٹی نے گاہک کا انتخاب خود کیا۔ شرائط بھی خود ہی طے کیں۔

افسانے کو یہ علم بھی تھا کہ ماں خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہے۔ ماں واقعی عظیم دوست تھی۔ پھر بھی لمحے بھر کے لئے اسکے دماغ میں ایک عجیب خیال آیا۔۔۔ کیا وہ اسکی سگی ماں ہے؟ ایک بیٹی اپنی ماں کو خود بتا رہی ہے کہ اسے شاندار نوکری ملی ہے اور اسکا بنیادی کام باس کے چنے ہوئے مردوں کے علاوہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کیساتھ سونا ہے۔ لیکن اس نے اس خیال کو خود ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پل بھر میں اس نے اپنے آپ کو بیس برس مزید بڑا دیکھا۔ وہ ہو بہو محمودہ بیگم تھی۔ اس کی ہر شے اپنی ماں پر تھی۔ اسے اپنے شک پر دکھ ہوا۔ محمودہ ہی اس کی سگی ماں ہے۔ لیکن ماں کو چپ کیوں لگ گئی؟ کیوں یہ نہیں کہا کہ بیٹی لعنت بھیج ایسے پیسے پر؟

افسانے کے ذہن میں جب کوئی سوال سما جاتا، تو وہ سب چھوڑ چھاڑ اس کا تسلی بخش جواب تلاش کرنا شروع کر دیتی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع ہو جاتی۔ بوبی اس عادت کا خوب مذاق اڑاتا۔ وہ بوبی کی کسی بھی بات کا برا نہیں منا سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی گھر کے مالی

حالات اچھے نہیں۔ شاید اس لئے ماں کچھ نہ بولی۔ لیکن اتنے برے بھی نہ تھے۔ اپنی چھت تھی۔ آجکل کے زمانے میں وہ بادشاہ جس کی چھت اپنی۔ گذر بسر بھی اچھی ہو رہی تھی۔ اسکی یونیورسٹی کی فیس ٹھیک ٹھاک تھی اور ہمیشہ وقت پر ادا ہوئی۔ گھر میں سب ہی کچھ تھا سوائے وی سی آر، فون اور گاڑی کے۔ وی سی آر اب مسئلہ نہ تھا۔ سی ڈی اور ڈی وی ڈی پلیئرز آ چکے تھے جو بہت سستے تھے۔ فون کی اب اتنی ضرورت نہ تھی کیونکہ رانی نے اسے موبائل فون دلانے کا وعدہ کر لیا تھا اور وہ وعدے کی پکی عورت تھی۔ کچھ دیر اسی ادھیڑ بن میں رہنے کے بعد اسے جواب مل ہی گیا۔

ماں افسانے کے مزاج سے بخوبی واقف تھی۔ یعنی جو بات افسانے کے دماغ میں آ جائے وہ اسے کر کے ہی دم لیتی تھی۔ ماں با آسانی سمجھ سکتی تھی کہ وہ اسے روک نہیں سکتی۔ اگر روکنے کی کوشش کی تو وہ گھر چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ اور یہ سچ تھا۔ رانی نے اسے کہہ دیا تھا کہ اس کے گھر کو اپنا گھر ہی سمجھے۔ اگر گھر والے راضی نہ ہوں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسکے پاس چلی آئے۔ بھلے بوبی کو بھی ساتھ لے آئے۔

بیٹی کا قیاس سو فیصد درست تھا۔ محمودہ کو پتہ تھا کہ وہ ملک اور اسکے گھر والوں کی داشتہ ہے۔ اب اس کے ساتھ مکافات عمل ہو رہا تھا۔ اسکی بیٹی بھی داشتہ بننے جا رہی ہے۔ بلکہ بن چکی تھی۔ سب سے پہلے وہ رانی کی داشتہ بنی۔ اب مستقبل میں وہ کئی مردوں کی داشتہ بنے گی۔ محمودہ کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ بیٹی دونوں صورتوں میں ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس پر زور زبردستی کرنے کی پوزیشن میں تو وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ ناراض ہو گی تو گھر سے بھاگ جائے گی اور برادری میں ناک کٹے گی۔ اور اگر گھر میں رہی تو یہ ہی سوچ ذہن میں رہے گی کہ دفتر سے نہیں کسی کے ساتھ منہ کالا کر کے واپس آ رہی ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ایک چیز جو ماں کے لئے جائز ہے وہ بیٹی کے لئے کیسے ناجائز ہو سکتی ہے؟

'چلو۔ آئی ایم ریڈی ناؤ۔' رانی نے کہا اور افسانے اپنی سوچوں کے دھارے سے باہر نکل آئی۔

افسانے آخری سال کا امتحان دے چکی تھی۔ چند ماہ بعد نتیجہ آنا تھا۔ اسے فرسٹ ڈویژن کی قوی امید تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ رانی کا ڈرائیور افسانے کو گھر سے صبح نو بجے اٹھا لیا کرے گا۔ شام چھ بجے تک وہ رانی کے پاس ہی رہے گی۔ کام سیکھے گی۔ رانی نے اسے سیدھا پروگرام مینیجر بھرتی کیا۔ تب ہی تو ابتدائی تنخواہ پچاس ہزار روپے پیش کی گئی۔

رانی جنگل کی شیرنی تھی۔ اس کی مرضی انڈہ دے یا بچہ! کسی کی مجال سوائے میکس کے جو اس سے کوئی سوال کر سکے! اور جہاں تک میکس کا معاملہ تھا، وہ بھی رانی کا بے دام غلام ہی تھا۔

یہ بھی طے ہوا تھا کہ ضرورت پڑنے پر افسانے رات رانی کے پاس ہی گذارے گی۔ نیز دفتر کے کام سے دوسرے شہر یا ملک بھی جانا پڑ سکتا تھا۔ ان باتوں سے نہ افسانے نہ اسکے گھر والوں کو کوئی اعتراض تھا۔ سب ہی خوش تھے اس کی نئی نوکری اور پر کشش تنخواہ سے۔

محمودہ نے البتہ افسانے اور بوبی کو سختی سے سمجھا دیا تھا کہ کسی سے بھی تنخواہ کا ذکر نہ کیا جائے۔۔۔ شمیم تک سے بھی نہیں جو افسانے کی سب سے گہری سہیلی تھی۔ حکمت یہ تھی کہ نظر نہ لگے۔ اور لوگ شک نہ کریں۔ باتیں نہ بنائیں۔ جو بھی تنخواہ کا پوچھے یا نوکری کے حوالے سے کوئی بات کرے، افسانے دوٹوک بتادے کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا ایسے سوال پوچھنے کا۔ لوگ خوش تو نہ ہونگے مگر دوبارہ ایسا احمقانہ سوال بھی نہیں پوچھیں گے۔

کوئی تین ماہ قبل میکس نے رانی کو ایک بڑے پراجیکٹ کا آئیڈیا دیا تھا۔۔۔ مغرب کا ایک بہت پرانا چلا ہوا کارتوس۔۔۔ مائی باڈی مائی چوائس۔۔۔ جسے وہ یہاں متعارف کرانا چاہتا تھا۔ یہ بہت بڑا اور طویل المعیاد پراجیکٹ تھا۔ اس نظریے کے تحت مغرب کے پالیسی سازوں نے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ کامیابی کی صورت میں یہ نظریہ مسلم دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا تھا۔ مغرب کو اچھی طرح علم تھا کہ مسلمان کسی زمانے میں ان پر حکومت کر چکے تھے۔ اور اب جہاد کا نظریہ نئی جہت کے تحت اس قوم میں فروغ پا رہا تھا۔ مسلمان آبادی پر قابو پانے والی حکمت عملی کو اسلام کے منافی سمجھتے تھے۔ بچوں پر بچے پیدا کرتے تھے۔ پرورش اور تعلیم کے وسائل ہوتے نہ تھے۔ ان بچوں کی کفالت زیادہ تر مدارس کیا کرتے تھے۔ اور یہ درسگاہیں نہیں جہادی فیکٹریاں تھیں۔ اسامہ بن لادن اور ملا عمر جیسے دہشت گرد ان کے ہیرو تھے۔ بس صحیح یا غلط مغرب کے دماغ میں یہ سوچ سما گئی کہ اسلام پسندوں سے اسلام کی ہر شے چھین لو۔ تا کہ کل کو کوئی جہادی پیدا نہ ہو۔ اسی مغرب نے کل ان لوگوں کو جہاد کی راہ پر ڈالا تھا۔

مدرسوں کو بھاری رقوم دے کر جہادی پیدا کروائے۔ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد اب مغرب کو انکی ضرورت نہ تھی۔ اور جہادی اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ کل ہم نے جہاد سے سویت یونین کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی۔ اب ہم امریکہ، اسرائیل اور انڈیا کو کچلیں گے۔ جب نائن الیون ہو گیا تو مغرب کو خطرے کا احساس ہوا۔ اب مغرب کا اٹھتے بیٹھے بس ایک ہی خواب تھا۔ جہاں جہاں اسلام ہے وہاں وہاں مغربیت پھیلا دی جائے۔ اسلامی حکومتوں کو لبرل، ماڈرن اور روشن خیال بنا دیا جائے۔ مغرب کا ہر نظریہ ان پر تھوپ دیا جائے۔ مشنری اور این جی اوز کی بدولت ایسا با آسانی کیا جا سکتا تھا۔

میکس اور رانی اس موضوع پر مفصل گفتگو کر چکے تھے۔ اسے "میرا جسم میری مرضی" کا عنوان دیا اور ڈھیر سارے موضوعات اس نعرے کے اندر ٹھونس دیے۔ پھر اس نے رانی کو ایک پروپوزل تیار کرنے کو کہا۔ اس پروپوزل میں وہ تمام طریقے شامل تھے جو میرا جسم میری مرضی کو کامیابی سے میدان میں اتار سکتے تھے۔ یہ پراجیکٹ ایک بہت بڑے مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم تھا۔ رانی جیسی گھاگ، سیانی، تجربہ کار اور اعلی تعلیمیافتہ عورت اسے اپنی این جی او کے ذریعے ملک کے چپے چپے میں پھیلا سکتی تھی۔ رانی کے تعلقات اوپر سے نیچے ہر جگہ تھے۔ آج اسی مقصد کے لئے میکس نے رانی کو بلایا تھا۔ اس نے سوچا کہ افسانے کو بھی ساتھ لے لے۔

'کیسی لگ رہی ہوں میں؟' رانی نے افسانے سے پوچھا جو سلیو لیس انڈیگو کام والی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسکا بلاوز کھلا اور مختصر تھا۔

'بجلیاں نہ گر پڑیں اب تو یہ خیال ہے!' افسانے نے کہا اور رانی ہنس دی یہ کہتے کہ اسے پتہ تھا کہ یہ ایک انڈین گانے کا دوسرا مصرعہ تھا۔

'آپ واقعی بہت دلکش لگ رہی ہیں۔ آپکی عمر پچاس تو ہرگز نہیں لگتی۔ مجھے تو تیس لگتی ہے۔ اور آپ نے کسی قسم کی سرجری بھی نہیں کرائی۔ کسی قسم کے جھریاں نہ آپکے چہرے پر نہ آپکی گردن پر۔ نہ آنکھوں کے نزدیک حلقے۔۔۔ آخر یہ راز کیا ہے؟'

افسانے نے پوچھا جو واقعی رانی کے حسن کی دلدادہ تھی۔

'گرین ڈائٹ، ایکسرسائز۔ نو کاسمیٹکس۔ اپنا میک اپ خود تیار کرتی ہوں۔۔۔ جڑی بوٹیوں سے۔ کم کھاتی ہوں۔ کسی چیز کا غم نہیں کرتی۔ پچھتاووں سے دور رہتی ہوں۔ لائف کو خوب انجوائے کرتی ہوں۔ ہر لمحے ایڈوینچر کے لئے تیار رہتی ہوں۔ سوئمنگ کرتی ہوں۔ اور اس کے علاوہ ایک اور ٹوٹکہ ہے لیکن وہ تمہیں وقت آنے پر بتاؤ گی!' رانی نے آخری جملہ بہت معنی خیز انداز میں کہا۔

'مجھ معلوم ہے وہ ٹوٹکہ۔۔۔'

'چلو بتاؤ پھر!'

'بہت سارا سیکس!'

'بالکل غلط! تو ابھی بچی ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے ابھی تو نے۔ وقت آنے پر وہ ٹوٹکہ بتاؤنگی۔ اب میکس کی طرف چلتے ہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔' رانی نے کہا۔ وہ افسانے کو "آپ"، "تم" اور "تو" ہر صیغے سے پکارتی تھی۔

دونوں عورتیں گیراج میں آئیں جہاں ایک نئے ماڈل کی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ یہ پانچ مرلے سائز جتنی گاڑی میکس کے ادارے نے رانی کو دی ہوئی تھی۔۔۔ بمعہ ڈرائیور۔ رانی دفتر کا زیادہ تر کام گھر سے ہی کیا کرتی تھی۔ اور دفتر کونسا دور تھا۔ اسکی کوٹھی بہت وسیع تھی۔ اصل میں دو بہت بڑی کوٹھیاں تھیں لمبے چوڑے لان تھے۔ باپ نے ایک رانی کے اور دوسری عدیل کے لئے بنوائی تھی۔ عدیل والی میں اس نے دفتر سیٹ کر لیا۔ لاکھوں میں جو کرایہ ہر مہینے ڈونر سے موصول ہوتا وہ رانی عدیل کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا کرتی تھی۔ ویسے بھی وہ کوٹھی عدیل کی ملکیت تھی۔

پیسے کے معاملے میں رانی بہت کھری عورت تھی۔ اپنے سٹاف سے بہت عزت سے پیش آتی۔ اچھی تنخواہ اور مراعات دیتی۔ غرور بالکل نہ تھا۔ انکی خوشی اور غم میں برابر کی شریک ہوتی۔ اسی لئے اسکا سٹاف بھی اسکی بہت عزت کرتا۔ کوئی چالیس کے قریب لوگ تھے اسکے آفس میں۔ زیادہ تر عورتیں۔۔۔ سب جان چھڑکتے اس پر۔ پھر وہ تھی بھی بہت حسین اور وہ بھی بنا گھمنڈ!

کچھ دیر میں گاڑی میکس کے دفتر کے اندر تھی۔ دفتر کیا تھا بہت بڑا محل تھا ایکڑوں پر پھیلا ہوا۔ اس محل کے ایک کمرے میں اس کا دفتر تھا۔ اپنے کمرے سے باہر آکر اس نے دونوں کا استقبال کیا۔ وہ تھری پیس سوٹ اور ٹائی میں بہت ہینڈ سم لگ رہا تھا۔

'ویلکم ڈئیر۔ تم دونوں کی تشریف آوری کا شکریہ۔' میکس نے کہا اور دونوں کو اپنے کمرے کے اندر لے گیا۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا۔

'رانی تم بہت لکی ہو۔ یہ دیکھو!' میکس نے ایک فائل رانی کی طرف بڑھاتے کہا۔ وہ افسانے کی جانب بھی دیکھ رہا تھا۔

'واؤ میکس!' رانی نے فائل کے اوراق پلٹتے کہا۔ 'تمہاری مدد کے بغیر ہمیں یہ پراجیکٹ نہیں مل سکتا تھا۔'

'تم بھی تو بہت محنتی ہو۔ تم ہی اس کی بہترین حقدار ہو۔ میں نے ایل جی بی ٹی کیو کو بھی میرا جسم میری مرضی سے لنک کر دیا ہے۔ اب آگے تمہارا کام۔ پانچ سال کی گرانٹ دی ہے تمہیں۔۔۔ دل کھول کر! جشن کی تیاری کرو!' میکس نے جوشیلی آواز میں کہا۔

'تھینک یو ویری مچ میکس۔ یو آر گریٹ اینڈ یو آر اے ٹرو فرینڈ۔ تم آج شام کیا کر رہے ہو؟ اگر فری ہو تو میری طرف آجاؤ۔ افسانے بھی ہو گی۔ ساری رات جشن منائیں گے۔' رانی نے میکس اور افسانے کی جانب دیکھتے شرارتی مسکراہٹ سے کہا۔

'آج میں فری نہیں۔ پھر کبھی سہی!' میکس نے کہا۔ دونوں عورتیں اس کا دوبارہ شکریہ ادا کر کے اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گئیں۔ راستے میں افسانے نے رانی سے ایل جی بی ٹی کیو کے بارے میں پوچھا۔

'ڈارلنگ یہ نیا شوشہ ہے ڈونر کا۔ اس کا کوئی سر پیر نہیں۔ نہ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ لیکن ہم نے بھی تو زندہ رہنا ہے۔ تو اس قسم کے ڈرامے کرنے پڑتے ہیں۔'

'پر ہے کیا بلا؟' افسانے نے اس بار زور دے کر پوچھا۔

'گھر پہنچ کر بتاؤں گی۔' رانی نے کہا۔ اور گھر کونسا دور تھا۔ چند منٹ بعد آ گیا۔

رانی نے دو ٹھنڈی یخ بوتلیں بئیر کی کھولیں۔ ایک اپنے اور دوسری افسانے کے لئے اور دھڑام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

'ایل جی بی ٹی کیو مخفف ہے لیز بئین، گے، بائی سیکسچول، ٹرانس جینڈر اور کوئیر کا۔ بات سیدھی سے ہے مگر اسے جان بوجھ کر الجھایا ہوا ہے۔ لیز بیئن وہ جو میں اور تو ہیں یعنی عورت دوسری عورت کے اندر جنسی کشش محسوس کرے۔ اب یہ ہی کشش مرد مرد کے اندر محسوس کرے تو گے۔ بائی سیکسچول کا مطلب وہ مرد یا عورت جو دونوں جنس میں کشش محسوس کرے۔ اسے سٹریٹ بھی کہتے ہیں۔ جو تو بھی ہے اور میں بھی ہوں۔ ٹرانس جینڈر میں ہیجڑے اور خوجہ سرا آ گئے اور کوئیر کو تو زنخے سمجھ لے۔

ہیں مرد مگر عورت بنے پھرتے ہیں۔ یا مرد مار عورتیں۔ اب ان بکواسیات پر "جینڈر سٹڈیز" کے نام پر پی ایچ ڈی ہوتی ہے۔۔۔ یہاں اور باہر۔ میکس چاہتا ہے کہ ان تمام موضوعات کو ہم میرا جسم میری مرضی کے تحت پروموٹ کریں۔ لوگوں کی سوچ بدلیں ان کے بارے میں جو مسلم وورلڈ میں منفی ہے۔ فیملی پلاننگ بھی اسی میں گھسیڑ دیں۔ بس کھچڑی پکانی ہے۔ اور مجھے حیرت ہے کہ تو نے ایم اے انگریزی کا امتحان دے رکھا ہے۔ پر تجھے ان باتوں کا علم نہیں۔'

'ارے یہ تو معلوم ہے کہ کون گے ہے کون لیز بئین ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی کہ اسے میرا جسم میری مرضی سے لنک کرنے کی کیا تک ہے۔' افسانے بولی۔

'بھئی تو ساڑھی پہن یا شلوار قمیض یا جینز شرٹ یا کچھ بھی نہ پہن۔ اسی طرح اگر کسی مرد کا جی چاہ رہا ہے کہ ساڑھی پہن لے۔ تو پہن لے۔ یہ ہو گیا میرا جسم میری مرضی۔ ساڑھی پہننے والا مرد کوئیر کی کیٹیگری میں آتا ہے۔ اب یہ ڈونرز اسے میرا جسم میری مرضی کے اندر گھسیڑ کر ایک نیا نظریہ پیش کر رہے ہیں۔' رانی نے بئیر کا گھونٹ بھرتے کہا۔

'تو پھر آپکے خیال میں کیا ہے میرا جسم میری مرضی؟'

'نری بکواس! بھئی تیری شادی ہو جاتی ہے۔ تو آگے پڑھنے کے لئے باہر جانا چاہتی ہے۔ تجھے سرکار سکالرشپ دے دیتی ہے۔ تیرا شوہر زبردستی تیرے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ کنڈوم بھی نہیں استعمال کرتا۔ تو پیٹ سے ہو جاتی ہے۔ پھر تو بھاڑ میں گیا سکالرشپ اور پڑھائی! اب یہ سب کیوں ہوا؟ تیرے جسم کے اوپر تیری مرضی نہیں بلکہ تیرے خصم کی مرضی چلی۔ اب یہاں پر مغرب کے حساب سے کئی ناانصافیاں ہوئیں۔ تیرا شوہر بغیر اجازت تیرے اوپر چڑھ گیا۔ پھر کنڈوم بھی نہیں لیا۔ تو حاملہ ہو گئی۔ اب تو بچہ بھی نہیں گروا سکتی۔ غیر قانونی طور پر تو کرلے گی۔ مگر پکڑی گئی تو جیل جائے گی۔' رانی نے کہا۔

'شوہر اجازت لے کر کب چڑھتا ہے۔ یہ تو اس کا شرعی حق ہے۔ اور اسلام میں تو نکاح کے دو مقصد ہیں۔ ایک شہوت پر قابو پانا اور دوسرے اولاد صالح پیدا کرنا۔ میں غلط کہہ رہی ہوں کیا؟' افسانے نے پوچھا۔

'تو درست کہہ رہی ہے مگر ہم لوگوں نے یہ ہی چیز تو ختم کرنی ہے۔۔۔ اسلامی شعائر، تعلیمات، رسم و رواج، شریعت، دین، شرم و حیا، چادر اور چاردیواری کا تصور۔ ہم اپنے موجودہ رول میں اسلام کا نام تک نہیں لے سکتے۔ تو انگریزی مووِیز دیکھتی ہے کیا؟'

'جی دیکھتی ہوں۔'

'تجھے نظر آتی ہیں یہ چیزیں ان فلموں میں؟'

'کون سی چیزیں؟'

'ارے جو ہمارے ہاں ہیں۔ مثلاً بہن بھائی کی غیرت ہے۔ ماں بیٹے کی غیرت، بیوی شوہر کی غیرت۔ فلانی فلانے کی غیرت! کیا تجھے گوروں میں نظر آتی ہے اس قسم کی غیرت؟' رانی نے پوچھا۔

'نہیں رانی۔ مجھے تو سب کے سب حرامزادے اور بے غیرت دکھائی دیتے ہیں۔'

'درست کہا۔ سب ایک نمبر کے حرامزادے اور حرامزادیاں ہیں!' رانی نے افسانے کی بات کی تائید کی

۔

'اور انکی لغت میں تو لفظ "غیرت" ہے ہی نہیں۔ تب ہی تو ہم نے "غیرت کے نام پر قتل" کو "اونر کلنگ" جیسا بھونڈا نام دیا۔' افسانے مزید بولی۔

'تو نے میرے دل کی بات کی۔ لیکن ہم ایسی سوچ صرف دل و دماغ کے اندر ہی رکھ سکتے ہیں۔ اس کا اظہار نہیں کرسکتے۔ اگر ایسا کیا تو اسلام پسندوں، مولویوں، جہادیوں اور شدت پسندوں کی کیٹیگری میں آ جائینگے۔ پھر ہمیں کوئی عورتوں کا مدرسہ چلانا چاہیے نہ کے دومن

رائٹس پر این جی او۔۔۔یہ وومن رائٹس تو شو پیس ہے۔ عورتوں کے جائز حقوق تو اسلام نے چودہ سو برس پہلے ہی دے دیے تھے جب مغرب جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سورہ نساء پڑھی ہے تونے؟'رانی نے پوچھا۔

'جی!'

'سبحان اللہ کیسے اللہ تعالی نے عورت کا ایک ایک حق پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جیسے ریاضی ہو۔ ورنہ قرآن مجید ہر معاملے کی ایسی تفصیلات فراہم نہیں کرتا جیسی عورت کے وراثت کے حق کے بیان کی گئیں ہیں۔ مغرب میں تو اب تک وصیت والا دقیانوسی سسٹم کام کر رہا ہے۔ اور یہ جو گورے ہمیں بھاشن دیتے ہیں کہ مسلم معاشرہ عورتوں کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیا۔۔۔تو کوئی بتائے ان کو کہ پیارے نبی محمد ﷺ نے تو شادی ہی ایک بزنس وومین سے کی تھی۔ کامن لاء نے بہت سارے نظریے قرآن مجید سے لئے مثلاً مرکنٹائل لاء۔'رانی بولے جارہی تھی اور افسانے ورطہ حیرت میں ڈوبے جارہی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ رانی کے اندر اسلام کا اتنا مضبوط اور درست تصور موجود ہو گا۔ پھر اس کے اعمال مذہب سے بالکل برعکس کیوں تھے۔ کیا وہ منافق تھی۔۔۔دوسروں کی طرح؟ ابھی اس کی یہ سوچ ختم نہ ہوئی تھی کہ رانی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور افسانے کی گود میں گر گئی۔ اسکے آنسو ٹپ ٹپ افسانے کی قمیض تر کر رہے تھے۔ اور افسانے کے آنسو اسکے گالوں کو!

باب 15

رج کے حلوہ کھانے والا کتا!

'شاہ تمہیں جنسی طور پر ہراس کر رہا تھا مگر کس لئے؟ اور تم آج نہیں تو کل اسکے بستر میں ہو تیں۔ ملتا کیا؟ چند ہزار روپے کی نوکری چھوٹنے سے بچ جاتی! لیکن یہی کام کر کے تم لاکھوں نہیں کروڑوں کما سکتی ہو۔۔۔ صرف چند برسوں میں۔ بس تم نے میرے مشوروں پر عمل کرنا ہے۔ اور اس کی اوقات کسی کتے سے زیادہ نہیں۔ ہم تینوں کتا بنائیں گے اسے۔ اور یہ بھاؤں بھاؤں چاؤں چاؤں کرے گا۔ گوہر نے گاڑی کو تیزی سے موڑتے کہا۔ وہ بلقیس سے مخاطب تھی۔ پچھلی سیٹ پر ریٹا بیٹھی تھی۔ یہ تینوں شاہ کے اپارٹمنٹ جا رہے تھے۔ اس نے آج ان تینوں کے اعزاز میں ایک پارٹی رکھی ہوئی تھی۔ یہ جگہ شاہ کی رہائش نہ تھی۔ عیاشی کا اک اڈا تھا۔۔۔ پوش ہاوسنگ سوسائٹی میں۔۔۔ شہر سے چند میل دور۔ یہ ذاتی نہیں کرائے کا فلیٹ تھا۔ کرایہ وہ اپنی جیب سے نہیں دیتا تھا۔ ایک مرید پھنسایا ہوا تھا۔۔۔ سادح لوح۔ پوری بلڈنگ اسی کی تھی۔ اپنے پیر کو خوش کرنے کے لئے اس نے یہ اپارٹمنٹ خوبصورتی سے آراستہ کر کے اسے بخشا ہوا تھا۔

شاہ نے ہر چیز کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ رنگ برنگی مدہم لائٹس نے ماحول کو رومانوی بنا رکھا تھا۔ لاونج میں چاروں طرف صوفے اور بیچ میں ہاتھ کا بنا ہوا خوبصورت قالین تھا۔

گھنٹی بجی۔

'لو آ گئے!' شاہ نے دروازے کی طرف لپکتے اپنے آپ سے کہا۔ وہی لوگ تھے جن کا اسے انتظار تھا۔ سب مہمان لاونج میں اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ شاہ نے ان سے پوچھا کہ کون کیا پینا پسند کریگا۔

'میرے لئے وہسکی۔' ریٹا نے کہا۔

'میرے لئے بھی۔' گوہر بولی۔

'اور تم کیا لو گی بلقیس؟' شاہ نے پوچھا۔

'جو میڈم کہیں گی!' بلقیس نے کہا۔

'پہلے کبھی اتفاق ہوا پینے کا؟' گوہر نے پوچھا۔

'نہیں!'

'تو پھر اسے اورنج جوس یا کوئی بھی سوفٹ ڈرنک دے دو۔' گوہر نے کہا۔

'نہیں میڈم۔ روم میں رومن کی طرح کرنا چاہیے!' بلقیس نے کہا اور سب نے بیک وقت اس نو آموز دوشیزہ کے حوصلے اور "سیکھنے" کے جذبے کی داد دی۔

'تو پھر تینوں کے لئے وہسکی۔' گوہر نے کہا اور شاہ جھٹ پٹ ڈرنکس لے آیا۔

'بلقیس کیا تمہیں معلوم ہے اپنے شاہ جی 'کتا' بہت اچھا بنتے ہیں! شاہ ہمیں ذرا بتاؤ کہ بھوکا کتا کس طرح بھونکتا ہے۔ اس سے زیادہ بھوکا کیسے اور جو بہت ہی بھوکا ہو وہ کیسے بھونکتا ہے؟ چھوٹا کتا اور بڑا کتا کیسے بھونکتے ہیں؟ پرس پپی کیسے بھونکتا ہے؟ جس کتے کا پیٹ بھرا ہوا ہو وہ کیسے بھونکتا ہے۔ اور جو کتا رج کے حلوہ کھانے کا شوقین ہو، وہ کیسے بھونکتا ہے۔۔۔ حلوہ کھانے کے بعد؟' گوہر نے کہا اور غور سے شاہ کی طرف دیکھا۔ اسکے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے مگر بے شرم اور بے غیرت بننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ویسے بھی اسکے خمیر میں غیرت اور شرم کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ قالین پر بیٹھ گیا اور مختلف انداز میں بھونکنے لگا۔ تینوں خواتین نے دل کھول کر تالیاں بجائیں اور قہقہے لگائے۔

'شاہ پپی کیسے اپنی مالکن کے پیر اور جوتے چاٹتا ہے۔۔۔ کر کے دکھا!' گوہر بولی۔ شاہ کو کر کے دکھانا پڑا۔

'چل آج پٹہ پہن۔ نکال اسے۔ اور وہ کالا والا ہنٹر بھی نکال!' گوہر نے نیا حکم جاری کیا۔ شاہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتا ایک کمرے میں گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ڈاگ بانڈیج سیٹ پہنے ہنٹر دانتوں میں دبائے کسی ننگ دھڑنگ کتے کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔۔۔ گوہر کے پیروں میں لوٹا اور ہنٹر اسکے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔

تینوں حسیناؤں نے باری باری اس پر ہنٹر برسائے۔ اسے ہنٹر کھانے کے پرانی عادت تھی۔ کھال گینڈے کی طرح سخت ہو چکی تھی۔ ہلکی سی آہ بھی اس کے منہ سے نہ نکلی۔ ہر ہنٹر پر وہ بھونکنا شروع ہو جاتا۔

'باتھ روم کہاں ہے؟' اچانک بلقیس نے پوچھ لیا۔

'تمہارے سامنے ہے۔ مجھے بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے!' گوہر نے شاہ کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ 'مجھے بھی!' ریٹا بولی۔ شاہ اور قالین دونوں بھیگ چکے تھے!

باب16

میں ہوں اور نہیں بھی!

'مجھے یہ رپورٹ ڈونر کو بھیجنی ہے صبح۔۔۔چاہے کچھ بھی ہو جائے یہ آٹھ بجے سے پہلے میرے ان باکس میں ہونی چاہیے! مینا، جنرل مینیجر پروگرامز!'

'یہ کیابکواس ہے؟ مینا کون ہوتی ہے مجھے آرڈر دینے والی؟' شہباز نے اپنے آپ سے کہا۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ پہلی بات، یہ کام اس کا نہیں مینا کا تھا۔ پروگرامز کی جنرل مینیجر وہ تھی شہباز نہیں۔ پراجیکٹ بھی مینا کا تھا۔ دوسرے وہ اس کے انڈر نہیں تھا۔ تیسرے مینا کے نیچے ایک پروگرام مینیجر اور چار پروگرام آفیسرز کام کر رہی تھیں۔ ان پانچوں کا کام مینا کی چاپلوسی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جنرل مینیجر بننے کے بعد مینا کی طبعیت میں کافی غرور پیدا ہو چکا تھا۔ اب وہ کام کم اور حکم زیادہ چلاتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سٹاف کی بے عزتی کر دیتی۔ میٹنگ میں اگر کوئی اس کی بات سے اتفاق نہ کرتا تو اس پر طنز کے تیر چلانا شروع کر دیتی۔ اپنے سٹاف کو ذاتی کاموں کے لئے استعمال کرتی۔ ہر فارن ٹور پر نپولین کے ہمراہ صرف وہ ہی ہوتی حالانکہ موضوعات کی اسے الف بے تک کا علم نہ ہوتا۔

شہباز نپولین کے انڈر کام کرتا تھا۔ صرف وہ ہی اسے کام کے متعلق حکم دے سکتا تھا۔ اگر نپولین اسے بتا دیتا کہ مینا کی مدد کر دیا کرو تو اسے کوئی عار نہ تھا۔ اگر وہ نہ بھی کہتا پر مینا یہ بات طریقے سے کرتی تو وہ پھر بھی ساری رات لگا کر یہ کام کر دیتا۔ مگر یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ اس پر حکم چلا رہی تھی۔ شہباز نے اسے بجا طور پر انا کا مسئلہ بنالیا۔

نپولین آج دفتر نہیں آیا تھا۔ اسے بخار تھا۔ "ملکہ عالیہ "یعنی مینا نے سارے دفتر کو آگے لگایا ہوا تھا۔ شہباز کو بہت غصہ آیا۔ اس نے مینا کو ای میل پر یہ لکھ دیا کہ وہ اسے رپورٹ نہیں کرتا۔ اس نے یہ ای میل نپولین کو بھی کاپی کر دی۔ اس کے بعد وہ غزالہ کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ پہلی بار تھا کہ غزالہ نے اسے دن کے اجالے میں بلایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھری دوپہر میں بلایا۔ شام چھ بجے بلایا تھا۔ شدید گرمیوں میں سورج اگر سوا نہیں تو ڈھائی نیزے پر تو ضرور ہی محسوس ہوتا۔ آج جب وہ غزالہ کے گیٹ پر پہنچا تو مالی نے اس کا استقبال کیا۔ مالی کے

ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ وہ اسے لاونج تک لے کر آئی۔ اسے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔ اس اگو ہرء میں غزالہ گھر کے بیک ڈور سے اندر آئی۔

'میرا تو چائے پینے کا موڈ ہے۔ تم پیو گے ؟' اس نے شہباز کو دیکھتے ہی پوچھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ گھر میں چائے کا ذکر ہوا۔ ورنہ بات "کچھ اور" سے ہی شروع ہوا کرتی۔

اس نے بھی چائے کے لئے ہاں کر دی۔ اگر حبس نہ ہوتا تو وہ لان میں بیٹھ کر چائے پیتا۔ اندر اے سی کی ٹھنڈی ہوا بہت مزا دی رہی تھی۔

'آج پہلی بار چاند غروب آفتاب سے پہلے نکل آیا!' شہباز بولا۔

'تمہارا جنرل نالج بہت کمزور ہے۔ چاند اکثر دن میں بھی نظر آتا ہے۔'

'مجھے معلوم ہے ڈارلنگ۔ میں تو محاورۃً کہہ رہا تھا۔ تم نے اپنے غلام کو دربار میں ہمیشہ رات کے اندھیرے میں ہی طلب کیا۔ اس لئے پوچھ رہا تھا۔ اس چینیج آف پلان کی وجہ ؟ شہباز نے پوچھا۔

'تم کرونا میں سیر کرو گے ؟' غزالہ نے اسکے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے ایسی پیشکش کر دی جو وہ کسی صورت ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔

'کیوں نہیں! اٹھو۔۔۔'

'اتنی جلدی بھی کیا ہے! چائے تو آنے دو۔'

'نہیں۔۔۔ چائے آکر پی لیں گے۔ بلکہ کافی پیتے ہیں۔۔۔ باہر۔' شہباز نے کہا۔

غزالہ نے چابی شہباز کے ہاتھ میں تھما دی۔ سب سے پہلے شہباز نے گاڑی کا بونٹ دیکھا۔ انجن وہی پرانا تھا۔ گاڑی ایک ہی سیلف میں سٹارٹ ہو گئی۔ اس پر غزالہ نے اسکی معلومات میں اضافہ کرتے کہا کہ یہ آخری بار پندرہ دن پہلے سٹارٹ ہوئی تھی۔ اسکے تین گیئر تھے اور ایک ریورس۔ شہباز نے اسے چلایا تو ایسے لگا کہ کہ سسپینشن کسی فور بائی فور جیپ کا ہے۔ کوئی شور نہیں۔ کوئی کھٹ پٹ نہیں۔ سپیڈ بریکر پر چپک جاتی۔ راستے میں کچھ جگہوں پر کھڈے آئے تو کوئی جھٹکہ محسوس نہ ہوا۔ انجن پرانا۔ سسٹم کاربوریٹر والا۔ رئیر وہیل ڈرائیو۔ مگر گاڑی ساونڈ لیس۔ آرام دہ سیٹیں۔ ڈیش بورڈ چمکتا ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ شوروم سے ابھی ابھی نکل کر آئی ہے۔

'یہ میرے والد کی ہے۔ انہوں نے امپورٹ کی تھی۔ بہت خیال رکھتے تھے۔ افضال بھی پاپا کی طرح اس کا خیال رکھتا ہے۔ دس پندرہ دن میں ایک بار ہی نکالتا ہے اسے۔ بس تین چار کلو میٹر کا چکر لگا کر واپس پارک کر دیتا ہے۔' غزالہ نے اسکی دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔

'میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔'

'اگر میں اسے بیچنے جاؤں تو کوئی لاکھ روپے بھی نہ بھرے۔ لیکن اگر تم خریدنا چاہو تو افضال دس کروڑ میں بھی نہیں دے گا۔ وہ بات اور کہ کسی بات پر خوش ہو کر تمہیں ویسے ہی گفٹ کر دے۔' غزالہ نے کہا۔

ایسا کیا ہے جو اسے خوش کر دے؟' شہباز نے پوچھا۔

'مانوں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ مانوں تو بہت کچھ!' غزالہ نے کہا۔

'تم نے پھر فلسفہ بولنا شروع کر دیا۔ تمہیں بات اشاروں میں کنایوں میں رمزوں میں کرنے کا شوق ہے۔ بھئی تم بہت بڑی افلاطون ہو۔'

اتنی دیر میں وہ دونوں "ڈیزرٹ کافی ہاؤس" پہنچ چکے تھے۔ یہ بہت مشہور برانڈ تھا۔ ساری دنیا میں اس کی شاخیں تھیں۔ بلیک کافی ہی دونوں کی پسندیدہ تھی۔ سو وہ ہی آرڈر کی گئی۔

'تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کے علاوہ اور کئی سوالوں کا جواب نہیں دیا۔' شہباز نے کہا۔

'ابھی کس سوال کا جواب چاہیے؟'

'آج دن کی روشنی میں کیوں یاد کیا؟'

'بھئی آج تمہیں یوں بلایا کہ کرونا میں سیر کرانی تھی۔ رات کو اسے نکالنا ٹھیک نہیں۔ پرانی گاڑی ہے۔ کسی بھی وقت خراب ہو سکتی ہے۔ تمہیں برا لگا تو آئندہ آدھی رات کے بعد ہی بلاؤں گی!'

'نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ اصل میں مجھے اچھا لگا۔' شہباز نے کہا۔ وہ دن کے اجالے میں بھی اتنی ہی حسین لگ رہی تھی جتنی رات کی تاریکی میں لگا کرتی تھی۔ آج اس نے بال کس کر جوڑے کی شکل میں پیچھے باندھے ہوئے تھے۔ مشرقی حسن کا بہترین نمونہ لگ رہی تھی۔ کاش وہ اسکی۔۔۔۔

'کیا سوچ رہے ہو مسٹر؟'

'کاش تم میری بیوی ہوتیں! یہ سوچ رہا ہوں۔'

'لو پھر عشق کا بھوت چڑھ گیا۔۔۔ وہی پرانا راگ۔۔۔ باسی کڑاھی میں ابال!' مذاق اڑاتے غزالہ نے کہا۔

'تم کیوں مجھے اپنی بیوی کے روپ میں سوچتے ہو؟ میں وفاشعار عورت نہیں۔ میں ان سیسٹ کی وکٹم ہوں۔ ایسی عورت سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟' غزالہ نے پوچھا۔

'شاید پیار اندھا ہوتا ہے! یقین مانو اگر تمہاری جگہ کسی اور عورت کا یہ بیک گراونڈ ہوتا اور بھلے وہ تم سے بھی زیادہ حسین ہوتی، میں ہر گز اسے اپنی شریک حیات نہ بناتا۔' شہباز نے اسے اپنی محبت کی سچائی کا یقین دلاتے کہا۔ نہ جانے کیوں اسے اسکی روح سے پیار ہوتا جارہا تھا۔

'تمہیں میرے جسم سے پیار ہے شہباز۔ میں تمہیں کبھی کبھی ملتی ہوں۔ اپنی شرائط پر ملتی ہوں۔ میں تمہیں ڈومینیٹ کرتی ہو اپنی اداؤں سے۔ تمہیں مجھ میں ایک امراو جان یاماتا ہری نظر آتی ہے۔ پھر میری جیون کہانی بے حد انہونی ہے۔ یہ سب مل کر ایک بارہ مصالحے کی چاٹ تیار کر دیتے ہیں۔ ہر کوئی پسند کرے گا اسے۔ تم ایک لکھاری ہو۔ تمہیں میری کہانی میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ سسپنس، تھرل، فلسفہ، رومانس، سیکس، ان سیسٹ، ایڈوینچر۔۔۔سب کچھ۔ شاید اتنا کچھ ایک بہترین فلم میں بھی اکٹھا نہ ملے۔

تم ایک تجسس سے بھرپور رائٹر ہوں۔ یقین مانو جتنا تم نے ابھی تک مجھے ایکسپلور کیا وہ سب فریب ہے۔ تم مجھے ذرہ برابر بھی ایکسپلور نہ کر سکے۔ جب تم پر میری حقیقت کھلے گی حیران اور پریشان رہ جاؤ گے۔ ایسے جیسے کسی بھرے میلے میں تم اور میں مضبوطی سے ہاتھوں میں ہاتھ تھامے چل رہے ہو۔ شانے سے شانہ چھل رہا ہو۔ پلک جھپکتے میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ صرف پل بھر کے لئے۔۔۔اور میں غائب ہو جاؤں۔ تم مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پیاس سے نڈھال ہو جاؤ۔ گر پڑو اور اسی حالت میں بے ہوش ہو جاؤ۔ اور اگر ہوش آئے تو تم کسی ایمرجنسی وارڈ میں پڑے ہو۔ تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ ڈاکٹرز تمہیں نفسیاتی مریض قرار دے کر کسی اسائلم میں بھیج دیں۔ کوئی تمہیں ٹھیک نہ کر سکے۔ ترس کھا کر میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں۔ صرف میں ہی تمہاری مسیحا بنوں۔ اور یہ سچے فریب اور سراب کا کھیل پھر سے شروع ہو جائے اور ایک بار پھر اسی طرح ختم ہو جائے اور اسکے بعد پھر اسی طرح شروع ہو جائے۔ اور اسطرح یہ تا حیات چلتا رہے!'

'اچھا آج ایک اور بھید کھلا مجھ پر۔ تم فلسفی ہونے کے علاوہ بہترین ڈرامہ نگار بھی ہو۔ یہ جو تم نے پلاٹ گھڑا اپنے دماغ میں، اسے تم اگر کسی ڈائریکٹر سے شئیر کرو تو وہ جھٹ سے ایک بہترین فلم بنادے گا۔' شہباز نے کہا۔

'تم پر ایک بار پھر پھر غلط بھید کھلا۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔ میرا مطلب تخلیقی کام سے ہے۔ میں نے تمہیں جو کچھ بھی بتایا، حرف بہ حرف سچ بتایا۔ میں ہوں اور نہیں بھی ہوں۔ میں اس وقت ہوں۔ کچھ دیر بعد نہیں ہو نگی۔' غزالہ نے کہا۔

'پھر گھسا پٹا فلسفہ۔ بھئی انسان فانی ہے۔ موت اٹل ہے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔ ہو سکتا ہے سڑک پار کرتے کسی گاڑی سے ٹکرا جاؤں اور مر جاؤں۔ تو پھر یہ ثابت ہوا کہ میں ہوں اور نہیں بھی ہوں۔ میں ہوں اور کچھ دیر بعد نہیں ہونگا!' شہباز نے کہا۔

'تمہیں سمجھانا بے کار ہے۔ تم صرف وہ ہی دیکھ سکتے ہو جو نظر آ رہا ہے۔ تمہاری تیسری آنکھ نہیں کھلی اب تک۔ میری جنم لیتے ہی کھل چکی تھی۔ میں وہ دیکھ سکتی ہوں جو تمہیں نظر نہیں آ سکتا۔ اس بحث کو چھوڑو۔' غزالہ نے کہا اور شہباز اگلا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ مینا نپولین کے ساتھ کافی شاپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں دونوں ان کے آمنے سامنے تھے۔

'ہاؤ آر یو مائی ڈیئر غزالہ!' نپولین نے کہا۔

'آئی ایم فائن نپولین۔ کہاں غائب ہو؟ آجکل بہت غیر حاضر رہتے ہو۔' غزالہ نے کہا۔

'بس یار کام بہت ہوتا ہے۔ جلد ملاقات ہو گی۔ ہاؤ از افضال؟' نپولین نے پوچھا۔

'ویسا ہی ہے۔ تم تو جانتے ہو اسے۔' غزالہ نے کہا۔

'بائی دی وے یہ مینا ہیں۔ مینا یہ غزالہ ہیں۔' نپولین نے دونوں کا تعارف ایک دوسرے سے کرایا۔ مینا اور غزالہ نے رسمی طور پر ایک دوسرے سے علیک سلیک کی۔

'تم شہباز کو کب سے جانتی ہو؟' نپولین نے پوچھا۔

'بہت عرصے سے۔ میں ان کی بہت پرانی فین ہوں۔ بہت عمدہ لکھتے ہیں یہ۔ کبھی کبھار بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ شہباز کو کب سے جانتے ہیں؟' غزالہ نے نپولین سے پوچھا۔

'بھئی یہ میرا باس ہے۔ میں اس کے انڈر کام کرتا ہوں!' نپولین نے کہا اور سب ہنس دیے۔

'اچھا ہم جانے والے تھے۔ حسن اتفاق ہے کہ آپ ہمارے نکلنے سے پہلے آ گئے۔ آپ کا بخار کیسا ہے؟' شہباز نے نپولین سے پوچھا۔

'یار فی الحال تو اترا ہوا ہے۔'

'ہم چلتے ہیں نپولین۔ جلد چکر لگانا!' غزالہ نے کہا۔

'یس یس۔ ضرور!' نپولین نے کہا۔

شہباز اس سارے منظر نامے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمجھ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ایک سے دوسری الجھن کا شکار ضرور ہوتا جا رہا تھا۔

باب 17

یہ چکلہ نہیں آفس ہے!

'یہ کیسے ممکن ہے؟ تم میں سے کوئی یقیناً رانی سے مل چکا ہے۔ تم دونوں نے تو ذکر بھی کیا تھا کہ رانی نے تمہیں میرے سے بھی زیادہ تنخواہ پر پہلے ہی جاب آفر کی ہوئی ہے۔' ساروی اپنا غصہ عمرانہ اور ستارہ پر اتار رہی تھی۔

'میڈم قسم لے لیں جو ہم نے کبھی ذکر بھی کیا ہو رانی سے اس پراجیکٹ کا۔ یہ درست ہے اس نے ہمیں آفر کی ہوئی ہے۔ اور ہم جب چاہیں اسے جوائن کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں الزام نہ دیں۔ آپ ہمارے ساتھ بہت بدتمیزی کرتی ہیں۔ ہم پھر بھی آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ ہم آپ کے محتاج نہیں۔ آپ ہماری محتاج ہیں۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آتا تو ہم ابھی اپنا استعفی آپکے حوالے کر دیتے ہیں۔' ستارہ نے ساروی کو صاف صاف لفظوں میں کہا اور عمرانہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس پر ساروی نے پینترا بدلا اور ایک دم نرم پڑ گئی۔ اس کے پاس ان دونوں کے علاوہ کوئی اور رنگین اور خوشبودار مال نہ تھا جسے پیش کر کے وہ ڈونرز یا سرکار میں کسی سے ثمرات سمیٹ سکے۔ ان دونوں کا یکدم چلے جانا اسکے حق میں نہ تھا۔

'میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے تم دونوں پر پورا یقین ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھو کہ میرا ایکسکلوسو آئیڈیا چوری ہو گیا۔ رانی تک کیسے پہنچ گیا؟'

'آپ رانا صاحب سے پوچھیں۔ ہم تینوں کے علاوہ وہ بھی تو تھے۔۔۔' عمرانہ نے کہا۔

'رانا صاحب۔ آپ آ سکتے ہیں میرے پاس؟' ساروی نے انٹرکام پر اس سے رابطہ کر کے کہا۔ وہ ایک منٹ کے اندر آ گیا۔

'آپکو تو معلوم ہے کہ۔۔۔'

'ہمارا پراجیکٹ ریجیکٹ کر دیا ڈونر نے!' رانا نے ساروی کی بات خود ہی مکمل کر دی۔

'لیکن یہ رانی کو کیسے مل گیا؟ آئیڈیا تو میرا تھا؟ محنت تو میری تھی؟ کیا تم نے۔۔۔'

'ایک منٹ۔۔۔ یہ آئیڈیا آپ کا نہیں تھا۔ یہ چوری شدہ آئیڈیا تھا۔ یہ بات میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ لہذا ہم میں سے کسی کو بھی بے وقوف مت بنائیں۔ اور جن کا یہ آئیڈیا ہے وہاں فیل ہو چکا ہے۔ ہر گھسا پٹہ دقیانوسی آئیڈیا مغرب ہماری طرف روانہ کر دیتا ہے۔ اور مجھے آپ کی

کم علمی کے علاوہ حماقت پر بھی حیرانی ہوتی ہے۔ پراجیکٹ پروپوزل، اسکے بعد میٹنگز اور حتمی گرانٹ۔۔۔اس عمل میں کچھ نہیں تو تین ماہ لگ ہی جاتے ہیں۔

آپکو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے یہ آئیڈیا دریافت کئے انٹرنیٹ پر ایک پورنوگرافک ویب سائٹ دیکھتے اور آپ اچھلنا شروع ہو گئیں کہ دیکھو میں نے آٹھواں سُر ایجاد کر لیا۔ اس پراجیکٹ پر رانی کی ٹیم پچھلے چھ ماہ سے کام کر رہی تھی۔ اور انہوں نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ آئیڈیا ان کا ہے۔ آئیڈیا ڈونر کا تھا۔ رانی کی این جی او کو انہوں نے کارکردگی کی بنا پر یہ خود آفر کیا۔ خود اس سے کہا کہ اس پر مشن اور ٹارگٹس کے حساب سے پروپوزل بناو۔ چکلہ صرف آپ نہیں سب ہی چلاتے ہیں۔

لیکن چلانے کے لیے عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور علم کی بھی۔ آپ دونوں چیزوں سے پیدل ہیں۔ اب آپ کے پاس ایک ہی چارہ ہے۔ رانی کے پیروں میں پڑیں کہ وہ آپ کو بطور پارٹنر آرگنائزیشن اپنے پراجیکٹ میں قبول کر لے۔ آپ کو رانی کے پروگرام مینیجر کے انڈر کام کرنا پڑے گا۔ غالباً افسانے نام ہے اس کا۔ نئی آئی ہے۔ ویسے مجھے نہیں لگتا آپ اس کے لئے بھی کوالیفائی کر پائیں گی۔ کیونکہ رانی کو کام چاہیے۔ اور رانی ڈونر نہیں اور مرد بھی نہیں کہ آپ ایک رات کے لئے ستارہ یا عمرانہ کو اسکے پاس بھیج دیں اور صبح گرانٹ منظور ہو جائے۔ اور اسکے ساتھ یہ لیجئے۔ میں اب چلتا ہوں۔ خداحافظ!' رانا نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ کسی میں جرات نہ ہوئی اسے ٹوکنے کی۔

'ایک منٹ۔۔۔ یہ کیا ہے؟' ساروی نے رانا سے پوچھا۔

'یہ میرا استعفی ہے۔ میں تنگ آ چکا ہوں اس نام نہاد این جی او سے۔ اس سے تو اچھا میں کسی کوٹھے کی رنڈی کا بھڑوا بن جاؤں۔ وہ اس چکلے سے تو کہیں بہتر ہو گا۔ کوئی دین ایمان اور اصول تو ہو گا وہاں۔۔۔ کوئی شرم و حیا تو ہو گی!

'رانا صاحب۔۔۔ پلیز ایسا نہ کہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ رک جائیں۔ صرف آپ ہی تو ہیں جس کے بل بوتے یہ ادارہ قائم ہے۔ آپکی تلخ باتوں کا میں نے کبھی برا نہیں مانا۔' ساروی نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

'ایک مہینے کا نوٹس ہے اس میں۔ اگر رانی کے ساتھ کام کرنا ہے تو پروپوزل لکھ سکتا ہوں۔ سوچ کر بتا دیجئے گا۔ اب رکنا ممکن نہیں۔ اور بے فکر رہیں۔ میں کوئی اور ادارہ جوائن نہیں کر رہا۔ اپنا کاروبار کرونگا۔ اس دلالی سے تو کہیں بہتر ہو گا! اور میں نمک حرام نہیں۔ سب راز میرے سینے میں ہی دفن رہیں گے۔ گڈ لک!' رانا نے کہا اور باہر نکل گیا۔ عمرانہ اور ستارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساروی غصے سے مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

'حرامی!' یہ لفظ اس کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ستارہ آگے بڑھی، کھینچ کر ایک تھپڑ ساروی کے گال پر رسید کیا اور کہا: 'تو ایک نمبر کی حرافہ۔ رنڈی۔ حرام زادی۔ کسی گشتی کی اولاد۔۔۔ کنجری!' ابھی اس تھپڑ سے وہ سنبھل نہ پائی تھی کہ عمرانہ آگے بڑھی اور ساروی کے منہ پر تھوک دیا۔ نہ جانے پھر دونوں پر کیا پاگل پن سوار ہوا کہ اسے بالوں سے کھینچ کر کمرے سے باہر لے آئیں اور گھونسے، مکوں اور لاتوں سے خاطر تواضع کرنا شروع کر دی۔ ایسا نہ تھا کہ دفتر میں کوئی اور نہ تھا۔ سب تھے۔

باہر ساروی کی سیکریٹری، سیکورٹی گارڈ، ڈرائیور، اکاونٹنٹ، ایڈمن کا سٹاف، ٹی بوائز۔۔۔ مگر سب عمرانہ اور ستارہ کے ہاتھوں ساروی کو پٹتے دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پیٹ رہا ہے اسے اور بدلہ لے رہا ہے اپنی بے عزتی کا جو وہ اٹھتے بیٹھتے کیا کرتی تھی۔ ایسے میں صرف ایک ہی شخص آگے بڑھا۔ پہلے ستارہ کو اور بعد میں عمرانہ کو پرے دھکیل کر اس مرد نے کہا: 'یہ کیا پاگل پن ہے۔ شرم کرو۔ یہ چکلہ نہیں آفس ہے!' یہ شخص رانا تھا۔ وہ ساروی کو سہارا دے کر اسے اسکے کمرے تک لے آیا۔ اس دوران وہ سب کو یہ نصیحت کرنا نہیں بھولا: 'جاؤ اپنا اپنا کام کرو اور جو ہوا اسے اپنے تک ہی رکھنا۔ ہم لوگ نمک حرامی نہیں کرتے!'

باب 18

این جی اوز کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے!

'میں کہتا ہوں اگر آپ کو اللہ تعالی نے اتنی استطاعت دی ہوئی ہے کہ آپ تن تنہا اپنے خاندان کی کفالت کر سکتے ہیں تو کیا ضرورت ہے اپنی بیوی، بہن، ماں یا بیٹی سے نوکری کرانے کی؟ مغرب میں مرد اپنی عورت سے کام کراتا ہے کیونکہ وہاں کاسٹ آف لیونگ یعنی گھریلو اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے۔ اور جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو ہر پابندی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ چار دیواری کے اندر اللہ اس کا حامی و ناصر ہوتا ہے۔ چار دیورای سے باہر وہ شیطان کے اثر میں ہوتی ہے۔ اسکے گھر چھوڑنے سے خاندانی نظام کمزور پڑ جاتا ہے۔ غیر مرد کی نگاہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نتیجہ گناہوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ میرے بھائیوں سوچو۔ اگر ایک عورت جس کا شیر خوار بچہ ہے اور اسے وہ آیا کے حوالے یا ڈے کیئر کے حوالے کر کے دفتر چلی جاتی ہے، تو کون کرے گا اس بچے کی تربیت؟ کیا وہ آیا یا ڈے کیئر والے اسے ماں کا پیار دے سکیں گے؟ وہ بارہ گھنٹے گھر سے دور رہے گی۔ تھکی ہاری واپس آئے گی۔ وہ کیا خاک تربیت کرے گی اپنی اولاد کی؟ اور پھر وہ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اس آیا کو یا ڈے کیئر والوں کو دے دیگی۔ تو بھائیوں کیا وہ یہ ہی وقت اپنے بچوں کو نہیں دے سکتی۔ یہ ہی وہ وجوہات ہیں جس کی وجہ سے مغرب میں شادیاں ناکام ہو رہی ہیں۔ طلاقوں کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ناجائز بچے پیدا ہو رہے ہیں۔'

مولانا ابدلی اسی جوش و خروش سے تقریر کر رہا تھا جو اس کا خاصہ تھا۔ آج وہ اپنے حلقے میں ووٹروں سے مخاطب تھا۔ شہباز کو اس نے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگ خاموشی اور نظم و ضبط سے اسکی گفتگو سن رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ بہت جوشیلا مقرر تھا۔ اپنی آواز کی بھاری گھن گھرج سے ایک سماں پیدا کر دیتا۔ اسے سن کر شہباز کو ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کا انداز تقریر یاد آ جاتا۔ شہباز کو یقین تھا کہ اسنے ڈاکٹر کنگ کو بہت غور سے سنا تھا۔

'میرے دوستوں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بڑی تعداد میں مرد مارے گئے۔ مغرب کو تعمیر نو کے لئے لیبر کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں عورتوں کا کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اکیلا مرد اپنے خاندان کی کفالت کر سکتا تھا۔ عورتوں کو گھر سے باہر نکالنا

مقصود تھا کسی خاص مقصد کے لئے۔۔ آزادی دینے کے لئے نہیں! انہیں مردوں سے کم تنخواہ دی جاتی۔ ان کا مقصد سستی لیبر کا حصول تھا عورت کی صورت میں۔ سرمایہ داروں نے وومن فریڈم کا نعرہ دیا سادہ لوح عوام کو۔ وہ اس جھانسے میں آ گئے۔ اب مغرب یہ کھیل اسلامی دنیا میں کھیلنا چاہ رہا ہے۔ این جی اوز، مشنری سکول و کالج، میڈیا، ٹی وی ڈرامے اور فلموں کے ذریعے یہ بتایا جا رہا ہے کہ عورت کو آزادی دیے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ میں پوچھتا ہو بھائیوں ایک وقت تھا جب مسلمان آدھی دنیا پر حکمران تھے۔ سائنس میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کیا انکی عورتیں دفاتر میں، کارخانوں میں، چائے خانوں میں، شراب خانوں میں یا کہیں اور کام کیا کرتی تھیں؟ جب صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس آزاد کرایا تھا تو کیا عورتیں گھر کی چاردیواری میں خاندانی نظام مضبوط کرتی تھیں یا گھر سے باہر نکل کر کلبوں میں شرابیں پلایا کرتیں تھیں؟ لیکن ان باتوں کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم جنہیں مغرب بنیاد پرست کہتا ہے عورت کی تعلیم یا ملازمت کے خلاف ہیں۔ میری دونوں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ آپکی عورتوں کا عرصے سے مفت علاج کر رہی ہیں۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟' ابدالی نے سوال پوچھا۔

سب لوگوں نے نعرہ بلند کیا: 'مولانا ابدالی زندہ باد!'

'ہمارے ملک میں عورتوں کو پینے کا پانی میسر نہیں۔ وہ میلوں دور پیدل چل کر جوہڑوں سے پانی بھر کر لاتی ہیں۔ گاؤں میں اور دور دراز علاقوں میں ہسپتال نہیں۔ کئی عورتیں اور بچے مر جاتے ہیں۔ دوائیاں نہیں ہیں۔ بچیوں کے سکولوں پر لینڈ مافیا قابض ہے۔ خواتین کے لئے باتھ رومز نہیں ہیں۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے بے یارو مددگار ہوتی ہیں۔ کام کرنے والی عورتوں کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولت نہیں ہے۔ کتے کے کاٹے کی ویکسین موجود نہیں۔ ہمارے مسائل تو یہ ہیں۔ مگر یہ این جی اوز والے کہتے ہیں کہ عورتوں کو نیکر پہن کر پارک میں جاگنگ کی اجازت ہو اور کوئی مرد انہیں دیکھنے کی جرات نہ کرے۔ یہاں کے تعلیمی اداروں میں جینڈر سٹڈیز پڑھایا جا رہا ہے۔ کیا فائدہ پہنچ رہا ہے اس ڈگری سے ان عورتوں کو جن کے مسائل کا میں نے ابھی ذکر کیا؟ یہ ڈگری ہمارے کسی کام کی نہیں اور مغرب اس ملک کی این جی اوز کے ذریعے اس مضمون کو کالجوں اور یونیورسٹیوں پر مسلط کر چکا ہے۔ یہ این جی اوز والے فزکس، کیمسٹری، انجینئرنگ، نیوکلئیر سائنس جیسے مضامین کو فنڈ کیوں نہیں کرتے؟ اسکی وجہ ہے۔ میں بتاتا ہو آپ کو۔ ایسا کرنے سے ہمارے بچوں اور بچیوں کے پاس علم آ جائے گا۔ اور علم کے ہتھیار سے ہم مغرب کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مغرب ہمیں وہ ہی سکھانا چاہتا ہے جو اس کے مفاد میں ہو۔ مسلم ورلڈ کے شہریوں کو باہر کی یونیورسٹیاں نیوکلئیر سائنس میں داخلہ نہیں دیتیں

حالانکہ وہ لوگ اپنی جیب سے فیس بھگتنے کو تیار ہیں۔ وہ کوئی بھیک مانگ کر داخلہ نہیں مانگ رہے۔ میرے بھائیوں یہ سب گہری سازش ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔'

ابدالی بولتا جا رہا تھا۔ اسکی فصاحت و بلاغت سب سننے والوں بشمول شہباز پر سحر طاری کر چکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اسلام پسند ایسی باتیں کر سکتا تھا۔ آج ثابت ہو گیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

'میرے بھائیوں مغرب نے گستاخانہ کارٹون بنا کر ہمیں مشتعل کیا۔ مگر ہم نے پرامن احتجاج ریکارڈ کروایا۔ کیا ان این جی اوز والوں نے ایک پلے کارڈ بھی گستاخانہ کارٹونوں کے خلاف اٹھایا؟ کیا ایک فیمی نازی بھی بولی ناموس رسالت کے حق میں؟ ہاں وہ فاحشہ عورت جو نیم عریاں ساڑھی میں ہمارے بچوں کو تعلیم دینا چاہتی ہے، اسکے لئے انہوں نے ضرور آواز بلند کی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں جو نقصان ہمیں باہر کا دشمن نہیں پہنچا سکا اب وہ این جی اوز کی شکل میں پہنچ رہا ہے۔ دیمک کی طرح کھائے جا رہی ہیں یہ این جی اوز ہماری جڑوں کو۔

اگر اس دیمک کا علاج نہ کیا گیا تو ہم سب جلد دھڑام سے نیچے گر جائیں گے۔ ان لوگوں کو مخلوط تعلیم چاہیے درسگاہوں میں۔ جانتے ہیں اس کا نتیجہ؟ یہ آج کا اخبار دیکھ لیں۔ گیارہ سال کے بچے نے اپنے سکول کی چھ سالہ بچی کا ریپ کر دیا! آج کا دن تو ان این جی اوز والوں کے لئے جشن کا دن ہو گا۔ آج یہ سب گا رہے ہونگے، اچھل اچھل کر ناچ رہے ہونگے۔ کہ دیکھو آج ہم نے وہ کر دیا جو مغرب کے ہر سکول میں روزانہ ہوتا ہے۔ ان ہی این جی اوز نے مخلوط تعلیم کا مطالبہ کیا تھا اور ہماری حکومت مان گئی۔ پرائیویٹ درسگاہوں میں تو مخلوط تعلیم عام ہے۔ میرے بھائیوں اگر ان این جی اوز کو نکال باہر نہ کیا گیا، ان کے خلاف جہاد نہ کیا گیا تو ہمارے ہر سکول میں یہ چیز عام ہو جائے گی۔ کیا آپ کو منظور ہے یہ سب؟'

ابدالی ہر شخص میں ایک قابل دیدنی ولولہ پیدا کر چکا تھا۔ اگر اس وقت وہ صرف یہ کہہ دیتا کہ چلو دھاوا بول دو ان این جی اوز پر تو یہ ہزاروں کا مجمع ایسا کر گذرتا۔ شکر ہے اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ سب چیزیں شہباز کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

'این جی او کلچر، نامنظور نامنظور۔ مخلوط تعلیم، نامنظور نامنظور۔ این جی اوز کا جو یار ہے، غدار ہے غدار ہے۔ این جی اوز کے حامی، سب کے سب ایک نمبر کے حرامی!'

پنڈال اس قسم کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ابدالی نے تقریر ختم کی تو قریب پانچ منٹ تک مسلسل این جی اوز کے خلاف فلک شگاف نعرے گونجتے رہے۔

شہباز نے ہاتھ کے اشارے سے ابدالی کو داد دی۔ وہ ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔۔ این جی اوز تصادم کی راہ پر گامزن ہیں۔ اگر یہ تصادم ہو گیا تو بہت خون خرابہ ہو گا۔ این جی اوز کے

حامی تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔ وہ گاجر مولی کی طرح ہجوم کے ہاتھوں کٹ جائینگے۔ اگر این جی اوز کو اس خطرے سے آگاہ نہ کیا گیا تو سب سے زیادہ نقصان ان اداروں کا ہو گا جو اپنی محنت اور پیسے سے ملک میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ہر مستحق کی حالت سدھارنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ جو کسی کے ایجنڈے پر کام نہیں کرتے۔ اسے مکمل یقین ہو چلا تھا کہ این جی اوز ملک میں عدم استحکام پھیلا رہی ہیں۔ وہ اس موضوع پر ایک جامع مضمون لکھنا چاہتا تھا۔

باب19

آڈیوز بمقابلہ وڈیوز!

'تمہاری شکایات بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ دیکھو!' گوہر نے شاہ کے ہاتھ میں ایک خط تھماتے کہا جو اسے ڈونر نے لکھا تھا۔

'اور ذرا یہ بھی دیکھو!' اس بار گوہر نے اس کے ہاتھوں میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھما دیا۔ یہ ان ویب سائیٹس کے لنک تھے جو شاہ دفتر میں بیٹھ کر دیکھا کرتا تھا۔ سب پورنو گرافک ویب سائیٹس تھیں۔

'یہ آپ کو کس نے دیں؟'

'آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ نے۔۔۔' گوہر نے کہا۔

'آپ نے آرڈر دیا ہو گا تو انہوں نے میری ہسٹری نکالی۔۔۔'

'میں نے نہیں بدر نے۔ یہ مت بھولا کرو کہ وہ ڈپٹی ہیڈ ہے اس ادارے کا اور آئی ٹی براہ راست اسکے نیچے کام کرتی ہے۔ چلو یہ تو میں سنبھال لوں گی۔ لیکن ڈونر کا خط تشویش ناک ہے۔ کسی نے نامعلوم ای میل لکھی ہے ڈونر کو۔ اس ای میل کے ساتھ اس نے درجنوں فائلز اٹیچ کی ہے جس میں تماری ڈھابے پر کئی گئی بے ہودہ تقاریر اور فرمودات ہیں عورتوں کے بارے میں جس میں میرا، ریٹا، بلقیس اور بہت ساروں کا ذکر ہے۔

تم میری سوچ سے کہیں زیادہ گھٹیا انسان ہو!' گوہر نے شاہ کو افسوسناک لہجے میں کہا۔

'وہ تو میں ہوں۔ ایک گھٹیا انسان ہی کتا بن کے تمہارے آگے دم ہلا سکتا ہے۔ ایک گھٹیا انسان پر ہی تو موتا جا سکتا ہے! اس وقت سوال یہ ہے کہ اس مصیبت سے کیسے نمٹا جائے۔' شاہ نے پوچھا۔

'بیسٹ آپشن یہ ہے کہ تم استعفی دے دو۔ اس طرح عزت سے چلے جاؤ گے۔ گریجویٹی، انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ ملا کر ایک بہت بڑی رقم تمہیں یک مشت مل جائے گی۔ اس رقم کا پرافٹ ہی تمہارے لیے کافی ہو گا اگر تم رنڈی بازی چھوڑ دو تو! اسکے علاوہ تمہیں عمدہ سی فیئر ویل پارٹی بھی دے دینگے۔ عزت اور وقار سے چلے جاؤ گے جو تمیں سوٹ نہیں کرتا!' گوہر نے کہا۔

'

پھر تو بھی استعفی دے دے۔ اور ساتھ میں ریٹا اور بلقیس کو بھی یہ ہی آپشن دے دے!'شاہ اب بد تمیزی پر اتر چکا تھا۔

'تمیز سے بات کرو! تمہارا مطلب کیا ہے؟'گوہر نے پوچھا۔

'شاہ کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ جس طرح کسی نامعلوم کے پاس میری آڈیوز ہیں اسطرح میرے پاس تمہاری وڈیوز ہیں۔ مجھے نکالا تو وہ سب ڈونرز کو بھیج دونگا۔ شاہ اکیلے نہیں سب کے ساتھ ڈوبے گا!'شاہ نے کہا۔ گوہر کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔

'میں کب چاہتی ہوں تمہیں نکالنا۔ لیکن بات اوپر تک پہنچ چکی ہے۔'گوہر بولی۔

'بات تمہارے کنٹرول میں ہے۔ آئی ٹی والا مسئلہ تو تم چٹکی بجاتے حل کر لوگی۔ رہی بات ڈونر کی تو اس نے کونسا یہاں آ کر سب کی آواز کا ٹیسٹ لینا ہے۔ تم کہہ دینا کہ کسی دل جلے کی حرکت ہے۔ یہ شہباز نے ہی کیا ہو گا۔ بتا دینا کہ اصلی مجرم وہ تھا۔ تم نے اسے نکالدیا اور وہ اسطرح ادارے کے خلاف ہو گیا۔ اور ڈونر بھی تو تمہاری مٹھی میں ہے۔ بلقیس کس دن کام آئے گی؟ ایک رات سلا دو اسے ڈونر کیساتھ یا تم اور ریٹا دونوں سو جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!'شاہ نے ہوشیاری سے حل پیش کر دیا۔

'یہ اتنا آسان نہیں! لیکن تم نے ہماری وڈیوز کیوں بنائیں؟'گوہر کو غصہ تو بہت آیا لیکن یہ وقت جذبات پر قابو پانے کا تھا۔

'اسی دن کے لئے کہ اگر کبھی تم میں سے کوئی بھی مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے تو میرے پاس اس چال کا توڑ پہلے سے ہی موجود ہو۔' شاہ نے کہا۔ 'لیکن فکر نہ کرو۔ میرے سوا کسی کو بھی ان وڈیوز کا علم نہیں۔'

'تم جھوٹ بول رہے ہو!'گوہر نے کہا۔

'اچھا تو پھر تم تینوں آج ہی آ جاؤ میرے اپارٹمنٹ پر اور خود دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے ہم سب کے کرتوت۔ حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ بہتر ہو گا سب مل کر ایک دوسرے کا پردہ رکھیں۔ میں تو مرونگا ہی تم بھی نہیں بچو گے۔ اب بال تمہاری کورٹ میں ہے۔ شام آٹھ بجے میں تم تینوں کا انتظار کرونگا۔ کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔ پھر کچھ کھیل کود کرینگے!'شاہ شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجائے گوہر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

غصے میں بھری ہوئی گوہر، ریٹا اور بلقیس بے حد پریشان تھیں۔ انکی منزل شاہ کا اپارٹمنٹ تھی۔ کسی کو بھی شاہ کی بات کا یقین نہ تھا۔ سب یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ بکواس کر رہا تھا۔ سب سے زیادہ فکر بلقیس کو تھی۔ پتہ چلنے کی صورت میں بلقیس کے باپ نے اسے قتل

کر کے گھر کے کچے فرش میں دفن کر دینا تھا۔ ریٹا اور گوہر اپنی پریشانی سے لڑنے کے علاوہ بلقیس کو تسلی بھی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر میں وہ سب شاہ کے دروازے پر تھیں۔

'آیئے ایئے تشریف لایئے۔ بیٹھیے!' بیل بجانے پر شاہ نے دروازہ کھولا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

'کیا چلے گا؟'

'کچھ نہیں۔ پہلے وہ دکھاؤ۔' گوہر نے کہا۔

'شاہ نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا۔ وہ تینوں ایک ہی صوفے پر تھیں۔ لیپ ٹاپ کو ان کے سامنے پڑی میز پر رکھا اور ایک فائل اوپن کی۔ تینوں کی حیرت قابل دیدنی تھی۔ شاہ یہ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

'بند کر دو اسے!' گوہر نے کہا۔

'یقین آ گیا؟' شاہ نے سب کی طرف دیکھتے کہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

'تمہاری نوکری کو کچھ نہیں ہو گا اگر تم یہ فائلز مجھے دے دو اس یقین دہانی کیساتھ کہ اسکی کوئی اور کاپی تمہارے پاس نہیں۔' گوہر نے کہا۔

'میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ اوریجنل فائل تھی۔ اس کے علاوہ ایک کاپی ہے۔ کہاں ہے۔۔۔ یہ نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا یقین دلاتا ہوں کہ میرے علاوہ دنیا میں کسی اور شخص کو اس بات کا علم نہیں۔' شاہ نے کہا۔

'مان لیتے ہیں۔ تو پھر ہمیں یہ لیپ ٹاپ اور وہ کاپی دے دو۔۔۔' ریٹا نے کہا۔

'کیا مجھے بدھو سمجھ رکھا ہے؟' یہ دے دوں تو میرے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ تم تو مجھے ایسے باہر نکال کر پھینک دو گی جیسے دودھ میں سے مکھی۔ لیکن کوئی بھی قسم لے لو، کچھ نہیں ہو گا۔ بس تم میرا مسئلہ حل کر دو!' شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

'ٹھیک ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اب ہم چلتے ہیں۔' گوہر نے کہا۔

'ارے میں نے تو کھانے کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔'

'ضرور بیٹھتے لیکن ابھی ہم سب اپ سیٹ ہیں۔ جلد ملیں گے۔۔۔ قلوپطرہ اپارٹمنٹ میں۔۔۔ ہم تینوں!' گوہر نے کہا۔

'میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن یقین کرو میں ایسا آدمی نہیں۔ بس اپنی سیفٹی کے لئے کیا جو کچھ کر سکا۔' شاہ نے پھر یقین دہانی کرائی۔ تینوں عورتیں وہاں سے نکل آئیں۔

'یہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ؟' ریٹا نے پوچھا۔

'سچ بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹ بھی۔ ابھی مشکل ہے پتہ چلانا۔ پر جلد پتہ چل جائے گا۔' گوہر نے کہا۔

'کیسے ؟'

'صبر !' گوہر نے جواب دیا۔ اس کے بعد سب خاموش رہے۔ لیکن گوہر کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلنے جا رہی تھی۔ کامیابی کی صورت میں سب کچھ بچ جاتا۔ ناکامی مکمل تباہی لے کر آتی۔ پر اب پیچھے رہ ہی کیا گیا تھا۔ زندگی میں جہاں اتنے جوئے کھیلے اور ہر ایک جیتا، ایک اور سہی۔ شاید یہ پہلی شکست ہو؟ لیکن اس شکست کو بھی فتح میں تبدیل کرنے کا پلان اس کے دماغ میں تھا اور بہت ہی واضح۔

'تم فکر نہ کرو بیٹی۔ کام ایسا ہو گا کہ کسی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو سکے گا۔' خان گل نے گوہر کو اطمینان دلاتے کہا۔

وہ قابل بھروسہ نوکر تھا۔ ہر فن مولا۔ گاؤں میں گوہر کی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ آج وہ کافی عرصے بعد گاؤں آئی تھی۔ حالانکہ یہ اسکے دفتر سے بذریعہ موٹر کار دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بہت خوش تھی یہ دیکھ کر کہ خان گل ہر شے کی بہت اچھی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ سوا چھ فٹ کا خان گل۔ عمر پچپن کے لگ بھگ۔ جسم کسی پہلوان جیسا۔ اس عمر میں بھی چار جوانوں پر بھاری۔ دو قتل کر چکا تھا۔ عدم ثبوت کی بنا پر عدالت کو اسے بری کرنا پڑا۔ خان گل زبان کا پکا تھا۔ آج تک کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ دونوں قتل اس نے گوہر کے لئے کیے۔ زمین کا تنازعہ تھا۔ عدالت کے چکر میں پڑتی تو ساری عمر انصاف نہ ملتا۔ اس نے خان گل سے ذکر کیا اور مسئلہ منٹوں میں حل ہو گیا۔

'تم اکیلے کر لو گے خان گل؟'

'بیٹی پہلے بھی یہ کام اکیلے ہی کیا تھا۔ اب بھی اکیلے ہی کرونگا۔ خان گل اپنے علاوہ کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتا۔'

'ٹھیک ہے یہ رکھو!' گوہر نے پرس سے پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک نئی گڈی خان گل کی طرف بڑھاتے کہا۔

'خان گل بکاؤ مال نہیں۔ یہ واپس رکھ لو۔ نہیں رکھ سکتیں تو کوئی اور آدمی ڈھونڈ لو اس کام کے لئے۔ کوئی باپ اپنی بیٹی سے پیسہ نہیں لیتا۔'

گوہر نے بھیگی آنکھوں کیساتھ نوٹ دوبارہ پرس میں رکھ لئے۔ خان گل نے اسکے سر پر ایسے ہاتھ رکھا جیسے وہ اسی کی اپنی بیٹی ہو۔

'میرا کام ہوا یا نہیں؟' شاہ گوہر کے دفتر میں تھا۔

'لگتا ہے ای میل نہیں دیکھی تم نے۔۔ جاؤ پہلے اسے پڑھو۔ پھر آنا مگر گرما گرم دودھ پتی کے ساتھ!' گوہر بولی۔

دو ای میل تھیں۔ ایک گوہر نے لکھی تھی ڈونر کو۔ اس میں لکھا تھا کہ آڈیوز جعلی تھیں۔ دوسری ڈونر کا جواب تھا جس میں اسنے اظہار اطمینان کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دودھ پتی سمیت گوہر کے کمرے میں تھا۔

'بہت عمدہ بھئی! بہت نام سنا تھا شیدے کی دودھ پتی کا۔ میں پہلی بار ٹرائی کر رہی ہوں۔ سب ہی لوگ اس دودھ پتی کی تعریف کرتے تھے۔ آج پتہ لگ گیا کیوں کیا کرتے تھے۔' گوہر نے پہلی چسکی لیتے ہی کہا۔

'آج شام ملیں لو سپاٹ پر؟' گوہر نے شاہ سے پوچھا۔

یہ ایک خاص جگہ تھی پہاڑوں کے بیچ۔ ویران سنسان۔ چھپ کر پیار کرنے والوں کے لئے آئیڈیل! یہاں کئی ایسے مقامات تھے جہاں دو انسان دنیا والوں کی نظروں سے دور اپنا ایک جہاں کافی دیر کے لئے کامیابی سے بنا سکتے تھے۔ گوہر، ریٹا اور شاہ کئی بار یہاں آ چکے تھے اور تینوں میں سے کوئی بھی مایوس نہیں لوٹا۔ دفتر سے بہت زیادہ دور بھی نہ تھی۔ شاہ کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔

'کیوں نہیں۔۔ وہاں کتا بننے کا مزا ہی کچھ اور ہے!' شاہ بولا۔

'سات بجے! میں انتظار کرونگی۔ لیٹ نہیں ہونا۔' گوہر بولی

'فکر نہ کرو ڈارلنگ میں پندرہ منٹ پہلے پہنچ جاؤنگا۔' شاہ نے کہا۔

شاہ وعدے کے مطابق پندرہ منٹ پہلے ہی لو سپاٹ پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ وہ ان تمام لمحات کو ایک ایک کر کے ذہن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے یہاں ریٹا، گوہر اور دیگر کئی دلرباؤں کے ساتھ گذارے تھے۔ یہ اس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔ ان کا تصور ہی اس پر نشہ طاری کر رہا تھا۔ ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں جیتی جاگتی تصویر کی طرح اتر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور اسکی خوشبو ان مناظر کا حسن دوبالا کر رہی تھی۔ اچانک ایک بھاری بھرکم پتھر اسکے سر پر گرا۔ لمحے بھر میں وہ خون

میں نہا گیا۔ شاید یہ پتھر پہاڑوں سے لڑھکتا آ گیا ہو اپنی اصلی جگہ سے ہل کر؟ ایسا یہاں ہوتا رہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتا ایک اور پتھر اس کے سر پر گرا۔ پل بھر میں اسکا بھیجہ کھوپڑی سے جدا تھا۔

'حرامی، خنزیر!' خان گل نے اپنے آپ سے کہا۔ اطمینان سے ایک چاقو جیب سے نکالا۔ شاہ کی پتلون کے بٹن کھولے۔ اس کا عضوتناسل کاٹ کر اسکے منہ میں ٹھونس دیا جیسے کسی کا منہ بند کرنے لئے کپڑا ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا اور ہوا تیز ہو رہی تھی۔ یہ وقت تھا گھر لوٹنے کا۔ پرندے بھی قطار در قطار گھر جا رہے تھے۔ خان گل نے جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالی۔ ایک گولی بنائی۔ منہ میں رکھی اور گاڑی کی طرف بڑھ دیا۔

'میں نے کہا تھا نہ میں اکیلا ہی کافی ہوں؟ خان گل اللہ کے بعد صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرتا ہے بیٹی!' گوہر کے آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ ایسا صرف ایک سگا اور انتہائی پیار کرنے والا باپ ہی کر سکتا تھا۔

'اپنی بیٹی کی ایک اور فرمائش پوری کر دو۔ انکار نہیں کرنا۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ اسے قبول کر لو!' گوہر نے نوٹوں کی وہی گڈی خان گل کی طرف بڑھا دی جو وہ اسے چند روز قبل واپس کر چکا تھا۔ خان گل کے پاس اسے قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنی بیٹی کو کون ناراض کر سکتا تھا؟

شاہ کی مسخ شدہ لاش تین دن بعد ملی۔ جنگلی جانور اسکے جسم سے سارا گوشت نوچ کر کھا چکے تھے۔ اسکے بٹوے میں موجود شناختی کارڈ سے لاش کی شناخت کی ہوئی۔

'آپ نے یہ خبر دیکھی؟' ساجد نے اخبار گوہر کے سامنے رکھتے کہا۔

'ہاں دیکھی۔ ویری سیڈ!' گوہر نے کہا۔

I am not sad at all. The pig deserved it!

ساجد نے کہا۔ پھر ایک اور جملے کہہ کر باہر نکل گیا۔

'گڈ جاب گوہر!'

گوہر اس جملے غور کرتی رہی۔ پھر خود ہی ہنس دی۔ ساجد کا مطلب تھا کہ اس سور کے بچے کے ساتھ جس نے بھی یہ کیا بہت اچھا کیا!

'فرید اور فرقان کو کہو مجھ سے ملیں۔' گوہر نے انٹرکام پر بلقیس سے کہا۔ دونوں چند لمحوں میں حاضر ہو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ فق تھا۔

'اپنے اپنے استعفی لکھو اور مجھے ای میل کرو۔ وجہ میں لکھو "ذاتی وجوہات "۔ ایک مہینے کا نوٹس دو۔ یہ کام اگلے پندرہ منٹ میں ہو جانا چاہیے!' گوہر نے ان دونوں سے کہا۔

'جی میڈم جی میڈم۔۔۔' اس سے زیادہ کہنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی۔ دل ہی دل میں شاہ کو گالیاں دیں اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ برطرفی کا پروانہ ہاتھ میں نہیں تھما دیا گوہر نے!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد گوہر نے ایک ای میل لکھی۔ ٹو والے خانے میں اس نے ریٹا، بلقیس، ساجد، ذکیہ، حیدر اور ڈاکٹر صاحب کا نام لکھا۔ سبجیکٹ میں:

'اگر دودھ پتی کا موڈ ہو تو دس منٹ بعد ڈھابے پر پہنچ جائیں!'

باب 20

ویب میگزین

شہباز کو اپنے ایڈیٹر کی ای میل پڑھ کر شدید مایوسی ہوئی۔ اس نے بڑی محنت سے مولانا ابدالی کے بارے میں ایک مضمون تیار کیا تھا۔ ہر چیز مدلل انداز میں بیان کی۔ پھر بھی مدیر نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ اس کا برسوں پرانا دوست تھا۔

نہ چھاپنے کی وجہ یہ کہ اس کے پرچے کی پالیسی یہ تھی کہ این جی اوز، مشنری، سول سوسائٹی، ڈونرز اور عورتوں کے خلاف کچھ نہیں چھاپا جائے گا۔۔ بھلے وہ کتنا ہی بڑا سچ ہو۔ لیکن آزاد صحافی ہونے کا ایک فائدہ تو اسے ہمیشہ رہا۔ اگر ایک اخبار نہیں چھاپ رہا تو دوسرا یا تیسرا چھاپ ہی دیتا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے ایک اور ایڈیٹر دوست کو فون کیا اور مضمون کا خلاصہ بیان کیا۔ اس دوست نے بھی چھاپنے سے معذرت کر لی۔

اس کا موقف بھی وہ ہی تھا۔ شہباز نے یکے بعد دیگرے تین اور ایڈیٹرز کو فون کئے۔ سب نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ہر فون کے بعد اس کی مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب اسکے پاس ایک ہی چارہ تھا۔ وہ بڑے بڑے اخبارات یا میگزین کے بجائے اردو پریس میں جائے اور دوسرے یا تیسرے درجے کی پبلی کیشن میں یہ مضمون بھیجے۔

ویسے تو مولانا ابدالی کی جماعت کا اپنا ایک اخبار تھا مگر وہ جماعت کا ترجمان تھا۔ اور تھا بھی اردو میں۔ شہباز نے ساری عمر انگریزی میں لکھا اور وہ بھی ٹاپ کلاس ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں۔ غیر ملکی پبلی کیشن اسے نہ چھاپے گی کیونکہ موضوع لوکل تھا۔ وہ اپنے لیول سے نیچے آنا نہیں چاہتا تھا۔ یعنی کسی چھیتھڑے اخبار تک۔ اسکے ذہن میں رابعہ کا خیال آیا۔ جھٹ سے اسے فون لگایا۔

'ہیلو شہباز۔ ہاو آر یو؟' رابعہ نے کہا۔

'میں ٹھیک ہو۔ کام کیسا چل رہا ہے؟' شہباز نے پوچھا۔

'میں نے استعفی دے دیا ہے۔ آجکل کچھ نہیں کر رہی۔ بس گھر پر ہوتی ہوں۔ کتابیں پڑھتی ہوں۔' رابعہ نے کہا۔

'کیوں؟' شہباز نے پوچھا۔ رابعہ کا استعفی معمولی بات نہ تھا۔

'میں نے ایک فیچر لکھا تھا کہ کس طرح این جی اوز کے سربراہ ٹیکس چوری کرتے ہیں۔ این جی اوز پرائیویٹ کنسلٹنسیز کرتی ہیں۔ ان پراجیکٹس کو لینے کے لئے وہ اپنے آپ کو بطور کارپوریٹ سیکٹر متعارف کراتی ہیں۔ جب پیسہ مل جاتا ہے اور ٹیکس ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو اپنے آپ کو نان پرافٹ تنظیمیں ڈیکلیر کر دیتی ہے اور این جی او کی آڑ میں ٹیکس چوری کرتی ہیں۔ جب اس فیچر کی کاپی ایڈیٹر کو گئی تو اس نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اسکی وجہ یہ کہ ہم لبرل پیپر ہیں۔ این جی اوز ہی تو اس ملک میں کچھ کام کر رہی ہیں۔ سرکار تو اوپر سے نیچے تک کرپٹ ہے۔ این جی اوز نہ ہو تو ملک کا مکمل ستیاناس ہو جائے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا اور اخبار کے مالک سے بات کی۔ مجھے دکھ ہوا کہ اس کی بھی یہ ہی سوچ تھی۔ اس نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ بی بی این جی اوز مغرب کا ایجنڈہ ہے۔ ہمارے اخبار کو مغرب کے سفارتخانوں سے گرانٹ ملتی ہے۔ اس لئے ہماری مجبوری ہے۔' رابعہ نے کہا۔

'تو پھر زینت والا فیچر کیسے چھپ گیا؟ اسے کیوں جانے دیا تمہارے مالک اور مدیر نے؟'

'جب زینت والا فیچر چھپا اسوقت اونر اور ایڈیٹر ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے ملک سے باہر تھے۔ مزے کی بات یہ کہ کانفرنس آزادی صحافت پر تھی۔ انکی غیر موجودگی میں میں ہی ایکٹنگ ایڈیٹر تھی۔ اس لئے وہ آرام سے چھپ گیا۔ مگر بعد میں مجھے کافی باتیں سننا پڑیں۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ اگر تم ساتھ دو تو یہ حقیقت میں بھی بدل سکتا ہے۔' رابعہ نے کہا۔

'اپنا خبار نکالنا چاہتی ہو؟' شہباز نے اندازہ لگاتے کہا۔

'اخبار نہیں ویب میگزین۔ اخبار نکالنا اب حماقت ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سب اخبارات سکڑیں گے اور سائز میں آدھے رہ جائیں گے۔ اس کے بعد انکا پرنٹ ایڈیشن بھی بند ہو گا اور یہ مکمل ویب پیپر بن جائیں گے۔' رابعہ نے کہا۔

'تم درست کہہ رہی ہو۔ امریکہ اور برطانیہ میں تو کئی بڑے پیپرز اب صرف انٹرنیٹ پر ہی دستیاب ہیں۔ فری نہیں۔ سبسکرائب کرنا پڑتا ہے۔ زبردست آئیڈیا ہے۔ ہمیں کسی کی محتاجی نہیں رہے گی۔ مایوسی بھی نہیں ہو گی۔ اتنا سر کھپاؤں اور دو ٹکے کا ایڈیٹر چھاپنے سے انکار کر دے۔ اور یہ بہت کم سرمائے سے ویب میگزین شروع کیا جاسکتا ہے۔ میرے تمہارے جیسے بہت سے ہونگے جن کا کام رد کر دیا جاتا ہو گا۔ ہمارا ویب میگزین انہیں ایک منفرد پلیٹ فارم مہیا کرے گا۔ اس طرح چند ماہ میں ہی ہم ایک اچھی ٹیم تیار کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔' شہباز جوش وخروش سے بات کر رہا تھا۔

'تو پھر ہمیں جلد از جلد ملنا چاہیے۔ تم کسی دن میرے گھر آجاؤ۔ میرے والدین بہت خوش ہونگے تم سے ملکر۔ بلکہ ایسا کرو اس سنڈے آجاؤ شام چھ بجے۔' رابعہ نے کہا۔ شہباز نے ملنے کی حامی بھر لی۔ وہ اپنے مضمون سے اس ویب میگزین کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ رابعہ اور وہ ملکر بہت کچھ کر سکتے تھے۔ یہ میگزین اسکی نظر میں ایک اچھا آغاز تھا۔

باب 21

خواب یا حقیقت؟

'یار یہ مینا کیوں ناراض ہے تم سے ؟ تمہاری تو اچھی خاصی دوستی تھی اس سے۔ تم دونوں سب سے پرانے ممبر ہو اس ادارے کے۔' نپولین نے شہباز سے کہا۔ وہ خود چل کر شہباز کے کمرے میں آیا تھا۔ پورے دفتر میں صرف دو آدمیوں کے پاس اپنا علیحدہ کمرہ تھا جسے وہ لاک کر کے جاسکتے تھے۔ ایک نپولین اور دوسرا شہباز۔

مینا عہدے میں شہباز سے بہت سینئر تھی لیکن وہ بھی ایک عام سے کیبن میں بیٹھا کرتی تھی۔ نپولین نے شہباز کو علیحدہ کمرہ جو کہ چھوٹا سا تھا یوں دیا ہوا تھا کہ اسکا کام تخلیقی انداز کا تھا۔ اس نے ادارے کے حوالے سے کئی موضوعات پر ایسے مضامین لکھنے ہوتے تھے جنہیں سوچنے اور کرنے کے لیے لکھاری کو خاموشی درکار تھی۔ اس بات کی بہت جلن تھی دوسروں کو۔

'آپ ایمانداری سے بتائیے کہ جو کام اس نے میرے متھے مارا کیا وہ اس کا تھا یا میرا؟ نیز میری اس سے دوستی کبھی بھی نہیں رہی۔ ایک کولیگ کا رشتہ رہا ہے۔ سب کو پتہ ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتی اور میں اسکا دلدادہ نہیں۔ میں تو آپکے منہ پر ہمیشہ یہ ہی کہتا ہوں کہ آپ نے اسے جنرل مینیجر بنا کر گدھے اور گھوڑے کا فرق ہی مٹا دیا۔ کہاں شہسوار، اس کا سابقہ باس اور کہاں یہ! پہلے یہ کام کیا کرتی تھی۔ اب رعب جھاڑتی ہے۔ اور میں نے آپ کو پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ میں ادارے میں آپ کے علاوہ کسی اور کو رپورٹ نہیں کرونگا۔ کل کلاں آپ چلے گئے تو میں بھی چلا جاؤنگا۔ اس ادارے میں دو ہی کام کے بندے ہیں۔ ایک آپ اور دوسرا شہسوار۔ باقی سب ٹٹ پونجیے ہیں۔ سال بھر سے زیادہ کوئی یہاں نہیں ٹکتا۔' شہباز کھل کر بولا۔

نپولین اس کا باس ہی نہیں دوست بھی تھا۔ پہلے سے دوست نہ تھا۔ لیکن ساتھ کام کرتے کرتے دونوں اتنے گھل مل چکے تھے کہ دوست ہی بن گئے۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا دونوں کا۔

'تم درست کہہ رہے ہو۔ میں نے بھی محسوس کیا ہے اب مینا کام میں دلچسپی کم لیتی ہے۔ خیر تمہیں تو پتہ ہے میرا اسٹائل۔ اگر آسمان پر چڑھاتا ہوں تو اچانک سیڑھی کھینچ کر گرا بھی دیتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اس کی طبعیت میں صاف کر دونگا۔ آئندہ وہ کبھی تمہیں کوئی کام اسائن نہیں کرے گی۔' نپولین یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اسکی ای میل آئی جو اسنے مینا کو لکھی

تھی۔ شہباز کو سی سی تھی۔ سخت ای میل تھی جس میں سیدھے الفاظ میں مینا کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ ادارے کے سربراہ کے سٹاف کو اپنا ماتحت نہ سمجھے اور اپنے کام پر دھیان دے۔

اس ای میل نے شہباز کو عجیب شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ اگر نپولین اور مینا کا کوئی ٹانکہ ہے تو یہ ای میل اسکی نفی کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن پھر نپولین اور مینا کیوں اس دن کافی شاپ میں اکھٹے ایک وقت میں داخل ہوئے تھے۔ نپولین کو تو بخار تھا۔ اور مینا کو انتہائی ارجنٹ پروپوزل پر کام کرنا تھا۔ مگر دونوں توڈیٹ مار رہے تھے۔ شہباز سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے کھلی آنکھوں سے اس دن اک سپنا دیکھا۔ خواب دیکھنے کی عادت تو اسے تھی ہی۔ لیکن وہ دونوں مینا اور نپولین ہی تھے۔ نپولین غزالہ سے اور غزالہ نپولین سے ہمکلام بھی ہوئے تھے۔ غزالہ تو خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب ہر گز نہ تھا۔ جو بھی تھا سو فیصد حقیقت تھی جو جھٹلائی نہ جا سکتی تھی۔

باب22

سہاگ رات؟

رانی اور افسانے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ آج رانی نے خود مٹن کڑھائی بنائی تھی جو میکس کو بہت پسند تھی۔ آج رات افسانے کو رانی کے گھر پر ہی رہنا تھا۔ اس نے ماں کو بتا دیا تھا کہ ابا کو بات اچھی طرح سمجھا دے۔ ماں کو بھی اپنے خصم کو ہینڈل کرنا آتا تھا۔ ویسے وہ تھا بھی اللہ میاں کی گائے مگر دوسرے کام میں سانڈ! خوش ہوا کہ چلو بیٹی تو ہے نہیں گھر پر۔ آج اپنی سہاگ رات کی یادیں تازہ کرے گا۔ بوبی کو شمیم کے گھر بھیج دیا تھا دونوں نے۔ اب وہ گھر پر اکیلے تھے۔

رانی کے ہاتھ کی مٹن کڑہائی کمال کی تھی۔ افسانے نے چکھی تو اندازہ ہوا کہ اسکی باس زبردست کک تھی۔ ہر چیز پرفیکٹ تھی اس کی کڑھائی میں۔

'افسانے بیٹا دیکھ صاف صاف بتا دے مجھے!' رانی اب اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو چکی تھی۔ کبھی اسے بیٹا اور کبھی یار کہا کرتی۔ ویسے بھی عمر میں اسکی ماں سے کئی برس بڑی تھی۔

'رانی کتنی بار پوچھیں گی آپ؟ بتا تو دیا کہ پہلی بار ہو گا۔۔۔'

'تو ہینڈل کر لے گی نہ؟'

'فکر نہ کیجئے۔ یہ بیٹی آپکو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔'

'بس تجھے کوئی تکلیف نہ ہو!' رانی نے کہا۔

'کونسی راحت ایسی ہو گی جس میں درد نہ ہو۔ عورت بچہ جنم دیتی ہے۔ کتابوں میں پڑھا ہے بہت تکلیف میں ہوتی ہے۔ پھر جب ایک نئی زندگی وجود میں آتی ہے تو وہ سب درد، دکھ، تکلیف بھول جاتی ہے۔' افسانے نے رانی کو اطمینان دلاتے کہا۔

'تو بہت ذہین ہے۔ مجھے تجھ سے بات کر کے بہت خوشی ہوتی ہے۔ تو مجھے میری فرح کی یاد دلا دیتی ہے۔ وہ بھی تیری طرح ذہین ہے۔' رانی کی آنکھوں میں یہ بات کرتے آنسو آ گئے۔

'فرح کون ہے؟'

'میری بیٹی۔ تجھ سے کوئی دس برس بڑی ہو گی۔ آسٹریلیا میں رہتی ہے۔ دو بیٹے ہیں اسکے بڑے پیارے۔'

'تو آپ نانی بھی ہیں! کمال ہے۔ آپ تو ابھی لڑکی کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔۔۔' افسانے نے کہا۔ اسی دوران گھنٹی بجی۔

'لو میکس آ گیا!' رانی نے کہا۔ افسانے نے دروازہ کھولا۔ وہ ہی تھا۔

'ہیلو میکس!'

'ہیلو سوئٹ ہارٹ۔ یو آر لکنگ گریٹ!' میکس نے افسانے پر پہلی نظر ڈالتے ہی کہا۔ وہ لگ بھی بہت حسین رہی تھی۔ لیمن کلر کا کرتا اور اسکے نیچے چوڑی دار پاجامہ۔ میکس وائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ میں انتہائی ہینڈسم لگ رہا تھا۔

'تھینکس میکس!' افسانے نے کہا۔

'ہیلو سیکسی! اس نے رانی کی طرف دیکھتے کہا جو ہاف سلیو بلیک شرٹ اور سفید سکرٹ میں تھی۔

'ہیلو میکس۔ آج میں نے تمہاری پسندیدہ ڈش مٹن کڑاہی بنائی ہے خود۔ مصالحے دار۔ خوش ہو جاؤ گے!' رانی بولی۔

'رانی کے گھر سے میکس کبھی ناخوش نہیں لوٹا!' میکس نے کہا اور ایک قہقہہ بلند کیا۔

گھر کا ماحول، کھانا، ڈرنکس، میوزک اور باتیں سب ملکر ایک یادگار شام کی صورت میں ڈھل چکے تھے۔ رات ابھی جاگ رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انسان نہ چاہتے ہوئے بھی محفل چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ محفل ابھی ادھوری تھی۔ ان یادگار لمحات کو ایک ناقابل فراموش رات میں ڈھلنا باقی تھا۔ میکس نے رانی کے گھر ہی قیام کرنا تھا۔ وہ ایسا اکثر کرتا تھا۔ اسکے لئے رانی نے ایک کمرہ مختص کر رکھا تھا۔ آج اس کمرے کی سج دھج ہی کچھ اور تھی۔ بستر پر چاندنی جیسی چادر بچھی ہوئی تھی اور اسکے اوپر جابجا گلاب کی پتیاں بکھری ہوئیں تھیں۔ کمرہ حجلہ عروسی دکھائی دے رہا تھا۔

'تم ایزی ہو جاؤ میں آتی ہوں۔' رانی نے میکس کو اسکے کمرے میں چھوڑتے کہا۔'

'یس یس!' میکس نے کہا۔ وہ ہلکا سا نشے میں دھت بھی تھا۔

'افسانے بیٹا۔۔۔ سنبھال لے گی نہ اس گورے کو؟ تجھے تو تیرنا بھی نہیں آتا اور بپھرے ہوئے سمندر میں اتر رہی ہے!' رانی نے کہا۔

'فکر نہ کریں۔ اس بپھرے ہوئے سمندر کو مر دار نہ کیا تو میرا نام بھی افسانے نہیں!'

'شاباش میری شیرنی۔ بیسٹ آف لک!' رانی نے کہا اور افسانے کمرے کے اندر چلی گئی۔

رانی کچھ کچھ فکر مند تھی۔ وہ کمرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسکے ذہن میں ان گنت خیالات تھے جن کا سلسلہ ایک شور نے توڑ دیا۔ سمندر کی طوفانی موجیں ایک جوان

چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ سمندر چٹان کو گرانا چاہ رہا تھا۔ چٹان ڈٹ کے اس کا مقابلہ کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو آ دکھا مجھے گرا کر۔ یہ شور تھمنے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی ایسا لگتا کہ سمندر چٹان کو بہا کر لے جائیگا۔ سمندر بہت طاقتور ہوتا ہے۔ کتنا بڑا بحری جہاز ٹائی ٹینک اس نے منٹوں میں نگل لیا جس کے بنانے والوں کا دعوی یہ تھا کہ یہ ڈوب ہی نہیں سکتا۔ اپنے پہلے ہی سفر میں غرق ہو گیا۔ کس کی مجال کہ سمندر سے ٹکر لے۔ بڑے سے بڑا پیراک بھی کتنی دیر تیر سکتا ہو گا؟ ایک گھنٹے یا دو گھنٹے۔۔۔ اس سے زیاہ کیا ممکن تھا؟

کبھی ایسی آوازیں آتیں جیسے آج سمندر کمزور پڑ رہا ہے۔ لیکن وہ پھر سے چٹان پر چڑھ دوڑتا۔ یہ سلسلہ قریب ایک گھنٹا جاری رہا۔ اسکے بعد لہریں شانت ہو گئیں۔ چٹان قائم رہی! رانی کو سکھ کا سانس نصیب ہوا۔ اب وہ بھی بہت تھک چکی تھی۔ اپنے بستر پر جا کر گر گئی۔ نہ جانے کب تک سوتی رہی۔ جب اٹھی تو صبح ختم ہو چکی تھی۔ دوپہر جنم لے رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ میکس کے کمرے کی طرف گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ گلاب کی پتیاں ہر جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ تازہ تھیں۔ کچھ مسلی جا چکیں تھیں۔ بستر کی چادر میٹرس سے آدھی سے زیادہ اتر چکی تھی۔ رانی کمرے سے لاونج کی طرف بھاگی۔ دل کو تسلی ہوئی۔ میکس اور افسانے ناشتہ کر رہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی بیدار ہوئے ہیں۔

'آؤ رانی! تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا ابھی۔ ناشتہ کرو۔ افسانے نے خود بنایا ہے۔ بہت مزے کا پراٹھا ہے!' میکس نے کہا اور رانی نے افسانے کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملا کر مسکرا رہے تھے۔ ساتھ ہی میکس بھی کسی شرارتی بچے کی طرح مسکرا رہا تھا۔

'افسانے تو نے مجھے بہت مایوس کیا۔۔۔' رانی نے افسانے سے ڈرامائی انداز میں کہا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ 'کیا ہوا رانی؟ کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟'

'غلطی تو چھوٹی سی چیز ہے۔ تو نے مجھے دھوکہ دیا!' رانی بولی۔

'کیسا دھوکہ؟ ناممکن! میں آپکو اپنی ماں سے بڑھکر سمجھتی ہوں۔ آپکو دھوکہ نہیں دے سکتی!'

'مجھے معلوم ہے اور یقین بھی ہے!' رانی نے کہا۔

'توں پھر ایسا کیوں کہا آپ نے؟'

'بس تو نے ایک جھوٹ بولا مجھ سے۔ وہ اچھا نہیں لگا۔ وعدہ کر آئندہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گی!' رانی نے کہا اور اس جملے پر افسانے کو اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جب اس کی ماں نے ایسا ہی وعدہ لیکر پوچھا تھا کہ اس کے پاس پچاس ہزار روپے کیسے اور کیوں آئے۔ اس نے سچ بولا اور ماں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

'اپنی ماں اور بوبی کی قسم جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں، میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔'

'تو پھر ایک سوال کا جواب دے!'

'پوچھیے!'

'اس دن جب میکس اور تم لاونج میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔۔۔' رانی یہ کہہ کر رکی۔

'جی۔۔۔!' افسانے نے کہا۔

'میں میکس کے کمرے میں گئی تھی۔۔۔' اس نے کہا اور پھر رک گئی۔

'جی!' افسانے نے کہا۔

'کمرہ خالی تھا۔ تم لوگ نیچے تھے۔ میں کمرے کو خالی دیکھ کر فوراً نیچے نہیں آئی تھی۔ میں اندر گئی۔ چادر کو اچھی طرح بستر پر بچھا کر اس کا بغور معائنہ کیا۔ وہ تیرے بدن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ لیکن تھی بالکل صاف ستھری، شفاف جیسے ابھی لانڈری سے دھل کر آئی ہو۔ یا اگر دھل کر نہیں تو ابھی ابھی بازار سے خریدی گئی ہو اور اسے بچھا دیا گیا ہو۔ نہ کوئی دھبہ نا کوئی داغ۔ بس شکن آلود تھی۔ اس پر کوئی داغ یا نشان کیوں نہ تھا؟' رانی نے اسکی آنکھوں کی طرف دیکھتے کہا۔ افسانے اس سے نظریں نہ ملا سکی۔

'پریشان مت ہو یار۔ حمام میں سب ننگے ہیں!' رانی نے کہا اور پھر رک گئی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ افسانے بھی کچھ نہ بولی۔

'تو نے تو کہا تھا کہ تیرا پہلا تجربہ ہے۔ میکس بہت تجربہ کار ہے۔ اس نے مجھے کچھ اور بتایا۔ اب تو بتا کہ راز کیا ہے؟' رانی نے آنکھ مار کر پوچھا تا کہ گفتگو جو کافی سنجیدہ اور افسانے کے لیے پریشان کن ہوتی جا رہی تھی کچھ ہلکی پھلکی ہو جائے۔

'ہاں میں نے جھوٹ بولا تھا۔ آئی ایم سوری دراصل۔۔۔'

'سوری کی کوئی بات نہیں۔ ماں بیٹی میں کیا سوری!' رانی نے افسانے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

'دراصل پہلا تجربہ نہیں تھا!'

'وہ تو مجھے پتہ ہے۔ کون تھا وہ؟'

'کیا سب کچھ بتانا ضروری ہے رانی؟'

'چل نہ بتا۔ لیکن مجھے پتہ ہے کون تھا!'

'کون؟'

'کون ہو سکتا ہے بوبی کے علاوہ؟' رانی نے یہ کہہ کر افسانے کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اندازہ سو فیصد درست تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

'تیری خاموشی میرے اندازے کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے افسانے!'

'آپ کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ بوبی ہی تھا۔ تھا کیا۔۔ وہ ہے اور ہمیشہ رہے گا!'

'کتنی بار؟' رانی نے کریدا۔

'بس ان دنوں کو چھوڑ کر تقریباً روز ہی!' افسانے نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔

'کب سے؟'

'سال تو ہو چکا ہے۔' افسانے نے اسی جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

'کچھ ہوا تو نہیں اس عرصے میں؟' رانی کو اب لطف آ رہا تھا سوال کرنے میں۔

'سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بوبی لائف جیکٹ پہنے بغیر کبھی پانی میں نہیں کودتا!' افسانے نے کہا اور رانی نے بے ساختہ ایک قہقہہ بلند کر دیا۔

'اچھا جہاں اتنا سچ بتا دیا وہاں ایک اور بھی بتا دے۔۔۔'

'اب میرے پاس چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔۔۔ پوچھیے!'

'میکس بہتر تھا یا بوبی۔۔۔ صاف صاف جواب چاہیے۔ گھمانا پھرانا مت!' رانی اب مکمل شرارتی موڈ میں تھی۔

'ہوں۔۔۔ بہت مشکل میں ڈالدیا آپ نے! میکس منہ زور گھوڑا تھا۔ بوبی بے بی ہارس ہے! دونوں کی سواری کا موازنہ کرنا ناانصافی ہے۔ دونوں کا اپنا اپنا مزہ ہے۔ کیا خیال ہے؟'

'مجھے تجھ سے ایسے ہی دانشورانہ جواب کی توقع تھی۔ شاباش۔ ویسے مجھے بھی کافی ٹائم ہو گیا بے بی ہارس کی سواری کیئے۔ تیری بات سن کر اب دل مچل رہا ہے۔ لا سکتی ہے کسی دن بوبی کو؟' رانی نے پہلا جملہ مسکراتے ہوئے اور آخری دو انتہائی سنجیدہ انداز میں کہے۔

افسانے فوراً بھانپ گئی کہ اس کی باس مذاق نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جواب تلاش کر رہی تھی۔ اسے یہ پتہ تھا کہ انکار کا مطلب گھر آئی لکشمی سے ہاتھ دھونا تھا۔ انتہائی تیزی سے سوچنا اس کی ڈھیر ساری خداداد صلاحیتوں میں سے ایک تھا۔ پل پر میں وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بوبی کو رانی کا شاگرد بنانا سب ہی کے مفاد میں ہو گا۔ پھر مشق تو ایک ہی

ہے۔ تختہ مشق افسانے کے بجائے رانی بن جائے گی۔ اور کیا ہی خوب ہو اگر دونوں ایک ساتھ بن جائیں!

'رانی۔۔بوبی میرے بغیر نہیں مانے گا۔۔۔'

'تیری موجودگی میں تو مانے گا۔۔۔'

'جی!' افسانے نے کہا۔

'تو پھر دونوں تختہ مشق بن جائینگے۔ دیکھتے ہیں کس کا تختہ ہوتا ہے!' رانی نے شرارتی انداز میں قہقہہ بلند کیا جس پر افسانے بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ حیران تھی کہ "تختہ مشق" ایک ہی لمحے میں دونوں کے ذہن میں کوندا۔ اسے لگا وہ رانی کا دوسرا جنم ہے۔

'اچھا یہ بتا بوبی کے علاوہ بھی ہے کوئی؟'

'ماریہ ہے!' افسانے نے کہا۔

'او۔۔۔مجھے پہلے ہی شک تھا!' رانی نے کہا۔

'کیوں؟'

'بھئی میں اسے بیس برس سے جانتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے تو میرا دوسرا جنم ہے افسانے!'

یہ بات کہہ کر رانی افسانے کو ایک بار پھر حیراں کر چکی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی تھی، رانی اسے حرف بہ حرف دہرا رہی تھی؟

'میں کیسے آپ کا دوسرا جنم ہوں؟' افسانے نے پوچھا۔

'جو تو اس وقت مجھے بتا رہی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے تو نے میری زندگی کا سکرپٹ کہیں سے حاصل کر لیا ہے اور تو اسے میرے سامنے پڑھ رہی ہے۔۔۔'

'سچ!' افسانے نے پوچھا۔

'میں جھوٹ نہیں بولتی!' رانی نے کہا۔

'آپکو کسی قسم کا پچھتاوا ہے؟' افسانے نے پوچھا۔

'ہرگز نہیں۔ بس اپنے بھائی کے بچھڑنے کا دکھ ہوتا ہے۔'

'آپ نے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔۔۔'

'میری ان سے طلاق ہو گئی تھی۔'

'وجہ؟'

'عدیل!'

'کیا مطلب؟ انہیں بھی پتہ لگ گیا؟' افسانے نے پوچھا۔

'ہاں! ایسی چیزیں لمبے عرصے تک چھپ سکتی ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں!'

'انہیں کیسے پتہ چلا؟'

'جیسے عدیل کی بیوی کو پتہ چلا۔۔۔'

'اس نے تو آپ دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔'

'ایسے ہی میرے شوہر نے بھی دیکھ لیا تھا۔' رانی نے کہا۔ وہ غمزدہ لگ رہی تھی۔

'پھر کیا ہوا؟'

'مجھے طلاق دے دی اور فرح کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آسٹریلیا چلا گیا۔'

'فرح کتنی بڑی تھی اس وقت؟'

'دس برس کی!'

'اسے معلوم ہے؟'

'شاید۔۔۔ کیونکہ مجھ سے نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے باپ نے سب کچھ بتا دیا ہو۔'

'پھر آپکو کیسے پتہ چلا کہ دو بیٹے ہیں؟'

'کبھی کبھار اس کا باپ فون کر لیتا ہے۔ اب تو فیس بک پر ہے فرح۔ بہت خوش ہے!'

'آپ اس وقت بہت اداس ہیں۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ آپکو کوئی افسوس نہیں۔ کوئی پچھتاوا نہیں۔'

'میں نے زندگی میں کبھی بھی کسی چیز پر رگریٹ نہیں کیا افسانے۔ چاہے بڑا سے بڑا نقصان ہو جائے، اسے بھول کر آگے بڑھنا چاہیے۔ ایسے ہی تو غالب نے نہیں کہا کہ: یاد ماضی عذاب ہے یارب، چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔ میری تجھے بھی یہ ہی نصیحت ہے۔ کسی چیز کا غم نہ کرنا۔ زندگی پچھتاوے کے ساتھ گذاری تو ہر پل تکلیف دہ ہی پائے گی۔ یہ اداسی کی کیفیت چند لمحوں سے زیادہ نہیں طاری نہیں رہتی میرے چہرے پر۔ اداسی فرح کی وجہ سے تھی۔ باقی رہے دوسرے ایشوز۔۔۔ شوہر نے طلاق دے دی۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ شوہر تو ہزار مل سکتے ہیں، بھائی تو میرا ایک ہی ہے! اگر جیون میں شوہر یا بھائی میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو شوہر کو چھوڑ دینا۔' رانی اب اعتماد سے بول رہی تھی۔ اسکے چہرے پر چھائی اداسی غائب ہو چکی تھی۔

'آپ نے بھائی کی خاطر شوہر چھوڑ دیا لیکن عدیل نے بہن کے لئے بیوی نہیں چھوڑی۔۔'

'تجھے کس نے کہہ دیا کہ عدیل نے مجھے چھوڑ دیا؟ جب دل کرتا ہے ہم مل لیتے ہیں!' رانی نے کہا اور افسانے اک نئی سوچ میں گم ہو گئی۔

'زیادہ سوچے گی تو بڑھاپا جلدی آ جائے گا۔ یہ بھی سچ بتا رہی ہوں تجھے۔ چل آج لنچ باہر کرتے ہیں!'

باب 23

جنسی ہراسانی!

شہباز اور رابعہ ویب میگزین کے لئے کور سٹوری کا انتخاب کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کور سٹوری مولانا ابدالی کا تاریخی خطاب ہو جو اس نے اپنے حلقے میں کیا اور جسے کوئی بھی چھاپنے کو تیار نہ ہوا۔ رابعہ 'جنسی ہراسانی' کو بطور کور سٹوری شائع کرنے کے حق میں تھی۔ دونوں میں اسی معاملے پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ اچانک شہباز کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا: 'ان گشتیوں نے جنسی ہراسانی کو ایک کھیل سمجھا ہوا ہے!' لیکن اسے فوراً احساس ہوا کہ یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کم از کم رابعہ کے سامنے!

شرمندگی اسکے چہرے پر واضح تھی۔ ادھر رابعہ پتھر کی طرح جامد! وہ شہباز کو تکے جا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس قسم کی زبان کی امید اسے کم از کم شہباز سے نہ تھی۔

'میں بھی اس کا شکار ہو چکی ہوں۔ اور ایک نہیں کئی بار!' اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔

'آئی ایم سوری۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہ تھا۔ میں بھی اسکا شکار ہوا ہوں۔ لیکن مجھے نشانہ بنایا گیا۔'

'تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟' رابعہ نے اسے کریدا۔

'کچھ نہیں۔ چھوڑو۔ رات گئی بات گئی۔

'نہیں۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا تاکہ تمہارے اندر کا غصہ نکلے۔

'ایک انٹرن تھی۔ مشکل سے بیس برس کی ہو گی۔ آتے جاتے میرے کمرے میں آ جاتی۔ میرے مضامین کی تعریف کرتی۔ ایک دن اس نے اپنی کچھ رومانوی نظمیں مجھے دکھانا چاہیں۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ نظمیں ای میل کر دے۔ اس نے کر دی۔ یہ بتانے کے لئے کہ نظم کیسی ہونی چاہیے، میں نے جواباً اپنی چند رومانوی نظمیں ای میل کر دیں۔ اس نے جواب میں اپنی چند بولڈ تصاویر بھیجیں۔۔ اس فرمائش پر کہ میں ان پر کچھ نظمیں لکھوں! میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگلے دن نپولین نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ لڑکی نے میرے خلاف سیکسچول ہراسمنٹ کی شکایت کی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی تمام ای میلز بمعہ تصاویر میں نے نپولین کو فارورڈ کیں۔ اس کے بعد نپولین نے مجھے کہا کہ آل سٹاف کو ایک ای میل لکھو

اور یہ اناونس کرو کہ آج اس لڑکی کا دفتر میں آخری دن ہے اور چار بجے سب لوگ میٹنگ ہال میں آجائیں جہاں اسے ایک الوداعی پارٹی دی جائے گی!'

'یار نپولین کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ سب کا پردہ رکھتا ہے۔ وہ چاہتا تو اس لڑکی کا کیریئر خراب بھی کر سکتا تھا۔' رابعہ نے کہا۔ وہ کسی زمانے میں نپولین کے ساتھ کام کر چکی تھی۔

'اس بات کا غصہ ہے میرے اندر۔۔ کیسے لڑکیاں جنسی ہراسانی کا کارڈ کھیل کر کسی بھی مرد کو نوکری سے نکلوا سکتی ہیں۔ دراصل جنسی ہراسانی ایک استرا ہے عورتوں کے ہاتھ میں بندر کی طرح! بس الزام لگانے کی دیر ہے۔ رائے مرد کے خلاف ہو گی اور فیصلہ بھی مرد کے خلاف ہی ہو گا۔ میں نے اپنے کیریئر میں ایک نہیں درجنوں ایسے کیسز دیکھے جہاں عورتوں نے جنسی ہراسانی کو محض شغل کے لئے ایک کھیل کے طور پر کھیلا۔ ان کے اس کھیل نے کئی بے گناہ مردوں کا کیریئر ختم کیا۔

یہ سوچ کر مجھے ہمیشہ ڈیمی مور اور مائکل ڈگلس کی فلم ڈس کلوژر یاد آتی ہے۔ خاص طور پر ڈگلس کا ایک جملہ کہ جنسی ہراسانی تو وہ کرے جو پاورفل ہو۔ یعنی باس۔ ماتحت کیسے باس کو جنسی طور پر ہراس کر سکتا ہے؟ میرے ایک ادارے میں اس کے برعکس ہوا۔ مرد باس تھا۔ ایک شریف عورت اسکی سیکریٹری تھی۔ اس نے باس کو کوئی بھاؤ نہ دیا اور جنسی ہراسانی کی شکایت کر دی۔ واشنگٹن سے ٹیم آ گئی۔ لمبی چوڑی تحقیق ہوئی۔ ادارہ گوروں کا۔ کمیٹی میں گوریاں۔ بیانات ہوئے۔ گواہی عورت کے حق اور مرد باس کے خلاف آئی۔ پھر بھی لڑکی کو قصوروار قرار دیکر نوکری سے نکالا گیا۔ یہ تھی ایک جینڈر سینسی ٹیو مغربی ادارے کی حقیقت جو عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا علمبردار بنا پھرتا ہے۔ کئی جگہوں پر میرا تجربہ، تعلیم اور ہنر سب سے بہتر تھا مگر نوکری ہمیشہ لڑکی کو ملی جو ہر لحاظ سے مجھ سے پیچھے تھی۔ اور ایسی ہر لڑکی کا باپ یا انکل توپ شے ہوتا۔ ان لڑکیوں کو جاب قابلیت پر نہیں سفارش پر دی جاتی۔

کئی ادارے نوکری کے اشتہار میں یہ بھی لکھتے ہیں:

Women are highly encouraged to apply!

Preference will be given to women!

Only women may apply!

ایک طرف تو عورتیں یہ ڈھنڈورا کریں کہ ہم مردوں سے کم نہیں۔ ہمیں عورت نہیں مردوں کی طرح ٹریٹ کرو۔ مگر جہاں فائدہ نظر آ رہا تو وہ جھٹ سے "عورت ذات" بن جائیں گی۔ اس منافقت سے مجھے شدید نفرت ہے۔' شہباز کے لہجے میں شدید تلخی تھی۔

'آئی ایم سوری شہباز۔ تمہارا تجربہ تلخ رہا۔ اور یہ ہی تلخ حقیقت ہے۔ تم نے تصویر کے دونوں رخ دیکھے۔ میرے خیال میں کور سٹوری کے لئے مولانا ابدالی والا مضمون مناسب رہے گا!' رابعہ نے کہا اور شہباز مسکرا دیا۔

ویب میگزین بہت اچھا تجربہ رہا۔ اس نے اخبارات کی اجارہ داری اور مدیر کی فرعونیت کا خاتمہ کر دیا۔ سٹوری ہر گھنٹے بعد اپ ڈیٹ بھی ہو سکتی تھی۔ غلطیاں چھپنے کے بعد بھی درست کی جا سکتی تھیں۔ یوٹیوب میں یہ آپشن نہ تھی۔ ایک بار جو وڈیو اپ لوڈ کر دی اس میں اور اضافہ ناممکن تھا۔ نئی وڈیو اپ لوڈ کرو۔ نیا جھنجھٹ۔ ایک خطرہ اور بھی تھا۔ ویب ایڈیٹر اگر تجربہ کار اور سمجھدار نہ ہو تو ایسی چیزیں منظر عام پر آنے کا اندیشہ تھا جو فساد برپا دیں۔ ایسا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے رابعہ اور شہباز کو حد سے زیادہ محتاط رہنا پڑتا۔

'شہباز صاحب آپ کا مضمون میں نے بہت غور اور دلچسپی سے بڑھا۔ میری بیٹیوں نے بھی پڑھا۔ آپ نے جراتمندی سے این جی اوز کو بے نقاب کیا۔ حالانکہ یہ آپکا اپنا قبیلہ ہے۔ ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ یہ مضمون کسی اخبار میں کیوں نہیں چھاپا آپ نے؟' مولانا ابدالی نے پوچھا۔ اس نے آج شہباز کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔

'میں نے این جی اوز کے بارے میں ہمیشہ اچھی سوچ رکھی۔ بہت جذبے سے ان کے کام کو سراہا۔ بہت کچھ لکھا ان کے حق میں۔ لیکن ان کے ساتھ رہ رہ کر پتہ چل گیا انکی حقیقت کا۔ میرا آپکے بارے میں مضمون کوئی بھی چھاپنے کو تیار نہ ہوا۔ سب کے سب این جی اوز اور ڈونرز کے تنخواہ دار نکلے۔ اسے چھاپنے کا واحد حل یہ ویب میگزین ہی تھا۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ یہ دس لاکھ سے زیادہ لوگوں نے پڑھا اور آگے شئیر کیا۔ اگر کسی اخبار میں چھپتا تو ہزار لوگ بھی مشکل سے ہی پڑھتے۔' شہباز بولا۔

'آپ ہمیں کیوں نہیں جوائن کرتے؟ آپ میں بے پناہ ٹیلنٹ ہے۔ ہماری پارٹی کے ترجمان بن جائیں۔ اور یہ ہی کام ہمارے لئے کریں۔ ہم آپ کو سینیٹر بنا دینگے۔' ابدالی نے کہا۔

'مولانا صاحب یہ آفر کئی بار مختلف جماعتیں کر چکی ہیں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا پہلا اور آخری عشق لکھنا پڑھنا ہے۔ لیکن آپ کی آفر کا بہت بہت شکریہ۔'

'اچھا ایک کام تو آپ کر ہی سکتے ہیں۔۔۔' ابدالی بولا۔

'وہ کیا؟'

'آپ میری سپیچ لکھ دیا کریں!'

'مولانا صاحب آپ اتنے زبردست سپیکر ہیں۔ تقریر کے معاملے میں تو میں آپ کا فین ہوں۔ اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں لکھ دوں آپکی سپیچ۔ یہ تو ایسا ہے کہ سورج کہے موم بتی کو کہ مجھے کچھ روشنی ادھار دے دو! دوسرے اگر میں لکھ بھی دوں، آپ نے اسے سائیڈ پر رکھ دینا ہے اور اسکے بعد فی البدیہہ شروع ہو جانا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں میں نے کبھی کوئی کاغذ نہیں دیکھا۔ جملے خود بخود نکلتے ہیں آپ کے منہ سے۔ آپ پیدائشی مقرر ہیں۔' شہباز نے کہا اور ابدالی مسکرا دیا۔

'یہ ویلنٹائن ڈے آرہا ہے اگلے مہینے۔ این جی اوز کے پیٹ میں پھر مروڑ اٹھے گا اور اس کے حق میں بیان آنا شروع ہو جائینگے۔ فحاشی اور بے حیائی کے دن ہمارے معاشرے میں اب فخر سے منائے جارہے ہیں۔ میں اس حوالے سے ایک مارچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ شہر کے مختلف علاقوں سے چھوٹی چھوٹی ریلیاں نکلیں گی اور مرکزی شاہراہ پر اکھٹی ہو جائیں گی۔ جہاں دیگر علمائے کرام اور میں عوام سے خطاب کرینگے۔ آپ ضرور تشریف لائیے گا۔' ابدالی بولا۔

'جی ضرور آؤ گا۔ مجھے بھی شدید چڑ ہے اس بے ہودہ دن سے۔ اصل میں یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک چال ہے جسے ہم لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔'

'ارے واہ شہباز صاحب۔ آپ نے تو میرے الفاظ دھرا دیے۔ کیا خیال ہے اگر آپ بھی ایک تقریر کر ڈالیں اس موقع پر؟'

'جی ضرور کروں گا مگر صحافت سے ریٹائرمنٹ کے بعد۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر، وکیل، صحافی اور سیاستدان کبھی ریٹائر نہیں ہوتے!' اس بار ابدالی نے شہباز کی بات پر قہقہہ لگایا۔

'ٹھیک ہے حضور۔ جب کبھی صحافت سے بیزار ہو جائیں تو ہماری جماعت جوائن کیجئے گا۔ ہم آپکو سینیٹر بنائیں گے۔۔۔ انشا اللہ!'

'میرے بھائیوں، بچوں اور بزرگوں۔ بہت نازک وقت ہے۔ اسلام کے خلاف بہت بڑی بڑی سازشیں اور فتنے وجود میں آچکے ہیں۔ ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے ہر فتنے اور سازش کا سر کچل کر رکھ دیا۔ لیکن اب چودہ سو برس بیتنے کے بعد جس قسم کی سازشیں بُنی جارہی ہیں۔۔۔ ایسی بھیانک، خطرناک، ہولناک اور تباہ کن سازشیں اس سے پہلے کبھی وجود میں نہیں آئیں۔ میں کہتا ہوں مسلم دنیا پر کفار اپنے سارے ایٹمی بم برسا دے۔ پھر بھی اسلام کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ ایٹم بموں کی طاقت ماند پڑ جائے گی جذبہ جہاد کے آگے۔ یقین مانیئے بھائیوں، بہنوں، بزرگوں اور بچوں۔ یہ ایٹم بم ہم پر پھینکیں گے اور ہم انہیں اپنے ہاتھوں میں

تھام لیں گے۔ اور یہ ہی بم ان کے اوپر پھینک دینگے۔ یہ سب کیونکر ہو گا؟ کبھی سوچا ہے آپ نے؟'

اتنا کہہ کر مولانا ابدالی رک گیا۔ دونوں ہاتھوں کو ڈائس پر رکھ کر اس نے لوگوں کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ دائیں اور بائیں گردن کو موڑا۔ ہزاروں کے مجمعے کو گویا سانپ سونگھا ہوا تھا۔ کوئی بول نہیں رہا تھا۔ مکمل خاموشی چھائی ہوتی ہے۔

'جواب دیجئے نا؟ میں آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ لوگوں سے۔ غیر تمند لوگوں سے۔ حیاوالے لوگوں سے۔ شرم والے لوگوں سے جو اپنی آبرو کے لئے اپنا خون تک بہا دیتے ہیں۔ جو ایک بیٹی کی پکار پر راجہ داہر کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ آج میں آپ لوگوں سے جواب لیکر ہی واپس جاونگا۔ مجھے جواب دیجئے!' ابدالی اب لہجے میں مزید گھن گھرج پیدا کر کے بولا۔

'مولانا آپ ہمارے رہبر ہیں۔ آپ ہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہم شرمندہ ہیں۔ ہمارے پاس آپکے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ مجمع میں سے مولانا کا ایک شاگرد بولا۔

'میرے بھائیوں۔ میرے بزرگوں، بہنوں، ماؤں۔۔۔ میں بتاتا ہوں کہ کیوں ہم ایٹم بم سے لڑ سکتے ہیں مگر اس دور کے فتنے کے آگے بے بس ہیں۔ ان این جی اوز نے ایک نیا بم تیار کیا ہے جو نظر نہیں آتا۔ ایٹم بم اس نئے بم کے آگے ماچس کی گیلی تیلی کے مانند ہے۔ جانتے ہیں یہ این جی اوز والا بم کیا ہے یا یہ بھی مجھے ہی یاد دلانا پڑے گا؟' ابدالی اتنا کہہ کر پھر رک گیا۔ اب وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی قراقلی ٹوپی اتاری۔ گھنے بالوں کو ہاتھوں کی انگلیوں سے پیچھے لے جا کر ٹوپی دوبارہ سر پر رکھی۔ منرل واٹر کی بوتل کھولی۔ دل ہی دل میں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیسے بے وقوف لوگوں سے پالا پڑا ہے۔

پانی کے دو گھونٹ پی کر ابدالی پھر سے گرجنا برسنا شروع ہو گیا۔ 'یہ بم بے حیائی کا بم ہے۔ یہ بم فحاشی کا بم ہے۔ یہ زنا اور حرام کاری کا بم ہے۔ جسے کبھی ویلنٹائن ڈے کے نام پر؛ کبھی وومن ڈے کے نام پر؛ کبھی جینڈر کے نام پر؛ کبھی فیمی نزم کے نام پر؛ کبھی جینڈر سین سی ٹیویٹی کے نام پر ہمارے دماغوں پر برسایا جا رہا ہے جو ہمیں اندھا، بہرہ، گونگا کر دیتا ہے۔ کسی کی بھی بیٹی، بہن، ماں، بہو، بیوی کو گلاب کا پھول دیکر اسکے ساتھ زنا کر لو۔ یہ سکھایا جا رہا ہے ہمیں ویلنٹائن ڈے کے نام پر۔ اور یہ کلچر مسلم دنیا میں پھیلانے والے شیطان کی چیلے ہیں این جی اوز کی شکل میں۔ ڈونرز کی شکل میں۔ فیمی نازیوں کی شکل میں۔

یعنی اب نکاح کی جگہ زنا اور حق مہر کی جگہ گلاب کا پھول! میں کہتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی مرد چلا جائے ان این جی اوز چلانے والوں کے پاس۔ ان فیمی نازیوں کے پاس۔ وہاں جا کر ان کو ایک پھول دے دے اور کہے کہ جی مجھے اب آپ اپنی ماں، یا بیٹی یا بہن، یا بہو یا بیوی کے

ساتھ زنا کی اجازت دیں۔ اپنے گھر میں میرے اور اسکے لئے ایک کمرے کا انتظام کریں۔ میں اس کا ایک دن کا شوہر بنوں گا۔ پھر جب اس کے ساتھ سہاگ رات منا چکا ہونگا تو آپ ہم دونوں کے لئے اچھا سا کھانا بھی ٹیبل پر تیار رکھیے گا۔ اور اسکے بعد مجھے اپنی دعاؤں میں رخصت کیجئے گا۔ اور اسکے بعد میرے حرامی بچے کو ایک تحفہ سمجھ کر خود ہی پال پوس کر بڑا بھی کر دیجئے گا۔ پھر دیکھئے گا اس لبرل دانشور مردیا فیمی نازی کاری ایکشن۔ جوتے نہ مارے اس نے آپ کو تو میرا نام بدل دیجئے گا۔ بولیں کیا کہتے ہیں اب آپ؟'

ابدالی نے کہا اور پھر سے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولنا شروع کیا۔ نظریں اس دوران اسکی مجمع پر تھیں۔

'ویلنٹائن ڈے مردہ باد۔ این جی اوز مردہ باد۔ فیمی نازی مردہ باد!' ہجوم ان پر شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ ابدالی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

'میں کہتا ہوں اسلام نکاح کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اگر کسی کو بھی کوئی پسند ہے تو رشتہ لیکر جائے اور شرعی طریقے سے اسے اپنی شریک حیات بنائے۔ یہ پھول لیجانا مغرب کا کلچر ہے جو نکاح کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ مغرب میں بھائیوں اب مائیں بارہ بارہ سال کی بچیوں کے سکول بیگ میں کنڈومز کے پیکٹ رکھتی ہیں یہ کہہ کر کہ جس مرضی کے ساتھ منہ کالا کرنا ہو فخر سے کر پر ابھی حرام کا نطفہ نہ اندر ڈلوالینا۔ مجھ سے نہیں ہو گی بے بی سیٹنگ۔ تجھے سنبھالوں یا تیری حرامی اولاد کو۔ اور اب لڑکا اور لڑکی بغیر نکاح کیے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اگر چند ماہ وہ اس حالت میں اکٹھا رہیں تو مغرب کا قانون خود بخود انہیں میاں بیوی مان لیتا ہے۔ اب چرچ میں جا کر شادی کرنے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ صرف خاندانی گورے چرچ جا کر شادی کرتے ہیں۔'

'یہ سب کچھ اب یہاں پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ چاہتے ہیں مرد اور عورت زنا کریں اور قانون زانی مرد اور زانی عورت کو میاں بیوی تسلیم کرے۔ اب ہمیں مضامین کے ذریعے، سیمینارز کے ذریعے، تعلیمی ورکشاپس کے ذریعے، ٹی وی ڈراموں، فلموں اور ٹی وی ٹاک شوز پر یہ بتایا جا رہا ہے کہ لڑکی اگر گھر سے بھاگ کر شادی کر لے تو یہ بالکل جائز ہے۔

شریعت اسکی اجازت دیتی ہے۔ تو جناب شریعت تو پردے کا حکم بھی دیتی ہے۔ تو پھر کیوں ساروی سرمست جیسی عورتیں ننگی آجاتیں ہیں ٹی وی ٹاک شوز پر؟ وہ کافروں کی ایجنٹ زینت کیوں مصر ہے بے ہودہ بلاوز پہن کر تعلیمی ادارے میں کلاس لینے پر؟ اس وقت انہیں شریعت کیوں نظر نہیں آتی؟ شریعت کے مطابق عورت کا جائیداد میں مرد کے مقابلے میں آدھا حصہ رکھا گیا ہے۔ جبکہ مغرب میں تو عورت کا جائیداد میں سرے سے کوئی حق ہی نہ تھا۔

تو پھر انہیں شریعت کیوں نہیں نظر آتی؟ اسلام میں عورت کی کفالت مرد کی ذمہ داری ہے۔ اس لئیے اس کا جائیداد میں آدھا حصہ رکھا گیا ہے۔

مغرب والے تو عورت کو بھی گدھے کی طرح کام میں جوت دیتے ہیں اور پھر بھی جائیداد میں حصہ نہیں دیتے۔ پھر یہ این جی اوز اسلام پر تنقید کرتی ہیں یہ کہتے ہیں کہ عورت کی گواہی آدھی رکھی گئی ہے۔ جناب آدھی یوں کہ مخصوص ایام میں وہ مکمل طور پر تندرست نہیں ہوتی۔ ان ایام کا اثر یادداشت پر پڑ سکتا ہے۔ماں کے پیروں تلے جنت ہے۔ ماں عورت ہے مرد نہیں۔ مرد کے پیروں تلے جنت کہیں پڑھا ہے آپ نے؟ لیکن این جی اوز والے یہ بات نہیں کرتے۔ واہ بھئی واہ۔ جہاں اپنا فائدہ نظر آیا تو شریعت زندہ باد ورنہ شریعت کے خلاف ہرزہ سرائی!'

'نعرہ تکبیر، اللہ اکبر!' ہجوم اب فلک شگاف نعرے بلند کر رہا تھا۔

'یہ این جی اوز اب ان لڑکیوں کو فری لیگل سروس مہیا کر رہی ہیں جو گھر سے بھاگ کر شادی کر رہی ہیں۔ یہ اپنے ایجنڈے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ آئے دن ہم اخبار میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ کر فلانی این جی او میں پناہ لے لی۔ اور عدالتیں ایسی لڑکیوں کے حق میں فیصلے دے رہی ہیں۔ اسطرح ہمارا خاندانی نظام بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب بے شرمی، بے حیائی اور بدکاری معاشرے میں عام ہو جائے تو کون ماں ایسے بچے پیدا کر سکے گی جو ایٹم بموں کو ہاتھوں میں پکڑ کر دشمن کی طرف اچھال دیں؟ اس لئے میرے بھائیوں، میری بہنوں، میرے بزرگوں این جی اوز ایٹم یا ہائیڈروجن بم سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہیں۔

ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ کیا آپ سب تیار ہیں اس جہاد کے لیے؟ اور اس جہاد کا پرچم ہاتھوں میں لیکر سب سے آگے چلنے والا میں ہونگا۔ آپ تیار ہیں؟' ابدالی یہ کہہ کر رک گیا۔ اور اگلے ہی لمحے ہجوم پرجوش انداز میں نعرے لگا رہا تھا۔ 'قدم بڑھاؤ ابدالی ہم تیرے ساتھ ہیں۔ ابدالی کے جانثار بے شمار بے شمار!

ہجوم میں سے ایک لٹھ بردار جتھہ علیحدہ ہوا۔ وہ ایک نامعلوم سمت روانہ ہو چکا تھا۔ صرف شہباز جانتا تھا کہ اس گروہ کی منزل کہاں تھی۔ یہ اس کا ایسا اندازہ تھا جو غلط ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور چند گھنٹوں بعد یہ ثابت بھی ہو گیا۔ لٹھ بردار جھتہ شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی پر دھاوا بول چکا تھا جہاں طلباء اور طالبات ویلنٹائن ڈے منا رہے تھے۔ یونیورسٹی کے کیمپس میں لڑکے اور لڑکیاں رقص کر رہے تھے۔ لڑکیوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان کی چھاتیاں انکی قمیضوں کے گلوں کو پھاڑ کر باہر نکلنا چاہ رہی تھیں۔

زبردست لٹھ بازی ہوئی ایسے جیسے کفر اور اسلام کی جنگ ہو۔ ہر چیز درہم برہم ہو چکی تھی۔ کیمپس میں چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ سب کے سر پھٹ چکے تھے۔ درجنوں لڑکیاں اور لڑکے بری طرح گھائل ہو کر فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ اور سیکیورٹی خاموش تماشائی بنی رہی۔ یہ جتھہ جب اطمینان سے اپنا کام ختم کر چکا۔۔۔۔تب جا کر انتظامیہ نے پولیس کو اطلاع دی۔ انگریزی میڈیا نے اس تشدد کی بڑھ چڑھ کر مذمت کی۔ جبکہ اردو میڈیا نے اسے معرکہ حق و باطل قرار دیا۔

'یہ اچھا نہیں ہوا مولانا صاحب! آپکی تقریر نے لوگوں کو مشتعل کر دیا۔ شکر ہے کسی کی جان نہیں گئی۔ ایسی شعلہ بیانی کا کیا فائدہ جو فساد پھیلا دے۔ رابعہ بھی بہت ناراض ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر اشتعال انگیز تقریر کی۔ وہ تو آپکے خلاف اداریہ لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے طریقے سے روک دیا۔ آپ اسلام کے داعی ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ شریعت ایسا سچ بولنے سے روکتی ہے جو فساد کا باعث بنے؟' ابدالی خاموشی سے شہباز کو سن رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں سکوت طاری ہوا تو اس نے کہا:

'مجھے قسم ہے اپنی دونوں بیٹیوں کی اس حملے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہم لوگ بہت منظم ہیں۔ تم نے ہمارا توہین رسالت پر بڑا جلسہ کور کیا۔ پچاس ہزار لوگ تو ہونگے کم از کم۔ ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے ہلا؟ جو چیز جہاں تھی وہیں پڑی رہی۔ ایک گملہ تک نہ ٹوٹا! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے۔ ایمبولینس کو راستہ نہیں دیتے مظاہرین۔ مریض راستے میں دم توڑ دیتے ہیں۔ گاڑیوں پر پتھراؤ ہوتا ہے۔ پٹرول پمپ اور دکانیں لوٹ لی جاتیں ہیں۔ سرکاری اور نجی املاک نذر آتش کر دی جاتی ہیں۔ راہگیروں کو لوٹا جاتا ہے۔ لیکن ایسا دوسری مذہبی جماعتیں کرتی ہیں۔ ہماری جماعت اسطرح کی نہیں۔'

'ہم دائیں بازو کی ایک اعتدال پسند جماعت ہیں۔ ہماری فی میل ورکرز زندگی کے ہر شعبے میں کام کرتی ہیں۔ میں نے پچھلی تقریر میں ذکر کیا تھا میری دونوں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ باہر سے پڑھی ہیں۔ وہاں کے اعلی ترین ہسپتال میں بہترین جاب کر رہیں تھی پر ملک سے اور انسانیت سے محبت کا جذبہ انہیں واپس یہاں لے آیا۔ انکے شوہر بھی اپنا کاروبار چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ پھر بھی تمہیں یقین نہیں آتا تو میری طرف سے مکمل اجازت ہے جو چاہو لکھو میرے خلاف۔ میں چند روز بعد ایک پریس کانفرنس کرونگا۔ سب کچھ بتاؤنگا۔ اس واقعے کی مذمت بھی کرونگا۔ اپنے طور پر تحقیق کرو۔ مجھے تو لگتا ہے یہ این جی اوز نے ہی کروایا ہے ہمیں بدنام کرنے

کے لئے۔ مجھے تو ساروی سرمست پر شک ہے۔ وہ ایک نمبر کی جھوٹی عورت ہے۔ لوگوں کو بلیک میل کرتی ہے۔ ٹی وی شوز پر علمائے اکرام سے بد تمیزی کرتی ہے۔ انکی توہین کرتی ہے۔ شعائر اسلام کا کھلے عام مذاق اڑاتی ہے۔ پھر بھی ہم لوگ اسے عورت سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق اس کی این جی او شدید دباؤ میں ہے۔ اس کے سٹاف نے اسے مارا پیٹا بھی ہے۔ اب وہ بے بسی کے عالم میں ہاتھ پاوں مار رہی ہے کہ بس کسی نہ کسی طرح اس کی این جی او بچ جائے۔'

'شاید آپ درست کہہ رہے ہوں۔ شاید کسی انتہا پسند جماعت یا گروپ نے کرایا ہو۔ اس ملک میں کمی تھوڑی ہے ایسے عناصر کی۔ میرا خیال ہے ساروی کے پاس ایسے وسائل موجود نہیں اس قسم کے ڈرامے کے لئے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر نہ جانے کیا کچھ کہہ بیٹھا!' شہباز نے کہا۔

'بھئی جوان خون ہے۔ ہو جاتا ہے!'

'نہیں حضور۔ اب نہیں رہا جوان۔'

'یار شہباز صاحب مجھے تو آپ اب بھی تیس کے نظر آتے ہیں! بھئی سبحان اللہ! بس شکر ادا کرتے رہا کریں رب کا!' ابدالی بولا۔

'جی وہ تو ہر حال میں لازم ہے۔ وومین ڈے کے حوالے سے آپکی جماعت کی سوچ کیا ہے؟'

'بھئی یہ مغرب تو ایک دن وومن ڈے مناتا ہے۔ مسلم دنیا میں تو ہر دن وومن ڈے ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا ماں وومین نہیں ہوتی؟ کیا بیٹی وومین نہیں ہوتی؟ کہا بہن وومین نہیں ہوتی؟ یہ حرام کی اولادیں کیا جانیں ہمارے دین نے کیا حقوق دیے ہوئے ہیں عورتوں کو۔ آج ہمیں یہ فخر سے بتاتے ہیں کہ جی ہماری تو عورتیں بھی فوج میں کمانڈوز ہیں۔ اگر ہم عورتوں کو آزادی نہ دیتے تو کیا وہ فوج میں شمولیت اختیار کر سکتی تھیں؟ یعنی باہر کی دنیا کو دکھانا یہ مقصود ہے کہ زندگی کا معمولی سے اعلی ترین شعبہ عورتوں کی نمائندگی سے خالی نہیں۔ پھر بھی کوئی عورت ابھی تک امریکہ میں صدر نہ بن سکی! اور یہ جو فی میل آرمی کمانڈوز کا بہت ڈھول پیٹتے ہیں این جی اوز والے تو اسکی حقیقت بھی بتاتا چلوں۔ اگر مغرب کے فوجی اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور جنگ لڑ رہے ہوں اور تنہائی ناقابل برداشت ہو رہی ہو تو کیا کوئی مزار شریف سے واشنگٹن جائے گا اپنے گھر رخصت لے کر یہ عذر پیش کر کے کہ جی بندے کو حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ فدوی بس ابھی آیا وظیفہ زوجیت ادا کر کے! یہ فی میل کمانڈوز اس کام کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ ان کا کام بھڑکتی ہوئی آگ کو اپنے بھڑکتے ہوئے حسن سے بجھانا

ہوتا ہے۔ اسی لئے تو آئے دن جنسی تشدد اور ہراسانی کے کیسسز رپورٹ ہوتے ہیں انکے فوجی اداروں میں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ عورتیں بارڈر پر توپوں کے گولے برسانے کے لئے رکھی گئی ہیں؟ جنگ تو یہ لوگ ٹیکنالوجی سے لڑ رہے ہیں۔ ڈرون حملے کرتے ہیں۔ دست بد دست جنگ تو ہو نہیں رہی۔ ہمیں بے وقوف بناتے ہیں حرامزادے!' ابدالی مدلل انداز میں اپنی بات کہہ رہا تھا اور شہباز متاثر ہوئے اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

باب 24

وومن ڈے کی تیاریاں

'اب آئی حرافہ پہاڑ کے نیچے!' رانی نے کچھ کاغذات جو اس کے ہاتھ میں تھے دیکھتے کہا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دائیں طرف بہت سے پیپرز تھے۔ وہ ایک ایک پیپر پڑھتی۔ ان پر کچھ لکھتی اور بائیں جانب رکھ دیتی۔ میز کے سامنے اس کا لیپ ٹاپ پڑا تھا جس کے دائیں طرف بلیک کافی کا مگ تھا۔ کاغذ سائیڈ پر رکھنے کے بعد وہ کافی کا ایک گھونٹ بھرتی اور پھر سے پیپرز دیکھنا شروع کر دیتی۔

'کون حرافہ پہاڑ کے نیچے آئی؟ یہاں تو ڈھیر ساری ہیں!' افسانے نے پوچھا۔

'یہ سب کی اماں ہے!' رانی نے کہا۔

'گوہر؟'

'ارے نہیں۔ وہ بیچاری تو معصوم بے وقوف حسینہ ہے۔'

'پھر کون؟'

'ارے وہی بھینس۔ کالی مائی کلکتہ والی جو اس دن سفیر کی پارٹی میں ننگی پھر رہی تھی۔'

'اچھا، ساروی سرمست! لیکن اس نے تو ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ویسے بالکل بارہ من کی دھوبن لگ رہی تھی۔' افسانے نے کہا۔

'ساڑھی تو میں اور تو بھی پہنتے ہیں۔ ساری دنیا پہنتی ہے۔ مگر یہ چھنال ساڑھی کی عزت و توقیر سرعام نیلام کرتی ہے۔ اس سے اچھا تو یہ کچھ بھی نہ پہنے۔ دراصل اس پر کوئی مرد تھوکتا تک نہیں۔ بس یہ اس آرزو میں اپنے بھدے جسم کی نمائش کرتی ہے کہ شاید کوئی تھوک دے۔' رانی نے حقارت سے کہا۔

'تو یہ پہاڑ کے نیچے کیسے آئی؟'

'بھئی ہم نے جو اشتہار دیا تھا کہ وومن ایشوز کو موثر طریقے سے پھیلانے کے سلسلے میں ہمیں پارٹنر آرگنائزیشنز چاہییں۔ اس نے اس سلسلے میں پروپوزل بھیجی ہے۔ اب آیا اسکا دماغ زمین پر۔۔۔' رانی نے جواب دیا۔

'آپ تو لازمی رد کرینگی اس کی درخواست کو۔۔۔'

'رد کرنے میں ہمیں نقصان ہو گا!' رانی نے کہا۔

'کیسے؟'

'اسکے پاس ایک قابل انسان ہے۔ اس کا نام رانا ہے۔ پھر اسکے علاوہ دو خوبصورت لڑکیاں ستارہ اور عمرانہ ہیں۔ وہ بہت چالو ہیں۔ مراثنیں ہیں۔ جب ہم 'میرا جسم میری مرضی' لانچ کرینگے تو انکے اندر کا بھانڈ مراثی جاگے گا اور یہ اچھے اچھے آئیڈیاز پروڈیوس کرینگی۔ اور غلیظ باتوں میں ساروی کا دماغ زبردست چلتا ہے۔ ہر قسم کی گالی آتی ہے اسے۔ مجھے تو چکلے کی پیدائش لگتی ہے۔' رانی نے کہا۔

'سنا ہے ستارہ اور عمرانہ نے سارے سٹاف کے سامنے ساروی کی خوب ٹھکائی کی۔ یہ سچ ہے؟' افسانے نے پوچھا۔

'سو فیصد سچ ہے۔ حرامزادی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'

'لیکن وہ دونوں تو ابھی اسکے ساتھ ہی کام کر رہی ہیں۔ نکالا کیوں نہیں؟'

'تم نکالنے کی بات کرتی ہو۔ اس نے تو ان کی تنخواہ بھی ڈبل کر دی۔ ساتھ میں رانا کی بھی!' رانی نے کہا۔

'کیوں؟'

'اس لئے کہ بے شرم ہے۔ دراصل تینوں نے استعفی دے دیا تھا۔ ساروی کو پتہ تھا کہ ان کے بغیر اس کے چکلے پر تالہ پڑ جائے گا۔ رانا نے صلح صفائی کروائی۔ طے یہ پایا کہ تینوں اپنا استعفی واپس لے لیں گے۔ ساروی انکی تنخواہ ڈبل کر دے گی۔ جو بے عزتی ہوئی ہے اسے بھول جائے گی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ارے دودھ دینے والی گائے کی لات بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اس ناگن کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ جیسے ہی وقت آئے گا ڈسے گی تینوں کو۔' رانی بولی۔

'کیا ساروی ہندو ہے؟'

'نہیں نہیں۔ اسکے پورے خاندان کو جانتی ہوں۔ مسلم گھرانہ ہے۔' رانی نے کہا۔

'تو پھر یہ ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح تلک اور مانگ میں سیندور اور منگل سوتر کیوں پہنتی ہے؟ ڈائن لگتی ہے سچ مچ اس حلیے میں!' افسانے نے کہا۔

'بھئی یہ بھی ایک طریقہ واردات ہے ہمارے معاشرے میں۔ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف پیش کرو۔ کچھ لوگ ایسا کرنے کے لئے پہناوے کا سہارا لیتے ہیں۔ کچھ اپنے ڈرائنگ رومز کو ہزاروں کتابوں سے بھر لیتے ہیں۔ کچھ اپنے گھر کی دیواروں کو پینٹنگز سے سجاتے ہیں۔ کچھ ہم جنس پرستی کے حق میں بولنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ اسلام کے خلاف بھونکنے لگ جاتے ہیں لیکن اندر سے سب مولوی ہوتے ہیں۔ ان کو مرچیں لگانی ہوں تو صرف اتنا یاد دلا دو

کہ جناب آپ تو مسلمان ہیں۔ پھر یہ کھسیانے ہو کر کہیں گے کہ ہم تو انسان ہیں۔ تو پھر انہیں لمحے بھر کے لئے یہ یاد کرادو کہ جی آپکے تو ختنے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوایا تھا۔ آپ نے تو اسے حرامی بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آپ نے اپنے شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے میں اسلام کے علاوہ ذات کا بھی اندراج کروایا ہوا ہے۔ پھر آپ نے جب پاسپورٹ فارم فل کیا تو اسکے ساتھ باقاعدہ ایک حلف نامہ بھی جمع کرایا کہ آپ ختم نبوت پر یقین رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے انہیں کافر اور زندیق سمجھتے ہیں۔ پھر جب ان ہی میں سے کوئی مرتا ہے تو یہ مرحوم یا مرحومہ کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ قل اور چہلم پر بھی موجود ہوتے ہیں۔

اگر آپ کا مذہب انسانیت ہے تو پھر یہ سب کیا ہے؟ یہ کھلی منافقت ہے۔ یہ منافقت کرنے سے چوتیا سے چوتیا انسان بھی اپنے آپ کو اس چوتیا معاشرے میں بطور دانشور منوا سکتا ہے۔ ابھی میں نے تجھے منہ ٹیڑھا کر کے، دیدے مٹکا کر، گردن کو جھٹکا دے کر، بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر، ہنستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے اور بناوٹی سنجیدگی طاری کر کے گفتگو کرنا نہیں سکھایا۔ جب تو یہ گر سیکھ لے گی تو پکی دانشور لگے گی۔

ویسے تجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو اصلی دانشور ہے۔ عقلمندی کی باتیں کرتی ہے۔ اور منگل سوتر اپنے احساس کمتری کو مارنے کے لئے پہنتی ہے۔ بیچاری کی شادی تو ہوئی نہیں۔ یہ مالا گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو نو بیاہتا ناری سمجھتی ہے۔ بس اپنے آپ کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔' رانی بولی۔

'آپکی نظر میں ہمارے یہاں کون سچا دانشور ہے؟'

'تو نے ایم اے انگریزی میں شیکسپئر نہیں پڑھا؟

'جی پڑھا ہے۔؟

'ہنری فور پڑھا؟'

'جی۔ وہ تو کورس میں بھی تھا۔'

'تو پھر تجھے یہ سوال ہی نہیں پوچھنا چاہیے تھا! اس کا مطلب صاف ظاہر ہے تو نے رٹا لگایا۔ پڑھا نہیں۔ اور جب پڑھا ہی نہیں تو سمجھا کیا خاک؟'

' آپ درست کہہ رہی ہیں۔ ہم سب نصابی کتابوں کو رٹتے ہیں۔ لیکن آپ بتا دیں نا۔ آپ تو میری سب سے بڑی استاد ہیں۔'

' بھئی شیکسپئیر نے ہنری فور کے ایکٹ ون میں کہا تھا کہ:

!Wisdom cries out in the streets, and no man regards it

دانشور تو گلیوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کون انہیں سنجیدگی سے لیتا ہے؟ اصل میں اس نے بائبل کا حوالہ دیا تھا۔ اب تیرے سوال کا جواب کہ کون سچا دانشور ہے۔۔۔ تیری ماں سب سے عظیم دانشور ہے!' رانی نے کہا لیکن افسانے کو بات سمجھ نہ آئی۔ پھر اس نے بات کو مزید آسان کرتے کہا: 'تو نے اپنی ماں کو پچاس ہزار روپے والا قصہ صاف صاف بتا دیا اور اس نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ وہ بہت دانشور عورت ہے۔ نہ صرف دانشور بلکہ دوراندیش۔ اس نے لمحے بھر میں اس معاملے کی اچھائی اور برائی کے پہلو سمجھ لئے اور بہتری اسی میں جانی کہ تجھے وہ کرنے دیا جائے جو تو کرنا چاہتی ہے۔' رانی نے بہت وضاحت سے سمجھایا اور افسانے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

'آپ بھی بہت عظیم دانشور ہیں۔' اس نے کہا۔ اس پر رانی نے غالب کا شعر پڑھا۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اور افسانے رانی سے پہلے سے زیادہ متاثر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کمال عورت ہے۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں پڑھ رکھے ہیں اس نے۔

'بیٹا اب انٹرنیشنل وومن ڈے کی تیاریاں کر۔ لہذا تو ایک کام کر۔ تیرے گھر سے کچھ دور شہر کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ اپنے کزنز کے متھے ایک کام مار جسکے انہیں اچھے پیسے دونگی۔ وہ یہ کہ کچی آبادی کی عورتوں کو فی عورت ہزار روپے آفر کریں۔ ہم بسیں بھر کر انہیں اس جگہ لے آئیں گے جہاں بڑا مظاہرہ ہو گا۔ ہر عورت کے ہاتھ میں ایک پلے کارڈ ہو گا جسے وہ بلند کرے گی۔ اسکے بعد بہترین کھانا ملے گا۔ اور بسیں انہیں واپس گھر چھوڑ آئیں گی۔ کم از کم ایک ہزار عورتیں درکار ہونگی مجھے۔ اگر اس سے اوپر بھی گھیر گھار لے تو کوئی مسئلہ نہیں۔۔' رانی نے کہا۔

'یہ تو بہت زبردست آفر ہے دیمے!' جیسے ہی افسانے نے اپنی بات مکمل کی، شمیم بولی جبکہ دیما کچھ نہ بولا۔

'ہزار عورتیں تو تُو آرام سے اکھٹی کر لے گا۔ ہر عورت کو ہزار روپے ملیں گے۔ اور تجھے فی عورت دو سو۔ اسطرح تو بیٹھے بٹھائے دو لاکھ روپے کما لے گا۔ اب مہنگائی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر تیری شادی بھی کرنی ہے۔ اور کام بھی مشکل نہیں۔ بستی کے کھڑپینچ کو اپنے قابو میں

کرنا ہو گا۔ وہ آرام سے عورتوں کا بندوبست کر دے گا۔' شمیم نے کہا۔ دیمے سے زیادہ شمیم پر جوش تھی۔ وہ ابھی تک خاموش تھا۔

'کیا بات ہے دیمے؟ پیشکش اچھی نہیں لگی تجھے؟' اس بار افسانے نے پوچھا۔

'نہیں ایسی بات نہیں۔ پیشکش تو واقعی زبردست ہے لیکن کام بہت مشکل ہے۔ سب عورتیں گھروں میں یا گھریلو کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ ان کے مالکان انہیں ایک دن کی چھٹی دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی عورت بیمار پڑ گئی۔ یا کسی مجبوری کے تحت کام پر نہ جا سکی۔ اگلے دن گئی تو پتہ چلا کہ اسکے چھٹی کر دی گئی ہے۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ اٹھ کر پانی بھی خود نہیں پی سکتے۔ انکے لیے ایک دن کی چھٹی دینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ پھر جو کام نہیں کرتیں انہوں نے بچے سنبھالنے ہوتے ہیں۔ بہت ساری عورتوں کے شوہر شکی مزاج ہوتے ہیں۔ اجازت ہی نہیں دینگے۔ بہت سی دھندہ کرتی ہیں۔ سارے دن میں ہزار ملیں گے۔ اس سے ڈبل تو وہ ایک گاہک سے پندرہ منٹ میں کما لیتی ہیں۔ لیکن میں نے اس معاملے میں کچھ بات کرنی ہے تم سے تنہائی میں!' دیما بولا۔

'ہائے ایسی کیا بات ہے دیمے۔ سیدھا سادا کام ہے۔ تو خواہ مخواہ سسپنس پیدا کر رہا ہے!' شمیم نے مداخلت کرتے کہا۔

'کرنے دے اسے۔ میں نے بھی اس سے کچھ کہنا ہے تنہائی میں۔ تو باہر جا۔' افسانے نے کہا۔ شمیم باہر نکل گئی۔ افسانے نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

'مجھے پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے۔ تیرے میرے سٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ میرے سپنے دیکھنے چھوڑ۔ تیری میری شادی ممکن نہیں۔ اور تو یہ کام نہیں کریگا تو کوئی دوسرا کر دے گا۔ اب بول!' افسانے نے دیمے کو اسکی اوقات یاد دلاتے کہا۔

دیما تو افسانے سے تنہائی میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بس وہ اس سے شادی کر لے۔ دیمے کو اچھی طرح علم تھا کہ افسانے اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ اس کے باوجود وہ اس سے اظہار محبت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسانے نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ سوچ کر کہ افسانے کی پیشکش قبول کر کے شاید وہ اس کے قریب آ جائے، دیمے نے تھکے ہارے لہجے میں کہا:

'مجھے منظور ہے۔ کام ہو جائے گا۔'

'ویری گڈ۔۔۔ شمیم دیما مان گیا ہے۔۔۔' افسانے چلائی۔

'چلو پھر منہ میٹھا کرتے ہیں۔ دیمے جامیدے حلوائی سے گرم گرم گلاب جامن تو لا!' شمیم نے اسے پیسے دیتے کہا تو افسانے نے اسے روک دیا۔

'پیسے میں دیتی ہوں۔ یہ لے دیمے۔ باقی تو رکھ لینا ٹپ سمجھ کے۔' افسانے نے یہ کہہ کر پانچ ہزار کا نوٹ اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کامیابی سے اپنے آپ کو برتر اور دیمے کو کم تر ثابت کر چکی تھی۔ پانچ ہزار کا نوٹ دیکھ کر دیمے اور شمیم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

افسانے گھر لوٹی تو اسکی ماں اسکی منتظر تھی۔ اس نے ساری بات اسے بتائی تو ماں بولی: 'تو نے بہت اچھا کیا جو اس جھاڑو پھرے دیمے کی اوقات اسکو یاد دلا دی۔ ٹھیک ہے ان لوگوں نے ہمیشہ ہمارا خیال رکھا۔ لیکن کسی لفنگے کے ہاتھ میں کوئی ماں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں تھمائے گی۔۔'

افسانے اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو بوبی کو سویا ہوا پایا۔ 'کتنا پیارا اور معصوم لگتا ہے میرا بھائی سوتے ہوئے۔ کاش بوبی جیسا ایک اور بھائی ہوتا!' اس کے دل میں اک نئی خواہش نے جنم لیا۔ جھٹ مڑی اور ماں کے پاس گئی اور کہنے لگی: 'اماں کیا تم میری ایک خواہش پوری کر سکتی ہو؟'

'میں تیری ہر خواہش پوری کر سکتی ہوں۔ میں نے تو تیری ایسی خواہشات بھی پوری کر دیں جو میرے بس میں نہ تھیں!' ماں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

'اماں شمیم کے دو بھائی ہیں۔ اوروں کے تین تین چار چار۔ میرا صرف ایک۔ کیا تم مجھے ایک اور بھائی دے سکتی ہو؟' یہ بات افسانے نے ایسے کہی جیسے چار سال کی بچی ہو۔ ماں نے مسکرا کر کہا: 'میں تو تجھ سے یہ فرمائش کرنے والی تھی کہ تو شادی کے لئے راضی ہو۔ میں تیرا بیاہ کروں اور تو مجھے ایک عدد نواسا دے۔ پر تو نے الٹا مجھ سے فرمائش کر دی!'

'نہیں اماں۔ آپ ابھی بالکل جوان دوشیزہ ہیں۔ اتنی جلدی نانی بننا ٹھیک نہیں۔ ویسے میرا ابھی دور دور تک کوئی ارادہ نہیں شادی کا۔ لہذا آپ ذرا ابا کے ساتھ مزید وقت گذارا کریں تاکہ بوبی کو بھی اپنا جوڑی دار مل سکے۔ اس کے دل میں بھی شدید خواہش ہے کہ اس کا بھی ایک بھائی ہو۔ میری شادی کر دی تو وہ تنہا رہ جائے گا!' افسانے نے ہنس کر ماں سے کہا:

'ارے بوبی کی فکر نہ کر۔ وہ تیرے ساتھ جہیز میں جائے گا!' ماں نے کہا اور افسانے نے دل میں کہا: 'انشااللہ!'

یہ خواہش محمودہ کے دل میں بھی تھی۔ لیکن ملک ارادے کا بہت پکا تھا۔ وہ یہ دعا کر رہی تھی کہ کاش ملک مان جائے۔ اگر ملک سے نہیں تو رحیم سے جو بالکل تندرست تھا اور اس

معاملے میں ملک سے کہیں زیادہ مضبوط۔ لیکن اللہ کی مرضی۔ جسے چاہے مزید اولاد دے جسے چاہے نہ دے! اس کے ذہن میں ایک اور خیال آ رہا تھا!

باب 25

میں شریف زادی نہیں!

'تم ایک پہیلی ہو غزالہ! میں تم سے جتنا زیادہ ملتا ہوں اتنا ہی اس پہیلی کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا جاتا ہوں۔' شہباز نے کہا۔

'اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو تم میرے بارے میں کہتے کہ انتہائی بے وقوف عورت ہے!' غزالہ نے ہنستے ہنستے کہا۔ آج دونوں ایک بار پھر شام کے اجالے میں باہر نکلے تھے۔ وہ ایک کشتی میں تھے۔ ناؤ ایک حسین جھیل میں تھی۔ شہباز چپو چلا رہا تھا۔

کشتی اب کنارے سے بہت دور آ چکی تھی۔ جھیل بہت بڑی تھی۔ سمندر کا گمان دیتی تھی۔

'تم بہت سی باتیں ادھوری چھوڑ دیتی ہو۔ آج انکے بارے میں بات کریں؟' شہباز نے پوچھا۔

'میں نے زندگی میں کبھی کچھ مکمل نہ کیا۔ سب کچھ ادھورا ہی چھوڑ دیا!'

'پھر فلسفہ!' شہباز نے کہا۔

'چلو پوچھو اپنے تمام ادھورے سوالات۔۔۔'

'کس کس کی فلمیں ہیں تمہارے پاس؟'

'ہر اس ایکٹر یا ایکٹریس کی جو مجھے پسند ہے۔'

'میں اس قسم کی فلموں کی بات نہیں کر رہا۔۔۔'

'پھر کن فلموں کی بات کر رہے ہو؟'

'اتنی معصوم نہ بنو۔ وہ والی فلم۔۔۔ میری تمہاری فلم۔۔۔'

'ہر نام والے کی فلم ہے میرے پاس۔ تمہیں بتا دیا تو حیرت سے پتھر کے بت بن جاؤ گے۔'

'چند ایک نام تو بتاؤ نا یار؟' شہباز نے زور دیکر کہا۔

'میں شریف زادی نہیں جو دوسروں کی عزت اچھالوں!'

'کیا مطلب؟' یہ بات سنکر شہباز پھر حیران ہو گیا۔

'بھئی یہ کام تم شریف، عزت دار لوگ کرتے ہو۔ غیبت، برائیاں، ایک دوسرے کے راز افشاء کرنا۔ تمہارا تو یہ پیشہ ہے جسے جرنلزم کہتے ہیں مہذب زبان میں!' غزالہ کی بات کے جواب میں شہباز کے پاس سوائے خاموشی اور اعتراف کے اور کچھ نہ تھا۔

'تم اداس کیوں ہو گئے؟ کیا اس لئے کہ میں نے تمہاری مخبر یا سورس بننے سے انکار کر دیا؟'

'نہیں اس بات نے اداس نہیں کیا۔ لیکن دکھ کسی اور بات کا ہے۔۔۔'

'کس بات کا؟'

'چھوڑو!'

'بتاؤنا۔۔۔ کس بات کا دکھ ہے؟' غزالہ اصرار کرنے لگی۔

'کچھ نہیں یار۔ ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔' شہباز نے قدرے سختی سے کہا۔

'اچھا نہ بتاؤ لیکن مجھے پتہ ہے۔۔۔'

'پتہ ہے تو پھر پوچھ کیوں رہی ہو بار بار زور دے کر۔۔۔ اچھا بتاؤ کیا ہے۔ میں بھی تو جانوں کتنا علم غیب ہے تمہارے پاس!' شہباز نے کہا۔

'تم ایک ٹپیکل مرد کی طرح یہ سوچ رہے ہو کہ غزالہ کتنے بڑے آدمیوں کے ساتھ سوئی ہو گی۔ کون کون ہونگے وہ۔ یہ ہی سوچ رہے تھے نا؟'

'ہاں۔ تمہیں کیسے علم ہوا؟'

'میں تمہارا دل و دماغ دونوں پڑھ سکتی ہوں!'

'تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتیں؟

'تم پاگل ہو کیا؟ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ اگر میں غیر شادی شدہ ہوتی تو یقین مانو تمہارے ساتھ بھاگ کر شادی کر لیتی!'

'تو اب بھاگ جاؤنا!'

'بھاگ جاتی ہوں پہلے میرے شوہر اور افضال کو مرنے دو!'

'یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا؟ اگر وہ اگلے بیس برس نہ مرے تو؟'

'تو پھر مار دو ان دونوں کو!'

'کیا؟ کیا کہا تم نے؟' شہباز کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

'تم کیسے صحافی ہو؟ بات کو غور سے نہیں سنتے! سنتے ہو تو سمجھتے نہیں ہو! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو بات کو دھراتے ہیں۔ میں خود بات کو دہرانا پسند نہیں کرتی۔ اب تم غور و فکر کرو اس پر جو میں نے کہا۔ میرا جی تیرنے کو کر رہا ہے۔' یہ کہہ کر غزالہ نے

جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ وہ مہارت سے فری سٹائل میں تیرتی تیرتی اسکی آنکھوں سے دور ہوتی جارہی تھی۔'یہ عورت کہیں پاگل تو نہیں؟'وہ سوچ رہا تھا!

باب26

عورت مارچ کا ایجنڈہ

رانی کے دفتر میں عورتوں کے عالمی دن کے حوالے سے اہم مشاورت جاری تھی جس میں افسانے، ساروی سرمست، شبانہ طاری اور سائرہ عبید اللہ موجود تھے۔ ایجنڈہ یہ تھا کہ آٹھ مارچ کے حوالے سے کیا کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، کس کس نے کرنا ہے، کہاں کہاں کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ملک کے سادہ لوح عوام کے اذہان میں دو نئے زہر اتارنے تھے مگر "نظریے" اور "نعرے" کے محلول کی صورت میں۔ نظریہ تھا "عورت مارچ" اور نعرہ "میرا جسم میری مرضی"۔

ساروی، شبانہ اور سائرہ کی این جی اوز اس منصوبے میں رانی کے ادارے کی معاون شراکت دار تھیں۔ اونٹ ذبح کرنے اور گوشت بنانے کے بعد اگر قصائیوں کو مالک سے کچھ بوٹیاں بطور بخشیش مل جائیں تو انکی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ یہ تینوں خواتین ایک قسم کی "قصائی ٹیم" تھی۔ کام انہوں نے کرنا تھا۔ تماشہ رانی نے دیکھنا تھا۔ بڑا مال اس نے ہڑپ کرنا تھا۔ ان تینوں کو چند دھیلے اور بوٹیاں ملنا تھیں۔ یہ مال غنیمت بھی انکی اوقات اور توقعات سے بڑھ کر تھا۔ رانی اس قسم کا صدقہ و خیرات کثرت سے کیا کرتی۔ اسی لئے وہ اپنے قبیلے میں ہر دلعزیز تھی۔

شبانہ پیسنٹھ برس کی تجربہ کار فیمی نسٹ تھی۔ چھوٹی سی این جی او چلاتی تھی جو اس قماش کے دیگر اداروں کی طرح درحقیقت ایک "نشاط گاہ" تھی۔ اپنے وقت کی بڑی خوبصورت عورت جس نے وقت کے ہر فرعون کی خوابگاہ پر بہت شان اور ٹھسے سے حکمرانی کی۔ چند چاہنے والے اس عمر میں بھی اس کے محکوم تھے۔ شبانہ کا شوہر اس کا "ترقی دہندہ" تھا۔

'رانی سب سے پہلے تو میں آپکی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔ میں نے تو ہمیشہ آپ ہی کو اپنا آئیڈیل مانا۔ آپکے ذہن کی داد دیتی ہوں۔ یہ منفرد اور اچھوتا آئیڈیا یعنی میرا جسم میری مرضی، آپ ہی کی دین ہے۔ اس سے پہلے ایسا انوکھا خیال کسی کو چھو کر بھی نہ گذرا۔' ساروی نے بات شروع کرتے کہا۔

'یہ میرا نہیں ڈونر کا آئیڈیا ہے۔ یہ ڈونر کے باپ کا بھی نہیں، مغرب کا بہت پرانا آئیڈیا ہے۔ تم اپنی جہالت ہر محفل میں مت پھیلایا کرو۔ چاپلوسی کے بہت سے مواقع ملیں گے

تمہیں۔۔۔ کر لینا۔۔۔ وقت بہت کم ہے۔ صرف کام کی بات کرو۔' رانی نے ساروی کو جھاڑ پلاتے کہا۔

اس بے عزتی پر شبانہ اور سائرہ کو راحت محسوس ہوئی۔ ساروی ان دونوں کے خلاف تھی۔ کھسیانی ہو کر وہ بولی: 'یہ عبارات ہیں میرے ذہن میں پلے کارڈز، پوسٹرز اور بینرز کے لئے:

۔تمہارا کھانا میں گرم کر دیتی ہوں۔ اپنا بستر خود گرم کر لو۔۔۔

۔اپنا بستر خود گرم کرو۔ میں مصروف ہوں!

۔لو بیٹھ گئی ٹھیک طرح سے۔ اس پوسٹر میں ایک لڑکی تنگ سا پاجامہ پہنے ٹانگیں چیر کر بیٹھی دکھائی جائے گی۔

۔اپنا موزہ خود تلاش کرو۔۔۔

۔عورت کو بھی بیک وقت چار مردوں کی اجازت دو۔۔۔

۔تمہارے ماں باپ میری ذمہ داری نہیں۔۔۔

۔ماہواری سے شرم نہیں فخر کرو۔۔۔

۔گھورنا بند کرو۔۔۔

۔ہم جنس پرستی قبول کرو۔۔۔

-شادی ریپ کی ایک شکل ہے۔۔۔

۔پدرسری نظام مردہ باد۔۔۔

۔پدرشاہی نظام نامنظور۔۔۔

۔عورت عورت ہے غیرت نہیں۔۔۔

۔عورت کے جسم پر مولوی کی مرضی نہیں چلے گی۔۔۔

-میرے جسم پر میری نہیں تو کیا تیرے باپ کی مرضی چلے گی؟

۔اسقاط حمل عورت کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔۔۔

۔ڈالو مگر پیار سے۔۔۔

۔اب آگے سے نہیں پیچھے سے ڈالو۔۔۔

۔بوائے فرینڈ کا حق ہمیں بھی دو۔۔۔

-لو میں گیلی ہو گئی۔۔۔

۔عدت ایک بدعت۔۔ پدرشاہی کی سزا نامنظور۔۔۔

۔ہم جنس پرستی کوئی گناہ نہیں۔۔۔

۔ حجاب اور دوپٹہ پدر سری کی دو لعنتیں۔۔۔

۔ عورت کے گلے میں دوپٹہ دراصل مرد کے گلے میں پٹہ ہے۔۔۔

۔ پدر سری نظام بندر کا تماشہ دکھانے والا مداری ہے۔۔۔

۔ عورت کی امامت جائز ہے۔۔۔

'بہت اچھے پیغامات ہیں۔ میڈیا کو اپنی جانب کھینچ لینگے۔ اور انہیں خوب مرچ مصالحہ بھی مہیا کرینگے۔ ان سب کو مختلف رنگوں، اشکال اور انداز میں تیار کرو۔ پھر ہر بڑے شہر میں اپنے اپنے لوکل پارٹنرز کو بجھوا دو تا کہ عورت مارچ والے دن ان کی بھرپور تشہیر ہو۔ اچھا کام کیا ساروی نے۔ ڈویو ایگری شبانہ اینڈ سائرہ؟' رانی نے اپنی رائے دیتے دونوں خواتین سے پوچھا۔

'بہت اچھا کام کیا ساروی نے اور آپ کے فیصلے سے میں سو فیصد متفق ہوں۔' سائرہ بولی۔

'مجھے سائرہ کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔' شبانہ بولی۔ اندر اندر دووں ناخوش تھیں۔ اس کی وجہ رانی کا ساروی کو سراہنا تھا۔

'آپکو ہمارا آئیڈیا کیسا لگا رانی؟' شبانہ نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اسکی سیکریٹری ریحانہ میٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ جھک کر اس کے کانوں میں کچھ کہا۔

'ایکسکیوز می فرینڈز۔ ایک اہم کال ہے۔ صرف پانچ منٹ کے لئے۔۔۔' رانی یہ کہتے ہال سے باہر نکل گئی۔ کال میٹنگ سے زیادہ اہم تھی۔ میکس بات کرنا چاہ رہا تھا۔

سائرہ: 'یہ تہلکہ انگیز خوبرو دوشیزہ کون ہے؟'

رانی کے جانے کے بعد دونوں میں ٹیکسٹ میسجز کا کھیل شروع ہو گیا۔ موضوع افسانے تھا جسے سب بار بار دیکھ رہے تھے۔

شبانہ: بتایا تو تھا رانی نے۔۔ افسانے ہے۔۔ پروگرام مینیجر!

سائرہ: وہ تو پتہ ہے۔ پر بیک گراونڈ کیا ہے؟ اتنی کم عمر پر وگرام مینیجر!

شبانہ: یہ ہی وہ تیر ہے جسے رانی نے میکس پر چلا کر اتنا بڑا پراجیکٹ اپنے کینڈے میں کر لیا۔ اور ہم سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ اگر ہمارے ترکش میں ہوتا پھر کبھی نہ لے سکتی۔'

سائرہ: غلط سوچ رہی ہو سسٹر۔ میکس کے حواس پر تو ابھی تک رانی سوار ہے۔ ہر وقت چوہے کی طرح اس کی ساڑھی میں گھسا رہتا ہے۔ یہ لڑکی تو سونے پہ سہاگہ ہے۔ میں نے اپنی ستر سالہ زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت لونڈیا آج تک نہیں دیکھی!

شبانہ: درست کہہ رہی ہو سسٹر! چھاتیاں دیکھو اس کی۔ کیسی تنی ہوئی ہیں۔ آدھی تو ننگی ہیں۔ شرم وحیا تو اسے چھو کر بھی نئی گذری۔

سائرہ: بدن کی ہر چیز ہی تنی ہوئی ہے۔ رانی کا دوسرا جنم لگ رہا ہے!

شبانہ: درست کہا! اسے انوائٹ کرتی ہوں کسی دن کلب میں۔

سائرہ: گریٹ آئیڈیا! مجھے بھی بلانا۔

شبانہ: آف کورس! بائی دی وے پن پیک ہے یا پیکنگ کھل چکی ہے؟

سائرہ: میں عمر اور تجربے میں بڑی ہوں۔ لیکن یہ تجربہ اس کھیل میں نہیں جس کی چیمپیئین تم ہو۔ اپنا خیال بتاؤ؟

شبانہ: کسی زمانے میں تھی چیمپیئین، اور وہ بھی بلامقابلہ۔۔ اگر اب بھی ہوتی تو رانی میری جگہ بیٹھی ہوتی اور میں اس کی کرسی پر بیٹھ کر حکومت کر رہی ہوتی۔ تم میری وزیر اعظم ہوتیں۔ اس کی پیکنگ تو رانی نے ہی کھول دی ہو گی۔۔ انٹرویو میں۔۔ پہلے ہی دن!

سائرہ: لول۔۔

'تھینک یو فار ویٹنگ۔۔ سوری۔۔ بات لمبی ہو گئی۔ آپ کی پروپوزل پر میری ساتھی افسانے آپ کو گائیڈ کریں گی۔۔۔ افسانے!' رانی نے اپنی نشست دوبارہ سنبھالتے کہا۔

'آپکا آئیڈیا یہ ہے کہ چوک پر شلواریں لٹکائی جائیں تاکہ دیکھنے والوں کو یہ پیغام دیا جائے کہ کیسے مولوی نہ صرف عورتوں بلکہ بچوں کے ساتھ بھی جنسی زیادتی کرتا ہے۔ پھر دو قسم کی شلواریں لٹکانی پڑیں گی۔ ہر شلوار تار تار ہو۔ اس پر خون کے دھبے ہوں۔ زنانہ شلوار علیحدہ مردانہ علیحدہ ہو۔ مردانہ چھوٹے سائز کی ہو۔ تاکہ تاثر یہ ابھرے کہ مدرسے کے بچے کی ہے۔ بچیوں کے سائز کی بھی ہو۔ تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ مولوی کم سن بچیوں کو بھی ریپ کرتے ہیں۔ یہ سب شامل کیجئے۔ از اٹ کلئیر؟' افسانے نے تحکمانہ لہجے میں شبانہ سے کہا جس کی ساری زندگی ہی اس کام میں گذری۔ یہ لہجہ اسے ہتک آمیز لگا۔ لیکن افسانے کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ تو محض رانی کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی!

'جی بالکل ایسا ہی ہو گا جیسا آپ چاہتی ہیں۔' شبانہ منافقت سے کام لیتے مودبانہ انداز میں بولی۔ کس کی جرات رانی کو ناراض کرے!

'اور میرا آئیڈیا؟' سائرہ نے پوچھا۔

'افسانے ہی بتائیں گی۔' رانی بولی۔ سائرہ بھی اس جواب سے خوش نہ ہوئی۔

'آپ کا آئیڈیا ٹھیک ہے۔۔ عورت مارچ پر سٹریٹ تھیٹر اور اسکے بعد دھمال۔ اس سے پہلے ایک قوالی ہو جائے کسی مشہور طرز پر لیکن کلام عورت مارچ کے حوالے سے ہو۔ کوئی اچھا گیت کار ہائر کریں۔۔۔' افسانے نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

'بہت بہت شکریہ بیٹا۔ میں خود ہی تک بندی کر لوں گی!' سائرہ نے کہا۔

'بیٹا نہیں۔۔افسانے۔۔افسانے یوسفزئی! وی آر پروفیشنلز۔۔آرناٹ وی! اور دھندے میں کوئی بھائی یا بیٹا نہیں ہوتا!' افسانے نے سائرہ کی طبعیت بھی صاف کر دی۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر برداشت کرنا پڑا یہ سوچ کر کہ لونڈیا بات تو درست ہی کر رہی ہے۔

'یو آر رائٹ افسانے!' سارو ی نے کہا جو سائرہ کی بے عزتی پر خوش دکھائی دے رہی تھی۔

'تو پھر ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بے دھڑک کال کیجئے۔ ہر قسم کی سپورٹ آپ کے ڈسپوزل پر ہو گی۔ تھینک یو فار کمنگ!' افسانے نے میٹنگ برخاست کرتے کہا۔ سب اس کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر لوٹ گئے۔

'ویل ڈن افسانے۔۔۔'

'یہ سب آپ ہی کی محنت تھی رانی۔۔۔'

'مگر کمنٹس اور آئیڈیاز تو تمہارے اپنے تھے بچے۔ بہت مرچیں لگیں ہیں ان تینوں کو۔ یہ شبانہ تمہیں اکیلے کلب میں انوائیٹ کرے گی۔ انکار نہ کرنا۔ ضرور جانا اور رپورٹ کرنا۔'

'آل رائٹ رانی! میں ایک بات بتانا بھول گئی۔۔۔۔'

'کیا؟'

'اے گریڈ آیا ہے ایم اے انگریزی میں۔'

'ارے واہ۔۔۔ آخر شاگرد کس کی ہو۔۔۔ایک پارٹی ارینج کرو اس خوشی میں میرے گھر پر۔ اپنے گھر والوں اور دوستوں کو مدعو کرو۔ رابعہ اور عارف تو لازمی ہونگے۔ باقی نام میں طے کر لونگی۔ ہمارے پاس ریڈی میڈ مینو موجود ہوتے ہیں اس قسم کے ڈراموں کے لئے۔ ریحانہ کو ای میل کر دینا۔ سب بندوبست کر لے گی وہ۔ بہت چوکس بچی ہے!' رانی نے آنکھ مار کر کہا۔

'رانی یہ جمگھٹا لگانا ضروری ہے؟ ہم اکیلے بھی تو جشن منا سکتے ہیں۔۔۔اس دن کی طرح!

'افسانے۔۔۔تم نہیں سمجھتیں۔ یہ نیٹ ورکنگ ہے۔ اسکے ثمرات بعد میں ظاہر ہونگے۔

'اوکے رانی۔ تھینک یو۔ میرے گھر سے صرف اماں، بوبی اور میری کزن دوست شمیم ہونگی۔'

'ابا کیوں نہیں؟'

'وہ کہیں نہیں جاتے۔ ان کے دو ہی شوق ہیں۔ نوکری اور کیرم۔'

'گڈ۔ میں چلتی ہوں۔ میکس نے بلایا ہے۔ بائے!' رانی یہ کہتے جلدی سے نکل گئی۔

باب 27

تنفر رن!

'لو بھئی۔۔ نیا چورن آ گیا مارکیٹ میں۔۔' شہباز اپنی ای میل دیکھتے رابعہ سے بولا۔

'کون سا؟'

'تنفر رن!'

'یہ کس چڑیا کا نام ہے؟'

'بھونڈا ترجمہ ہے مساجنی کا۔۔' وہ بولا۔

'اچھا۔۔ بہت پرانا چورن ہے مغرب کا۔ کچھوے کی چال چلتا بالا آخر یہاں پہنچ ہی گیا۔ کون بیچ رہا ہے اسے؟' رابعہ نے پوچھا۔

'شبانہ طاری۔۔۔ چلیں؟'

'چلنا چاہیے۔ دیکھیں تو کس لوکل کونٹیکسٹ میں ڈھالتے ہیں مساجنی کو۔' رابعہ بولی۔

شبانہ طاری کی این جی او نے "تنفر رن" کے عنوان سے ایک لیکچر کا اہتمام کر رکھا تھا۔ سپیکر ڈاکٹر دایا اعظمی تھی۔۔ ایک گائناکالوجسٹ۔ شبانہ کی این جی او چھوٹی سی تھی۔ دفتر دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں تھا۔ لیکچر کے لئے اس نے ایک موٹل کا ہال بک کر رکھا تھا جس میں قریب دو سو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ لیکچر کی سوشل میڈیا اور اخبارات کے ذریعے خاصی تشہیر کی جا چکی تھی۔ امید یہ تھی کہ ہال آدھا تو لازماً بھر جائے گا۔

ہال میں رابعہ اور شہباز کے علاوہ دایا، شبانہ، اس کا شوہر طاری اور دفتر کے چند لوگ تھے۔ سب کے چہروں پر فکر مندی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ شبانہ سے کہیں زیادہ متفکر چہرہ دایا کا لگ رہا تھا۔ تینوں مسلسل فون پر تھے۔ ایک کے بعد ایک کال ملائے جا رہے تھے۔ اپنے اپنے دوستوں کو ہال میں پہنچنے کا کہہ رہے تھے۔ ان کی جھنجھلاہٹ بتلا رہی تھی کہ سب اپنے اپنے دھندوں میں مصروف ہیں۔ بوریت سے بھرپور اس قسم کے پروگرام میں کسی کی دلچسپی نہ تھی۔ لیکچر آدھ گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا۔ اسی اگو ہرء میں رانی افسانے کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی۔

شبانہ اسے دیکھ کر خوش ہوئی۔ دونوں کو پہلی قطار میں بٹھایا لیکن انہوں نے وہاں بیٹھنا پسند نہ کیا۔ شہباز اور رابعہ کی طرح وہ دونوں بھی پچھلی قطار میں ہی بیٹھے۔ اس طرح آپس میں کھسر پسر آسانی سے ہو سکتی تھی۔

'لو جی دائی اماں اب ڈاکٹر بن گئی!' رانی نے افسانے کے کان میں سرگوشی کی۔

'کیا مطلب؟'

'یہ بد نما بڑھیا جسے شبانہ "ڈاکٹر" یا "گائناکالوجسٹ" بنا کر پیش کر رہی ہے دراصل دائی ہے۔۔ مڈوائف۔ اس کی این جی او بس ایسے ہی ڈرامے کر سکتی ہے۔' رانی بولی۔

'یعنی عطائی ہے؟'

'جی۔۔'

'اگر ڈونرز کو پتہ چل گیا تو؟' افسانے نے پوچھا۔

'اتنا بدھو بھی نہیں ہوتا ڈونر! دراصل جس ایجنسی نے اسے یہ کنٹریکٹ دیا ہے وہ خود دو نمبر ہے۔ اور یہاں اس کا کوئی دفتر بھی نہیں۔ شبانہ کو ڈائریکٹ نہیں ملا یہ پراجیکٹ۔ جس کو ملا اس نے آگے اسے دے دیا۔ جس طرح ہم نے میرا جسم میری مرضی سارو ی، سائرہ اور شبانہ کے متھے مار دیا۔'

'ہم نے ایسا کیوں کیا؟' افسانے نے پھر سوال کیا۔

'اس لئے کہ یہ بہت حساس ایشو ہے۔ شدید رد عمل آئے گا۔ ہم فرنٹ پر آنا ہی نہیں چاہتے۔ جو جوتے پڑنے ہیں ان تینوں کو ہی پڑیں گے۔'

'واہ رانی! اچھا یہ دائی اماں کا کیا بیک گراونڈ ہے؟'

'خاک بیک گراونڈ ہے۔ تجربہ کار مڈوائف ہے۔ حرامی بچے گرانے میں ماہر ہے۔ ایک بار شبانہ کسی سیاستدان کی وجہ سے پیٹ سے ہو گئی۔ وہ جانتا تھا اسے۔ بڑی صفائی سے گرا دیا۔ کام ستھرا کرتی ہے ویسے۔' رانی بولی۔

'کنڈوم استعمال نہیں کیا؟' افسانے نے پوچھا۔

'پھٹ گیا ہو گا۔۔ یا نہیں دل کر رہا ہو گا اس دن۔ سو وجوہات ہو سکتی ہیں۔۔'

'پھر کیا ہوا؟' افسانے کریدتی جا رہی تھی۔

'پھر کیا ہونا ہے۔۔۔ دونوں کا گٹھ جوڑ ہو گیا۔ شبانہ اس کے بعد دو بار حاملہ ہوئی اور دائی اماں نے سب ثبوت مٹا دیے۔ بہت سی این جی اوز اس کی خدمات استعمال کرتے ہیں۔ اب اسے نیا چورن بیچنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ لیکچر شروع ہونے دے۔ پھر دیکھ کیا ہوتا ہے!' رانی بولی۔

'اگر آپ نے پروگرام شروع نہیں کرنا تو ہم چلیں؟' یہ آواز رابعہ کی تھی جو شدید بیزاری کے عالم میں تھی کیونکہ چالیس منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی۔

'بھئی شروع کر بھی دو شبانہ۔ کوئی نہیں آئے گا۔ سب کرکٹ کا فائنل میچ دیکھ رہے ہیں۔' رانی بولی۔ پھر افسانے سے سرگوشی کی: 'اس احمق کو اتنا بھی علم نہیں کہ میچ والے دن ایسے پروگرام نہیں رکھے جاتے۔'

'جی بالکل۔۔ شروع کرتے ہیں۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔ آپ سب کے آنے کا۔۔' شبانہ ہونقوں کی طرح بولی۔

دایا اب شروع ہوئی۔ انداز سو فیصد دانشورانہ اور فلسفیانہ۔۔ جیسے نام نہاد طبقہ روشن فکر کا ہوا کرتا تھا:

'اس لیکچر کا مقصد اس ملک کے سادہ لوح عوام کو یہ شعور دینا ہے کہ "تنفر رن" کیا ہے اور کیسے عورتوں کا استحصال کرتا ہے۔ کیسے یہ عورت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ تصور میری برسوں کی محنت کا نچوڑ ہے جس پر مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا۔ آپ نے یہ تو سنا اور پڑھا ہو گا کہ درسی کتب شدت پسندی کو فروغ دیتی ہیں۔۔ مثلاً الف سے اللہ، بے سے بندوق، خے سے خنجر، جیم سے جہاد، کاف سے کلاشنکوف، ٹے سے ٹینک، میم سے میزائل۔ اسی طرح وہ اقلیتوں اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والوں سے نفرت کا درس دیتی ہیں۔۔ مثلاً ہندو مکار بنیا ہے۔ گاندھی لومڑی کی طرح چالاک تھا۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آج تک۔۔ میں دعوی سے کہتی ہوں کہ آج تک کسی نے بھی۔۔ سوائے میرے۔۔ درسی کتب اور دیگر مواد کا مطالعہ تنفر رن کو مد نظر رکھ کر نہیں کیا۔۔۔' اتنا کہہ کر دایا خاموش ہو گئی۔ ایک نظر سننے والوں پر ڈال کر پوچھا:

'اتنی بات سمجھ آئی ہو تو آگے چلوں؟'

'واہ۔۔ ماشااللہ۔۔۔ جی جی ہم ہمہ تن گوش ہیں۔' شہباز بولا۔

یہ سنکر دایا دانت باہر نکال کر مسکرائی۔

'کتنی بھیانک لگ رہی ہے لمبے لمبے دانت باہر نکالا کر۔ بندریا ہنس رہی ہو جیسے۔۔ لمبے گھنے بال ہوا کرتے تھے اس کے۔ اب بوائے کٹ کرا کے پپو بچہ بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ کبھی سلم ہوا کرتی تھی۔ اب پھیلتی جا رہی ہے۔ دیکھ تو اسکی ناٹے قد پر گز بھر کی ہیل! غازہ اور گہری سرخ لپ اسٹک تھوپ تھاپ کر بڈھی گھوڑھی لال لگام بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اپنے آپ کو فیمی نسٹ، پی ایچ ڈی ڈاکٹر، گائناکالوجسٹ، شاعرہ، لکھاری، تجزیہ نگار، آرٹسٹ اور نہ جانے کیا کیا کہتی پھرتی ہے۔ میڈیا کے مالکان کے حرامی بچے گرا گرا کر ٹاک شوز میں آنا شروع ہو

گئی۔ اپنی ہی ویب سائٹ "سب کچھ" پر صرف اپنی ہی بکواس شائع کر کے سکالر بنی پھرتی ہے۔' رانی کی کمنٹری سرگوشی کے انداز میں شروع ہو چکی تھی۔

'بہت بہت شکریہ آپ سب مجھے اتنے غور سے سن رہے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہم نے آج تک سب سے اہم زاویے سے اپنی درسی کتب اور ادب کو دیکھا ہی نہیں جسے میں نے تنفر رن کا عنوان بخشا ہے۔ اب دیکھیے نہ یہ شاعر حضرات ہمیں جانوروں سے تشبیہ دیتے ہیں کہ اسکی آنکھیں غزالی تھیں، آواز کوئل جیسی تھی، چال ہرنی جیسی تھی، چہرہ پری کے مانند تھا۔ یہ ہے تنفر رن اور اس عورت کی توہین جو مرد کو جنم دیتی ہے اور مرد بڑا ہو کر اسی کی تضحیک کرتا ہے۔ اب ذرا محاورے ملاحظہ ہوں۔ بڑھی گھوڑی لال لگام۔ نانی نے خصم کیا برا کیا، کر کے چھوڑ دیا اور برا کیا۔ عورت پیر کی جوتی۔ چھپن چھری۔ آفت کی پر کالہ۔ بارہ من کی دھوبن۔ گھر میں نہیں ہیں دانے اماں چلی بھنانے۔ پھر یہ شاعر اپنے درد دل اور درد جگر کا ذکر کرتے تھکتے نہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا کلام اسی درد کا کمال ہیں۔ میں کہتی ہوں دنیا کا کوئی درد ماہواری کے درد سے بڑھ کر نہیں۔ اگر میر، غالب اور اقبال کو ماہواری آتی تو ان کی شاعری اس بھی کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔ سینکڑوں دیوان ہوتے۔ یقین مانیے ہر ماہواری کے بعد ایک دیوان وجود میں آ سکتا تھا۔ کاش ان سب کو ماہواری آتی! کاش انہیں یہ توفیق بھی ہوتی کہ ہمارے درد ماہواری پر کچھ لکھتے۔۔۔'

'ہاہاہاہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔'

ایک فلک شگاف قہقہہ ہال میں گونجا جو بیک وقت چار سننے والوں نے بلند کیا تھا۔۔ رابعہ، شہباز، رانی اور افسانے نے۔ چار کے علاوہ کوئی اور تھا بھی نہیں قہقہہ لگانے کے لئے۔ یہ قہقہہ اتفاق رائے کی بہترین مثال تھی۔'

لیکن دایا اس طنز کو محسوس نہ کر سکی۔ وہ سمجھی کہ لوگ شعراء کی حماقت پر ہنس رہے ہیں۔ اس لئے وہ رکی نہیں اور بولتی رہی:

'بہت بہت شکریہ۔۔۔ آپ میری بات کو اچھے سے فالو کر رہے ہیں۔ ہمارے ادیب اپنے افسانوں میں، کہانیوں میں، ناولوں میں اور ڈراموں میں عورتوں کی تضحیک کرتے ہیں۔۔ مثلاً وہ کولہے پنڈولم کی طرح مٹکاتے جا رہی تھی۔ اسکی مست آنکھوں میں شراب سے زیادہ نشہ تھا۔ اس کا سینہ قمیض سے ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔ میں پوچھتی ہوں یہ کیا بکواس ہم اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ اس اہم لیکچر کے ذریعے میں ارباب اختیار سے مطالبہ کرتی ہوں کہ نصابی کتابوں اور ہمارے ادب کو اس تنفر رن سے پاک کیا جائے۔ ایک نئی تعلیمی اور ادبی

پالیسی بنائی جائے۔ ترقی پسند ادب کی طرح ایک نیا ادب تخلیق کیا جائے جو جینڈر سینسیٹو ہو! اب آپ سوال کر سکتے ہیں۔' دایا لیکچر ختم کر کے بولی۔

'اب دیکھنا اس کی کیا درگت بنتی ہے۔۔' رانی افسانے سے بولی۔

'جی رابعہ صاحبہ۔۔' شبانہ نے رابعہ کا ہاتھ کھڑا دیکھ کر کہا۔

'شکریہ۔۔ محترمہ دایا صاحبہ۔ آپ نے پی ایچ ڈی کس یونیورسٹی سے اور کس سن میں کی؟

'اس سوال کا اس لیکچر سے کیا تعلق؟ آپ لیکچر کے بارے میں سوال کریں۔۔' دایا بگڑ کر بولی۔

'تعلق تو ہے۔۔ آپ کا دعوی ہے کہ آپ خالق ہیں تنفر رن کی اور اسی میں آپ کی پی ایچ ڈی ہے، تو ہمیں پورا پورا حق ہے یہ سوال پوچھنے کا۔' رابعہ بولی۔

'شی از رائٹ۔۔' رانی نے رابعہ کی بات کی تائید کرتے کہا۔ دایا اب شبانہ کا منہ تک رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ پھنس گئے۔ اب کیا کریں! شبانہ نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

'دراصل یہ آن لائن یونیورسٹی تھی۔۔'

'پھر بھی نام تو ہو گا کوئی؟ بتانے میں کوئی حرج ہے یا کوئی سیکرٹ ہے۔۔' رابعہ بولی۔ دایا کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ بار بار شبانہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ کچھ کہے۔ مگر شبانہ بدستور منہ پھیرے بیٹھی تھی۔

'وہ اصل میں بہت مشکل سا نام ہے اس یونیورسٹی کا۔ ابھی یاد نہیں آ رہا۔ میں بتا دوں گی۔ آپ سوال پوچھیے نا۔۔' رابعہ کی باتوں سے وہ سٹپٹا چکی تھی۔

'چلیے میں بتا دیتی ہوں۔۔' رابعہ بولی۔

'بتاؤ بھئی بتاؤ۔ ہم بھی کرتے ہیں ایک پی ایچ ڈی۔۔' رانی بولی۔

'جی رانی سب کچھ بتاتی ہوں۔ ویسے آپ تو جانتی ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی بتائے دیتی ہوں۔ دراصل تنفر رن ٹائپ کوئی سبجیکٹ، نظریہ، مفروضہ یا موضوع سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ بھونڈا سا گوگل ترجمہ ہے انگریزی کے لفظ مساجنی کا جس کا سیدھا سادا ترجمہ عورت سے نفرت ہے۔ "رن" کی جگہ اگر یہ "زن" استعمال کر لیتیں تو نقل میں کچھ عقل کا اضافہ ہو جاتا۔ بہر حال۔۔ یہ گھس پٹ چکا ہے مغرب میں۔ چونکہ اب ڈونرز یہاں فیمی نزم کا پرچار کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ڈالرز بہا رہے ہیں۔ لہذا ہماری نام نہاد سول سوسائٹی، دانشور، این جی او مافیا اور فیمی نسٹس کے ہاتھوں یہ "بندر کے ہاتھ استرے" کی مانند لگ چکا ہے۔ فیمی نسٹ بننے کے لئے چند شرائط ہیں۔ ان میں ایک مساجنی ہے۔ آج کل پی ایچ ڈی کرنا بہت ہی آسان ہے۔

گوگل پر جاؤ، کٹ اینڈ پیسٹ کرو اور ڈاکٹر بن جاؤ۔ بہت ساری نام نہاد یونیورسٹیاں جو لوگ اپنے گیراج میں بیٹھے لیپ ٹاپ سے چلا رہے ہیں کسی بھی بوگس موضوع پر چند ہزار روپوں کے عوض ایک پی ایچ ڈی ڈگری جاری کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر دایا کی ڈگری بھی ایک پرنٹ آوٹ ہے کسی ایسی ہی یونیورسٹی کی ویب سائیٹ کا۔۔۔'

'یہ جھوٹ بکواس ہے!' دایا غصے سے پھٹ پڑی۔

'اگر جھوٹ اور بکواس ہے تو اپنی یونیورسٹی کا نام بتایئے۔ سیکنڈوں میں گوگل آپ کی یونیورسٹی کا کچا چھٹا کھول کر رکھ دے گا۔ کیا کوئی اپنے ماں باپ، بچوں یا درسگاہ کا نام بھول سکتا ہے؟ رابعہ نے جب یہ کہا تو تینوں۔۔ شہباز، رانی اور افسانے تالیاں بجانا شروع ہو گئے۔

'آپ یہ مت دیکھیں کہ کون کہہ رہا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ تنفر رن ہو یا تنفر زن ہو یا مساجنی، موجود تو ہے نا ہمارے کلچر میں۔ کیا آپ کو انکار ہے اس سے؟ اس بار شبانہ بولی اور دایا کی پریشانی قدرے کم ہوئی۔۔ کہ کوئی تو بولا اس کے حق میں۔

'مساجنی ہمارے نہیں ہر معاشرے میں ہے لیکن مساجنی کی جو تعریف اور وضاحت ڈاکٹر۔۔ دایا۔۔ اعظمی۔۔۔ نے کی وہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔' رابعہ نے طنز واضح کرنے کے لئے جان بوجھ کر اس خاتون کا نام چبا چبا کر اور زور دے دے کر لیا

۔

'محاورے تو مردوں کے خلاف بھی ہیں۔۔ پہلوئے حور میں لنگور۔۔ شوہر جمورا۔۔ اس بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ اس میں تو عورت کو حور اور مرد کو جانور سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔ یہ نظر نہیں آیا آپ کو؟ ہمارے لطیفے مرد کو زن مرید کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟ کچھ محاورے عورت اور مرد دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فلاں عورت یا مرد اللہ میاں کی گائے ہے۔ اب آتے ہیں شاعری میں تشبیہ استعارے پر۔ شاعر اگر کہتا ہے کہ فلاں عورت کی آواز کوئل جیسی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بہت سریلی ہے۔ کیونکہ کوئل کی آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ مگر کتے کے بھونکنے یا گدھے کے رینکنے کی آواز کسی کو اچھی نہیں لگتی۔ اگر کسی کی آنکھیں غزالی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت بڑی اور حسین ہیں غزال کی طرح۔ اس میں عورت کی خوبصورتی کی تعریف ہو رہی ہے۔ لیکن عورت خوبصورت ہو گی تو شاعر شاعری کرے گا نا؟' یہ کہتے ہوئے رابعہ نے جان بوجھ کر اپنی نظروں کا رخ دایا کی جانب کیا۔

'دایابی بی، کچھ عرصے قبل آپ نے اپنی ویب سائٹ "سب کچھ" میں ایک مضمون لکھا جس میں آپ نے یہ انکشاف کیا کہ آپکو ماہواری بارہ برس کی عمر سے آنا شروع ہو گئی تھی؟' رابعہ اتنا کہہ کر رک گئی۔ وہ دائی اماں کی جانب دیکھ رہی تھی۔

'جی یہ درست ہے۔ بارہ سال میں ہی شروع ہوئی تھی۔'

'اس وقت آپ کی عمر ستر برس تو ہو گی۔۔۔'

'اللہ معاف کرے! میں تو ابھی چالیس کی بھی نہیں ہوئی!'

'بڑھی کھوسٹ کیسے دیدہ دلیری سے جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ اپنی عمر سے پانچ برس چھوٹی ضرور لگتی ہے لیکن اس کی اصلی عمر پچھتر برس ہے۔ رابعہ کا اندازہ بالکل درست ہے۔' رانی نے دوبارہ افسانے کے کان میں سرگوشی کی۔

'چلیں چالیس ہی فرض کر لیتے ہیں۔ اس حساب سے آپکو گذشتہ اٹھائیس برس سے ماہواری آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپکو اب تک تیس سو سے زائد بار ماہواری آچکی ہے۔ امید ہے اب بھی آ ہی رہی ہو گی کیونکہ آپ محض چالیس کی ہیں۔ اتنے طویل عرصے میں تو آپ کے کم از کم تیس دیوان آ جانے چاہیے تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ آپ ابھی تک ایک بھی "دیوان ماہواری" شائع نہ کر سکیں!' رابعہ دایا کو آڑے ہاتھوں لیتے بولی۔

'اگر ماہواری شاعری کو جنم دیتی تو کوئی میر، غالب یا کیٹس پیدا نہ ہوتا۔ اور پھر ایک مضمون میں آپ نے لکھا کہ شیکسپیر مساجنسٹ ہے لیکن آپ نے کوئی مثال نہ دی کوئی حوالہ نہ دیا۔ بس انٹرنیٹ سے چھاپا مارا اور شائع کر دیا۔ بی بی شیکسپیر مساجنسٹ نہیں۔ اس کے پلے "ہنری فور" کے دو کیریکٹر فالسٹاف اور ہاٹسپر مساجنسٹ ہیں۔ کوئی بھی لکھاری اپنی ذات میں مساجنسٹ نہیں ہوتا۔ وہ کئی کردار تخلیق کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کے بے ہودہ نظریے کی بنیاد پر ادب کی تطہیر کی گئی تو ہمارے پلے لکھاریوں اور شاعروں کے نام ہی رہ جائیں گے۔ ادب ردی کی ٹوکری میں ہو گا۔ آپ کو شکیلہ جیسی عورتیں نظر نہیں آتیں؟ اس کے ساتھ۔۔۔'

'کون شکیلہ؟' دایا نے رابعہ کی بات کاٹتے پوچھا۔ شبانہ نے غصے سے اپنے ماتھے کو پیٹا۔

'آپ کو شکیلہ تک کا علم نہیں جس کی کہانی پر ہالی اور بالی ووڈ فلمیں بنا چکا ہے۔ کئی دستاویزی فلمیں تیار ہوئیں۔ دو کتابیں لکھی گئیں۔ اور آپ چلیں ساری قوم کو مساجنی کا بھاشن دینے وہ بھی تنفر رن کے عنوان سے۔ شرم آنی چاہیے آپ کو اور شبانہ بیگم آپ کو۔ آپ دونوں پرلے درجے کی دھوکے باز اور کرپٹ خواتین ہیں۔ آپکی این جی او کو تو میں خود رپورٹ کرونگی۔ اب آپ اپنے دن گن لیں۔ جلد تالہ پڑنے والہ ہے آپ کے دفتر پر۔ اور آپکی

رپورٹ احتساب کمیشن کو بھی کرونگی۔ بہت افسوس کی بات ہیں۔ آپ لوگ معاشرے میں گمراہی، بے ہودگی اور جہالت پھیلا رہے ہیں محض اپنی جیب بھرنے کے لئے؟ اٹھو شہباز۔۔واپس چلیں!رات تک آپ کا کچا چھٹا ہمارے ویب میگزین پر ہوگا۔'رابعہ غصے میں پیر پٹختی ہال سے باہر نکل گئی۔ شہباز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

'ونڈرفل لیکچر دائی اماں۔۔مسماۃ صغراں بی بی المعروف ڈاکٹر دایا اعظمی، پی ایچ ڈی، تنفر رن بنت محمد بوٹا تر کھان سکنہ ڈھوک دلال۔ کل میں تیرے پاس آؤں گی۔ میری ایک ورکر حاملہ ہے اسی سیاستدان کے بیٹے سے جس کے باپ کی وجہ سے تیری یہ آقا شبانہ طاری دوبار پیٹ سے ہوئی اور تونے بڑی صفائی سے اس کا پیٹ صاف کر دیا تھا!'رانی دبنگ انداز میں طنز کرتے بولی۔لب کشائی کی کسی میں جرات نہ ہوئی۔

باب 28

پاگل پن سے پاگل بنانا!

غزالہ کی اس دن سے کوئی خبر نہ تھی جب وہ کشتی سے اچانک چھلانگ لگا کر جھیل میں کود پڑی تھی اور تیزی سے تیرتے تیرتے شہباز کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ شہباز نے اسے بہت تلاش کیا۔ وہ کہیں نہ ملی۔ مایوس ہو جب وہ جیٹی پر لوٹا تو کشتی والے سے پتہ چلا کہ وہ کب کی واپس جاچکی تھی۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ غزالہ کی جیپ وہاں موجود نہ تھی۔ کشتی والے نے یہ بھی بتایا کہ وہ تیر کر جیٹی تک آئی تھی اور تیزی سے گاڑی دوڑا کر چلی گئی۔

یہ بات سن کر اسکے ڈوبتے دل کو سہارا تو ملا لیکن یہ سب کچھ اسے کسی فلم کا منظر لگا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی تیزی سے پانی کے اندر تیرتی تیرتی کنارے تک پہنچ جائے؟ وہ انسان تھی یاڈالفن؟ لیکن وہ جل پرتی تو ضرور تھی! غزالہ نے پہلے اسے اپنے حسن سے پاگل بنایا۔ اب وہ اسے اپنے پاگل پن سے پاگل بنارہی تھی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ فون بجنا شروع ہوا۔

'میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ ابھی!'

'پندرہ منٹ میں تمہارے پاس ہونگا۔' شہباز نے کہا۔ فون پر غزالہ تھی۔

'نہیں۔۔۔ آج میں تمہاری مہمان ہونگی۔ اسی وقت ایڈریس سینڈ کرو۔ میں نکل رہی ہوں۔۔۔' فون کٹ چکا تھا! شہباز نے اسے دوبارہ فون کیا۔ فون مصروف! ایک بار، دو بار۔۔۔ جتنی بار ڈائل کیا مصروف ہی ملا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پتہ بذریعہ ٹیکسٹ میسج روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

'سر ایک خاتون۔۔ غزالہ افضال آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اوپر بھیج دوں؟' استقبالیہ کلرک نے شہباز سے پوچھا۔

'آنے دو۔ بلکہ ٹھہرو میں خود نیچے آتا ہوں۔۔۔' چند لمحوں بعد شہباز استقبالیہ پر تھا۔ غزالہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کالا کرتا اور سفید چوڑی دار پاجامہ اور ہاتھوں میں موتیے کے گجرے۔ آج اس کا جلوہ ہی نرالہ تھا۔ شہباز اسے دیکھتے ہی ساکت ہو گیا۔

'سر انٹری کر دیں۔۔۔' کلرک کی آواز نہ سنائی دیتی تو وہ اسی طرح جامد کھڑا غزالہ کو تکتے رہتا۔ اس نے غزالہ کا نام رجسٹر میں لکھ کر اپنے دستخط کر دیے۔ کلرک نے ملاقات کا کارڈ جاری کر دیا۔

'آئی ایم سوری فار دِس ہیسل۔ تمہیں تو معلوم ہے سیکیورٹی کی فارمیلیٹیز۔۔۔' شہباز بولا۔

'کوئی مسئلہ نہیں۔ پوش اپارٹمنٹس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیسے ہو؟' غزالہ بولی۔ اب دونوں لفٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ شہباز کا اپارٹمنٹ ساتویں فلور پر تھا۔

'تم نے تو اس دن میری جان ہی نکال دی۔۔۔ تم ایسا۔۔۔'

'تم سمجھے میں ڈوب کر مر گئی۔۔۔ ہے نا؟ غزالہ نے شہباز کی بات کاٹتے کہا۔

'اگر کشتی والا ساری بات نہ بتاتا تو یہ ہی سمجھتا۔۔۔ اس دن تم نے پاگل پن کی حد کر دی۔ جھیل میں سانپ کے علاوہ کوئی مگرمچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تمہارے پاگل پن کی وجہ سے میری دماغی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔' شہباز کے لہجے میں کچھ غصہ کچھ شکوہ تھا۔

'سانپ اور مگرمچھ بھی اس جل پری کے غلام ہیں۔ سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں میرے آگے۔۔۔' غزالہ نے کہا اور شہباز کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔ 'یہ کیسے وہی الفاظ پکڑ لیتی ہے جو میرا دماغ اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کہیں یہ جادوگرنی تو نہیں؟' وہ سوچ رہا تھا۔

'یہ کیسے ممکن ہے کوئی اتنی تیز رفتاری سے تیرتے تیرتے۔۔ وہ بھی انڈر واٹر۔۔ کنارے تک پہنچ جائے۔ تمہارے پاس تو کوئی آکسیجن سلنڈر بھی نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو مشاق ترین پیراک بھی اتنی جلدی کنارے تک نہ پہنچ سکتا۔ مجھے یہ سب نظر کا دھوکہ یا ہاتھ کی صفائی لگتی ہے۔ لگتا ہے تمہیں میجک آتا ہے۔'

'جل پری روشنی کی رفتار سے تیرتی ہے۔ تمہیں کسی چیز کا بھی علم نہیں۔ بے کار میں "باخبر صحافی" بنے پھرتے ہو!' غزالہ بولی۔ اب دونوں اپارٹمنٹ کے اندر تھے۔

'کیا لو گی؟'

'لسی پلا سکتے ہو؟ نمکین۔۔۔'

'واہ۔۔ کیا چوائس ہے۔ ابھی لایا!'

شہباز لسی میشن سے تیار کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر غزالہ نے کہا: 'اصلی لسی تو چاٹی اور مدھانی سے ہی بنتی ہے۔ یہ گوروں والی لسی ہے۔ یہ مجھے متاثر نہ کر سکے گی!'

'تم یہ عجیب و غریب حرکتیں کیوں کرتی ہو اور کب سے کر رہی ہو اور کب تک کرتی رہو گی؟' شہباز نے غزالہ کی بات سنی ان سنی کرتے کہا۔

'میں نارمل انسان نہیں ہو۔۔۔ تم سمجھنے کی بالکل بھی کوشش نہیں کرتے۔ کیا تمہاری ماں یا بہن یا کوئی اور فی میل رشتہ دار میری طرح ہے؟ کیا تمہیں اس ساری دنیا میں میرے جیسا کوئی اور کبھی ملا؟'

'ہرگز نہیں۔۔۔ اور ملے گا بھی نہیں۔ اور میں تلاش بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اچھا سنو۔ آج مجھے میرے تمام سوالوں کا جواب دو۔'

'پوچھو!'

'کیا تم اپنے شوہر اور افضال کو قتل کرانا چاہتی ہو؟'

'ہاں!'

'مگر کیوں؟'

'کیونکہ ایسا کیے بغیر میں تمہاری عمر بھر کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ ان دونوں کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔ قتل کر سکتے ہو انہیں؟ یقین مانو تم میرا یہ کام کر دو، میں اسی دن تمہاری شریک حیات بن جاؤں گی۔ اور جس طرح تم چاہو گے اسی طرح زندگی گذاروں گی۔ اگر تم چاہو گے تو میں شرعی پردہ بھی کرنا شروع کر دونگی۔ تمہیں خوبصورت سے بیٹے دونگی۔۔۔' غزالہ جوش و جذبے سے ایک ہی سانس میں یہ باتیں کہے جارہی تھی اور شہباز کے ماتھے سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

'میں لکھاری ہوں۔ کرائے کا قاتل نہیں۔ میں نے تو زندگی میں صرف مچھر، مکھی اور لال بیگ ہی مارے ہیں۔ یہ ممکن نہیں۔'

'تو پھر مجھے پانے کا خواب دل سے نکال دو۔ اسی طرح پا لیا کرو مجھے جیسے آج پایا۔۔ اچانک۔'

'تا کہ تم کوئی نیا پاگل پن کر سکو!' شہباز نے کہا اور غزالہ ہنسنے لگ گئی۔

'یہ پاگل پن ہی میرا اسٹائل ہے جس پر تم مرتے ہو۔'

'لیکن اس دن تم نے کہا تھا کہ افضال تم سے سچا پیار کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیوں تم اسکا مرڈر کرانا چاہتی ہو؟'

'اس کی وجہ بھی تم ہی ہو!' غزالہ نے کہا۔

'میں کیسے؟'

'تم شادی کرنا چاہتے ہو نہ مجھ سے! اس لئے نہ صرف افضال بلکہ میرے شوہر کو بھی ٹھکانے لگانا پڑے گا۔ خود نہیں کر سکتے تو کروا دو کسی سے۔۔ پیسے میں دے دوں گی۔'

'پیسوں کی بات نہیں ہے۔ یہ گناہ عظیم ہو گا۔ ایک قتل ساری انسانیت کا قتل ہے!'

'اچھا یہ جو تم میرے ساتھ سوتے ہو، یہ تو بہت ہی ثواب کا کام ہے! یہ جو تم شراب نوشی کرتے ہو، یہ کیا ثواب دارین کے لئے کرتے ہو؟' غزالہ کی دلیل کا شہباز کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

'یہ سب گناہِ کبیرہ ہیں لیکن ان کی توبہ ہے۔ قتل کی توبہ نہیں۔ شراب پینا، زنا کرنا۔۔ یہ سب حقوق اللہ ہے۔۔ حقوق العباد نہیں۔ اسکا۔۔۔'

'ایک منٹ مولانا۔۔ ایک منٹ رکیے۔۔۔' غزالہ اس کی بات کاٹتے بولی۔

'تم کسی انسان کی غیر موجودگی میں اس کے گھر آکر اسکی بیوی کے ساتھ زنا کرو اور یہ حقوق العباد نہیں؟ تم نے میرے شوہر کا حق غضب کیا۔ یہ حقوق اللہ نہیں حقوق العباد ہے۔ اور میں اس گناہ میں برابر کی شریک ہوں۔ لیکن میری دلیل یہ ہے کہ جہاں اتنے گناہ کر لئے۔۔ چند لمحوں کی لذت کے لئے۔۔ تو ایک گناہ اور سہی۔ یہ گناہ تو دائمی لذت کے لئے ہو گا۔ کیا ہرج ہے دونوں کو قتل کرنے میں؟ افضال اپنی سگی بہن کے ساتھ زنا کرتا ہے۔ اس کی سگی بہن ہی اس کے بیٹوں کی ماں ہے۔ اسے قتل کرنا تو ثواب کا کام ہو گا۔'

'چلو مان لیا افضال کو قتل کرنا ثواب ہے۔ پر تمہارے شوہر کو کس جرم میں قتل کیا جائے؟' شہباز نے پوچھا۔

'وہ بھی ایک قسم کا دوسرا افضال ہے۔۔۔'

'کیا مطلب؟ وہ بھی اپنی سگی بہن کے ساتھ۔۔۔'

'بہن نہیں سگی ماں کے ساتھ!' غزالہ نے تیزی سے شہباز کی بات کاٹتے کہا۔

'لہذا دونوں کو قتل کرنا ثواب کا کام ہے۔ تم نہیں کرو گے تو میں کر دونگی کسی دن۔۔ بس موقع کی تلاش ہے مجھے!' غزالہ نے کہا۔ اس کے جنونی خیالات جان کر وہ جھیل والے واقعے کی حیرت بھول چکا تھا۔ آج غزالہ اس پر حیرت کا بہت بڑا پہاڑ گرا چکی تھی۔ اسے اپنا دماغ جلتے ہوئے محسوس ہوا۔

'میں ابھی آیا۔۔۔' شہباز یہ کہہ کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا سر پانی سے بھری بالٹی کے اندر ڈال دیا تاکہ اس کے تیزی سے گرم ہوتے اعصاب ٹھنڈے پڑ سکیں ورنہ وہ ایک دھماکے سے پھٹ جائینگے۔ ایسا کر کے اسے بہت سکون ملا۔ کچھ دیر اپنا سر بالٹی میں رکھنے کے بعد وہ بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر نکلا تو اپنے جسم میں ایک سرد لہر دوڑتے محسوس کی۔ غزالہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی جانب پھیلائے اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔۔ مکمل برہنہ کھڑی ہوئے!

'شہباز۔۔۔جب تمہارا دماغ جل رہا تو میری بانہوں میں آجایا کرو۔ ٹھنڈا پانی تمہارے کسی کام نہیں آئے گا!' غزالہ نے اسے کہا۔ اب شہباز کا سارا بدن جلنا شروع ہو چکا تھا!

باب 29

بیٹے کی خواہش!

پچھلے تین دنوں سے ملک اور اس کی بیوی کا ڈبل بیڈ محمودہ کے زیر استعمال تھا۔ ملک کی بیوی میکے میں تھی۔ جب جب ایسا ہوتا ملک دفتر نہ جاتا۔ کام گھر سے ہی کرتا۔
جب تھک جاتا تو محمودہ اسے آرام پہنچا کر دوبارہ تازہ دم کر دیتی۔ تھکن کا یہ احساس اسے دن میں کم از کم تین بار تو ضرور ہوتا۔ محمودہ بھی اسکی تھکن اتارنے کے لئے سو سو جتن کرتی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دوسرے نوکر سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ اس کے دونوں بیٹے دفتر میں تھے۔ وہ تھکن سے چور محمودہ کے سامنے پڑا تھا۔
'ملک صاحب۔۔ آج میں پھر آپ سے وہی پرانی خواہش دہرا رہی ہوں۔ صرف ایک بیٹا اور عنایت کر دیجئے مجھے۔ آج کوئی احتیاط نہ برتیے۔ جس جان نے آنا ہے آ کر ہی رہتی ہے۔ کر دیجئے نہ یہ خواہش پوری؟ آپ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کر دیجئے آج! میں آپ کے حق میں تاحیات دعا گو رہوں گی۔' محمودہ ملک کے آگے گڑگڑا رہی تھی۔
'یہ ممکن نہیں۔ میرا سابقہ پچھتاوا ہی مجھے چین سے سونے نہیں دیتا۔ بوبی اتنا پیارا بچہ ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اسے گود میں اٹھا کر پیار کروں۔ بہت دل کرتا ہے اسے اپناؤں لیکن یہ ممکن نہیں۔ وہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیٹی نہیں ہوئی۔ ورنہ میں تو جیتے جی مر جاتا۔۔'
'کیوں ملک صاحب۔۔ بیٹیوں سے اتنی نفرت کیوں ہے آپ کو؟' محمودہ نے پوچھا۔
'بیٹی مرد کی غیرت ہوتی ہے محمودہ۔ تجھ سے ہوتی تو تیرے ہی جیسی ہوتی۔ کسی نہ کسی کا بستر گرم کر رہی ہوتی اس وقت۔ میری تو اب بھی بیٹی کی خواہش ہے مگر اب تمہاری بیگم صاحبہ مزید بچے پیدا نہیں کر سکتیں اور میں دوسری شادی۔۔۔ کھل کر یا چھپ کر بھی نہیں کر سکتا۔' ملک نے کڑوا سچ اگل ہی دیا جسے سن کر محمودہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔
'تو رو رہی ہے؟ غلطی ہو گئی۔ منہ سے نکل گیا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دے محمودہ۔۔' ملک نے ہاتھ جوڑتے کہا۔ اسے فوراً احساس ہو چکا تھا اپنی غلطی کا۔ بات بہت ہی سخت تھی جو محمودہ کے دل پر تیر کی طرح پیوست ہو چکی تھی۔ ملک محمودہ کو واقعی بہت چاہتا تھا۔ اگر ذرا بھی ممکن ہوتا تو رحیم سے خلع دلوا کر اس سے شادی کر لیتا۔

'آپ کیوں معافی مانگ رہے ہیں۔۔سچ ہی تو کہا آپ نے۔۔۔افسانے آپ کی بیٹی نہیں۔ پھر بھی وہی کر رہی ہے جو آپ نے ابھی ابھی کہا۔۔۔' محمودہ ملک سے گھر کی کوئی بات نہ چھپاتی۔ افسانے اور بوبی کا رشتہ اور اسکی نئی نوکری کا حال۔۔سب کچھ ملک کے علم تھا۔ وہ بھی بہت بڑا رازدان مرد تھا۔ ہر شے نگل جاتا تھا۔ دکھی ضرور ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ کس حیثیت میں بوبی کی اصلاح کرے؟ کیوں افسانے کو غیرت کے نام پر قتل کرے؟ وہ تو اس کا خون ہی نہ تھی! وہ اکثر سوچتا کہ وہ مکمل بے غیرت ہو چکا ہے۔ وہ محمودہ کے ساتھ سوتا۔ دونوں بیٹے محمودہ کے ساتھ سوتے۔ بیوی تک محمودہ کے ساتھ سوتی۔ حمام میں سب ہی ننگے تھے! دونوں بیٹوں کو اس کے کرتوتوں کا علم تھا۔ وہ اس کا پردہ رکھتے اور باپ ان کا۔ باہمی احترام اسی کا نام تھا۔

'ہم دونوں کے ساتھ مکافات عمل ہو رہا ہے محمودہ۔ صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں!' ملک اسے تسلی دے رہا تھا۔ نہ جانے محمودہ کو کیا سوجھی، جھٹ سے طیش میں آگئی اور دوٹوک انداز میں ملک کو ایسی دھمکی دے ڈالی جس کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے اس لمحے محمودہ کو قدرتی انداز میں پیار کیا۔ ایک نہیں کئی بار! مگر وہ اداس تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے محمودہ کی خواہش پورا کرنا پڑی۔ کیا کرتا۔۔۔بے بس تھا۔

وہ نہ کرتا تو اس کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی ایک کر دیتا! گو وہ دونوں بھی احتیاط کے قائل تھے مگر محمودہ کی خواہش کے آگے فوراً ڈھیر ہو سکتے تھے۔ اس عورت کا حسن بڑوں بڑوں کی عقل پر پردہ ڈال سکتا تھا۔ اب اس کی رب ذوالجلال سے ایک ہی دعا تھی۔۔لڑکی نہ ہو! ادھر یہ ہی دعا محمودہ کے لبوں پر بھی تھی۔ وہ اپنے آنسو بھول چکی تھی۔ اب وہ بے انتہا خوش تھی۔ وہ نماز پڑھنا چاہتی تھی۔ غسل کرنے سے پہلے اس نے ملک کے پیر چومے جیسے وہ کوئی پہنچا ہوا پیر ہو اور وہ اسکی مریدنی۔ ایسی جو بیٹے کی خواہش لئے در در بھٹک رہی تھی۔ اور آج اسے بیٹا مل ہی گیا!

باب 30

عورت مارچ پر دوسری میٹنگ

'ساروی، شبانہ اور سائرہ صاحبہ۔۔ آپ تینوں کے سامنے ایک ایک کاغذ رکھا ہوا ہے۔ ہر کاغذ پر متن مختلف ہے۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ اس کاغذ کو غور سے پڑھ لیں اور اس پر جو کچھ بھی لکھا ہے اسے ذہن نشین کر لیں۔ اسکے بعد ہم میٹنگ شروع کرتے ہیں۔ متن بہت ہی مختصر ہے۔ پڑھنے میں دو تین سیکنڈز لگیں گے۔'

افسانے نے بہت اعتماد سے تینوں خواتین سے کہا جو اس سے عمر اور تجربے میں کہیں زیادہ بڑی تھیں۔ اس کے لہجے میں موجود رعب و دبدبہ رانی کی دین تھا جو اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ میٹنگ کی سربراہی آج افسانے کر رہی تھی۔ رانی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ تینوں سینئیر خواتین پیچ و تاب کھا رہیں تھی۔

'میرے کاغذ پر اس ملک کے ایک مشہور میڈیا ہاؤس کے مالک کا نام ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔' شبانہ وہ نام پکارتے بولی۔

'میرے پاس بھی ایسا ہی ایک نام ہے۔' سائرہ بھی نام پکارتے بولی۔ یہ نام پہلے والے نام سے مختلف تھا۔ یہ ایک دوسرے مشہور میڈیا ہاؤس کے مالک کا نام تھا۔

'اور میرے کاغذ پر ملک کے سب سے بڑے میڈیا ہاؤس کے مالک کا نام ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں!' ساروی بہت جوش اور فخر سے بولی جیسے وہ باقی دو خواتین پر بازی لے گئی ہو۔

'امید ہے وہ بھی آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہو گا!' افسانے کے لہجے میں گہرا طنز چھپا ہوا تھا جسے سوائے ساروی سب محسوس کر چکے تھے۔

'ہاں جی کیوں نہیں۔ یہ دیکھیں رات ہی ان سے واٹس ایپ پر باتیں ہو رہی تھیں۔۔' ساروی اپنا سمارٹ فون ہاتھ بلند کر کے لہرانے لگی۔

'شٹ اپ ساروی۔ گرو اپ! ہر وقت کا چھچھورپن اچھا نہیں ہوتا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کون تمہیں جانتا ہے اور کون نہیں۔ ناؤ لسن ٹو افسانے کئیر فلی!' رانی نے اسے جھاڑ پلاتے کہا۔

'سوری!' ساروی اپنی نشت پر دبک کر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ کی طرح سائرہ اور شبانہ اسکی بے عزتی پر خوش ہوئے۔

'یہ تینوں نام ہمارے منصوبے کو آگے بڑھانے میں مدد کرینگے۔ ان تینوں کا منہ ہمارا ڈونر بھر چکا ہے۔ ہم نے صرف سوئیٹ ڈش پیش کرنی ہے۔ شبانہ۔۔۔ تم۔۔۔! جس شخص کا نام تمہارے کاغذ پر ہے وہ ابھی تک تمہارے حسن پر مرتا ہے۔ اسے سوئیٹ ڈش تم پیش کرو گی۔۔ اپنے گھر پر یا اس کے بنگلے پر۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔۔ تاکہ ہم۔۔'

'یہ کیا بے ہودگی ہے؟' شبانہ نے رانی کی بات کاٹتے کہا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔ گو میٹنگ کی سربراہی افسانے کر رہی تھی لیکن سکرپٹ میں چیدہ چیدہ مکالمے رانی نے ہی ادا کرنے تھے۔ وہ اپنی باری پر اس "ڈرامے" میں داخل ہو چکی تھی اور اپنے مکالمے بہت مہارت سے ادا کر رہی تھی۔ سننے والے دم بخود تھے۔

'آئی ایم اے پروفشنل، ناٹ اے پراسچی ٹیوٹ!' شبانہ اونچی آواز میں بولی۔ وہ آپے سے باہر تھی۔

'اوکے۔ ابھی دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔۔' رانی نی یہ کہہ کر اپنا فون نکالا اور چند بٹن دبائے۔ فون بلیوٹوتھ کے ذریعے دیوار پر لٹکی ایک بہت بڑی ٹی وی سکرین سے منسلک ہوا اور ایک فلم چلنے لگی۔ یہ شبانہ کی فلم تھی۔۔ سکرین پر اسے ایک بہت بڑی ہستی کے مست برہنہ حالت میں دیکھا جا سکتا تھا۔ چند سیکنڈز بعد رانی نے فون سکرین سے منقطع کر دیا۔

'وقت کی کمی کے باعث آپ کو پوری فلم دکھانا ممکن نہیں۔ پھر فلم ایک نہیں کئی ہیں۔ آپ سب کی ہیں! لہذا کوئی بھی شرافت کے لبادے میں چھپنے کی کوشش نہ کرے اور مشن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جا سکتا!' اس بار رانی کے بجائے افسانے بولی۔ شبانہ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ اسکے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سائرہ بولی:

'ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ہمارا مقصد نیک ہے اور ایک ہے۔ ہمیں رانی کی قیادت پر پورا بھروسہ ہے۔ اور فخر بھی ہے۔ ہمارا مشن اس ملک کی خدمت ہے۔ اس کے لیے ہم کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرینگے۔۔'

'تھینک یو سائرہ صاحبہ۔ جیسا کہ رانی نے بتایا کہ کھانا ٹھونس کر کھلایا جا چکا ہے۔ آپ لوگوں نے صرف میٹھا پیش کرنا ہے۔ شبانہ آپ پرانے دوست سے رنجش مٹا کر دوبارہ رشتہ استوار کریں۔ ساروی۔۔ آپ عمرانہ اور ستارہ کو سمجھا دیجیے کہ اس میڈیا ہاوس کے مالک کے علاوہ تمام سینئیر اینکرز کو بھی خوش رکھے۔ اصلی کام تو وہ بیچارے کرتے ہیں! اور سائرہ بی بی

آپکی گڈری میں بھی چند لعل موجود ہیں۔ انہیں استعمال کیجئے اور اپنے میڈیا ہاؤس کو مٹھی میں کیجئے۔ ہم نے انہیں پہلے ہی مطلع کر دیا ہے کہ آپ تینوں اب ہمارے پارٹنرز ہیں۔ اب یہ آپ کو دھڑا دھڑ ٹاک شوز پر بلائیں گے۔ موضوع ہو گا "عورت مارچ" اور "میرا جسم میری مرضی"۔ اس نظریے کے مخالفین بھی شوز پر ہونگے۔ لیکن انہیں اپنی بات کہنے کا موقع کم اور آپ کو نسبتاً زیادہ دیا جائے گا۔ اینکر آپ کے موقف کی حمایت کرے گا۔ کیمرہ آپ لوگوں کو فوکس کرے گا اور آپ سب چند ہی روز میں سیلے بریٹیز بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو لکھے لکھائے مضامین دیے جائیں گے۔۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں۔ آپ نے انہیں غور سے پڑھ لینا ہے۔ یہ آپ کے نام سے چوٹی کے اخبارات میں شائع ہونگے۔ اس طرح آپ سب مستند دانشور، لبرل، سول سوسائٹی ایکٹیوسٹ، فیمی نسٹ وغیرہ وغیرہ بن کر ابھریں گے۔ یہ بہت بڑا منصوبہ ہے۔ جتنا آپ نے ساری عمر کمایا اس سے کہیں زیادہ آپ ایک سال میں اس پراجیکٹ کی بدولت کما لیں گی۔ آپکی این جی او کا پروفائل بھی کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اب آپ جائیں اور ٹاک شوز میں کیا کچھ کہنا ہے، اس کی تیاری کریں۔ سب کچھ آپ نے ایل جی بی ٹی کیو کے کنٹیکسٹ میں کرنا ہے۔ ہر چیز کو اچھی طرح کور کرنا ہے۔ مولوی لوگ آپ کو مشتعل کرینگے۔ آپ نے غصے میں نہیں آنا۔ یہ ہدایت خاص طور پر ساروی صاحبہ آپ کے لئے ہے۔ آپ کو اپنے غصے پر ذرا قابو نہیں رہتا۔ آپ گالم گلوچ اور بد تمیزی پر اتر آتی ہیں۔ امید ہے آپ نے حالیہ واقعے سے کوئی نہ کوئی سبق تو سیکھ ہی لیا ہو گا۔' افسانے نے ساروی کی جانب دیکھتے چوٹ کی۔ یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ اسے اچھی طرح علم تھا اسکی عمرانہ اور ستارہ کے ہاتھوں پٹائی کا۔ ساروی کچھ نہ بولی بس سر ہلاتی رہی۔ اندر اندر غصے سے پھٹی جا رہی تھی۔

'ٹاک شوز پر ہی انحصار کرنا کافی نہ ہو گا۔ آپ تینوں کے اچھے تعلقات ہیں سرکاری جامعات میں۔ انہیں استعمال کیجئے۔ "مکالمہ" ٹائپ پروگرامز رکھیے۔ نئی نسل کے ذہن میں یہ زہر باآسانی اتر جائے گا۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا گروپس بنائیے اور وہاں ان سب چیزوں کا شدومد سے پرچار کیجئے۔ یہ سب کچھ وومن ڈے سے پہلے ہو جانا چاہیے تاکہ مارچ والے دن زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ اس حوالے سے میں افسانے کی بے حد مشکور ہوں۔ بھئی انہوں نے ایک ناقابل یقین معرکہ انجام دیا ہے۔ لیکن آپ سب کو بتانے سے پہلے میں یہ چاہوں گی کہ آپ اپنے وسیع تجربے کی بنا پر میرے ایک سوال کا جواب دیں۔۔۔'اس بار رانی مخاطب تھی۔

'جی جی پوچھیئے۔۔۔'سب خواتین بولیں۔

'اگر میں آپ سے کہوں کہ دس دن کے اندر اندر کچی آبادی سے عورتیں بطور مظاہرین مارچ کے لئے اکٹھا کریں۔ قیمت فی عورت ایک ہزار روپے تو آپ کتنی اکھٹا کر سکیں گی؟' رانی نے سب سے اک عجیب سوال کر دیا۔

'میں پچاس اکھٹے کر سکوں گی۔' سائرہ بولی۔

'میں ساٹھ ستر کے قریب کر لوں گی۔' شبانہ بولی۔

'بس۔۔۔ پچاس اور ساٹھ یا ستر! میں تو ہزار تک کر سکتی ہوں۔ ویسے کوئی اتنا بھی کر کے دکھا دے تو مان جاؤں۔ اور اس سے زیادہ کر دے تو بے شک تھوک دے میرے منہ پر! ساروی بہت فخر سے بولی۔ رانی اسے غصے سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے افسانے کو اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی اسے کیا کرنا ہے۔ وہ اپنی نشت سے اٹھی اور ساروی کے منہ پر تھوک دیا!

'حرامزادی گشتی کتیا کی بچی! ساروی نے طیش کھا کر افسانے کو کہا اور جو اس کے بعد ہوا اسے دیکھ کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ افسانے نے ایک زوردار طمانچہ ساروی کے گال پر رسید کیا۔ پھر بالوں سے گھسیٹ کر اسے کرسی سے گرا دیا۔ اس کے بعد دے دھنا دھن تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ ساروی کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون نکلنے لگا۔ سائرہ اور شبانہ نے مل کر افسانے کو کنٹرول کیا۔ وہ پانچ فٹ دس انچ کی لڑکی تھی۔ اسے قابو کرنا آسان نہ تھا۔ رانی اس سارے منظر کو موبائل کے ذریعے فلم بند کر رہی تھی۔ اس کا اشارہ دیکھ کر افسانے ساروی کو چھوڑ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ رانی اگر اشارہ نہ کرتی تو افسانے ابھی تک ساروی کی پٹائی کرتی رہتی۔ جسمانی طور پر وہ ان تینوں عورتوں پر بھاری تھی۔

سائرہ اور شبانہ نے سہارا دیکر ساروی کو کرسی پر بٹھایا۔ پانی پلایا۔ اس مشق کے دوران وہ دونوں بھی ہانپنے لگیں۔ ساروی کے حواس بحال ہوئے تو روہانسی ہو کر رانی کے آگے دہائی دینے لگی۔

'غلطی تمہاری ہے۔ تم نے اسکی ماں کو گالی کیوں دی؟ اسے گشتی اور کتیا کیوں کہا؟ کیا تم نے ماضی سے ابھی تک کوئی سبق نہیں سیکھا؟ تم کب میچور ہو گی؟' رانی نے الٹا اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

'اس نے میرے منہ پر تھوکا اور آپ مجھے موردالزام ٹھہرا رہی ہیں؟'

'اس نے تمہارے منہ پر نہیں تھوکا۔ تم نے اسے خود کہا کہ تمہارے منہ پر تھوکے۔ اسنے تو تمہاری خواہش کا احترام کیا۔' رانی کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سب اس کا منہ تک رہے تھے۔

'افسانے نے پانچ ہزار خواتین اکھٹی کی ہیں۔ وہ اور بھی کر سکتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ پانچ ہزار بہت ہیں اس سال کے ڈے پر۔ اس کے لئے مزید پانچ ہزار اکھٹا کرنا مشکل نہ تھا۔ مزید وضاحت کروں اگر اب بھی بات سمجھ میں نہیں آئی تو؟' رانی کی اس بات نے سب کا منہ حیرت سے کھول دیا۔

'اب تمہارے پاس دو آپشنز ہیں۔ یا تو افسانے سے معافی مانگو یا پھر اس پراجیکٹ سے ہاتھ دھولو۔۔' رانی ساروی کو الٹی میٹم دیتے بولی۔

'آئی ایم سوری افسانے۔ تم نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ میں شرط ہار گئی۔ میں شرمندہ ہوں!' پراجیکٹ سے علیحدگی کا مطلب اپنی قبر کھودنا تھا۔ رانی نے جھٹ سے میکس کو شکایت کرنا تھی۔ وڈیو وہ بنا ہی چکی تھی۔ سائرہ اور شبانہ نے اس کے خلاف گواہی دینا تھی۔ اس کے حصے کا مال ان دونوں نے ہڑپ کر لینا تھا۔ اور میکس نے اسکے موجودہ پراجیکٹس بھی کینسل کر دینے تھے۔ اس وقت جھکنے میں ہی عافیت تھی۔ سو وہ جھک گئی۔

'آپ لوگ ان پانچ ہزار عورتوں کے لئے پلے کارڈ تیار کرنا شروع کر دیں اور ایک حماقت سے بچیے گا۔ یہ کچی آبادی سے ہیں۔ پلے کارڈ ان کی زبان میں ہونے چاہییں۔ یعنی اردو یا پنجابی میں۔ انگریزی والے نہ تھما دیجئے گا ان کے ہاتھ میں!' سائرہ اور شبانہ بھی افسانے کو اس عقلمندی پر داد دیے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ بے ساختہ داد تھی جیسے کوئی زور سے واہ کہتا ہے کسی غزل کے خوبصورت شعر پر!

'یہ بہت ہی حساس معاملہ ہے۔ دھیان سے ہینڈل کیجئے گا ورنہ نتائج انتہائی سنگین ہو سکتے ہیں۔ مولویوں سے کوئی پنگا نہ لے لیجئے گا!' افسانے نے دوٹوک لہجے میں بات ایسے ختم کی جیسے وہ تینوں اس کے ادنیٰ ماتحت ہوں۔'

'یو میڈ ایوری تھنگ ویری کلئیر! تھینک یو۔۔' سائرہ نے کہا اور اس کی دیکھا دیکھی نہ چاہتے ہوئے باقیوں کو بھی رانی اور افسانے کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

'تو تو منہ زور گھوڑی ہے۔ دیکھ تو کسی فلم کا سین لگ رہا ہے۔ تو ایتابھ بچن لگ رہی ہے اور ساروی ولن کی طرح مار کھائے جا رہی ہے۔' رانی نے افسانے کو موبائل پر فلم دکھاتے کہا۔

'اچھا یہ بتا تو نے اتنے کم دنوں میں پانچ ہزار عورتیں کیسے اکھٹے کر لیں؟'

'بس قیمت چکا دی صرف لمحہ بھر سوچ کر۔۔' افسانے بولی۔

'کیا مطلب؟ قیمت تو دفتر دے رہا ہے۔۔۔' بات رانی کی سمجھ میں نہیں آئی۔

'یہ سب کچھ میرے کزن دیپے نے کیا ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ ایک پیسہ بھی نہیں لے گا اور یہ کام کر دے گا لیکن میں اس سے شادی کے لئے ہاں کر دوں۔۔۔'

'تو یہ قیمت چکائی تو نے۔۔۔'

'نہیں۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میری اس سے شادی ناممکن ہے۔'

'تو پھر کونسی قیمت چکائی تو نے؟'

'اس نے ایک اور شرط رکھی۔ وہ میرے ساتھ سونا چاہتا تھا۔ اس صورت میں بھی وہ کچھ نہیں لے گا۔ میں نے یہ قیمت چکائی۔۔۔'

'ارے واہ۔۔ دل خوش کر دیا۔ اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنے کی قوت! اچھا تجھے بعد میں کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا؟ کیونکہ تو دیپے کو شدید ناپسند کرتی ہے۔۔۔'

'آپ کی شاگرد ہوں۔ آپ ہی نے نصیحت کی تھی کہ جیون میں کسی چیز کا رگریٹ نہ کرنا ورنہ زندگی ساری عمر دکھی گذرے گی۔ اور ناپسند اسے شوہر کے روپ میں کرتی ہوں۔ میں کوئی اس کی بیوی تو بن نہیں گئی!' افسانے نے شرارتی لہجے میں کہا۔

'اف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔' رانی کے منہ سے اک سرد آہ نکلی۔ اچھا یہ تو بتا کیسا تھا وہ؟' اب رانی سوالوں سے لطف اندوز ہونا شروع ہو گئی تھی۔

'میکس کی طرح منہ زور گھوڑا!' افسانے نے قہقہہ بلند کرتے کہا۔ رانی قہقے لگانی لگی۔

'اچھا یہ بتا کتنی بار ہوا؟'

'صرف چار بار!' افسانے ہنستے ہوئے بولی۔

'کتنا ٹائم دیا تو نے اسے؟'

'یہ ہی کوئی تین گھنٹے۔۔'

'بوبی نہیں تھا گھر پر؟'

'وہ شمیم کے ہاں فلم دیکھ رہا تھا۔۔' افسانے بولی۔ رانی کی آنکھوں میں شیطانی چمک اُمڈ رہی تھی۔

'پھر ایک کام اور کر۔۔'

'کیا؟'

'بوبی کے ساتھ دیپے کو بھی لے آ۔ زبردست جشن ہو گا! لائے گی نا؟'

'کیوں نہیں۔ اب تو مجھے بھی جشن منانا آ گیا ہے۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔' افسانے نے یہ جملہ سنجیدہ انداز میں کہا۔ رانی مطلب سمجھ گئی۔ کہیں دل کے کسی گوشے میں خفیف سا پچھتاوا

بول رہا تھا جس کی زندگی چند لمحات سے زیادہ نہ تھی۔ ایسے پچھتاوے اسے بھی ہوا کرتے تھے مگر ایک یا دو منٹ سے زیادہ دیر کے لئے نہیں!

'پھر وہ دس لاکھ کا چیک میں تیرے نام لکھوں گی۔۔'رانی بولی۔

'کون سا دس لاکھ کا؟'افسانے نے حیرت سے پوچھا۔

'ارے طے یہ پایا تھا کہ دیسی کوئی عورت دو سو روپے کمیشن ملے گا۔ اب اسے تو اپنی پے منٹ مل گئی۔ لہذا اس پیسے پر تیرا حق ہے۔ تو یہ پیسہ اپنے ملبوسات پر خرچ کرنا۔ اور ہاں تیری ڈرائیونگ کلاس کیسی جا رہی ہے؟'

'جناب اب میں گاڑی چلا سکتی ہوں۔ تنگ سے تنگ جگہ میں ریورس بھی کر لیتی ہوں۔ اگلی بار ڈرائیور کی جگہ میں چلاؤں گی۔ پرائیویسی اچھی ہے نہ!'افسانے آنکھ مارتے بولی۔

'تو بھی ایک نمبر کی حرافہ ہے میری طرح!'رانی نے قہقہہ لگاتے کہا اور پھر دونوں دیر تک قہقہے لگاتی رہیں۔ افسانے کو ایک اور بہت عظیم دوست اور ماں مل چکی تھی رانی کی صورت میں!

باب 31

گدھا گھوڑے سے بھی اوپر ہو گیا!

شہباز کی حیرت اور غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ واقعہ ہی ایسا مضحکہ خیز تھا۔ نپولین کی آل سٹاف کو لکھی ای میل پڑھتا، پھر ایک گھونٹ پانی پیتا۔ یہ ہی ایک طریقہ تھا غصے کو قابو میں رکھنے کا۔

نپولین نے ساری عمر اپنا نائب نہ مقرر کیا۔۔ یہ سوچ کر کہ کسی دن اس کا ہی پتہ نہ گول کر دے۔ اپنے ہی دوستوں کو بورڈ کا ممبر رکھا تا کہ کوئی اس کے کام میں دخل نہ دے۔ "اب نپولین کا زوال شروع ہو جائے گا۔ اسے ہوشیار کرنے کا فائدہ کچھ نہیں۔ وہ بہت ضدی ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔" شہباز یہ گفتگو اپنے آپ سے کر رہا تھا۔

اسی لمحے ایک اور ای میل وارد ہوئی۔ یہ شہسوار کی تھی۔۔ آل سٹاف کو۔ وہ استعفی دے چکا تھا۔ وجہ میں وہی دو گھسے پٹے الفاظ تھے۔۔ "ذاتی وجوہات"۔ لیکن بات ایسی نہ تھی کہ کوئی سمجھ نہ سکے۔ نپولین مینا کو ادارے کا نائب سربراہ مقرر کر چکا تھا۔ اب شہسوار اور شہباز مینا کے نیچے تھے۔ پہلے گدھا گھوڑے کے برابر ہوا اور اب اس سے بھی اوپر۔ یہ سب نپولین کا کمال تھا۔

'آج آپ نے اپنے پیر پر کلہاڑی مار لی! اور ایک نہیں دو۔' شہباز نے کہا۔

'کیسے؟' نپولین نے پوچھا۔

'مینا کو ڈپٹی ہیڈ اور مہناز کو بورڈ ممبر بنا کر۔ مہناز کی شہرت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ سب اس کی این جی او کو چکلہ کہتے ہیں اور اسے ایک ہائی لیول نائکہ جسے کے بڑھاپے میں بھی سینکڑوں عاشق ہیں۔ آپ کو یہ دو ہی نظر آئے؟ اور اس کا فوری نتیجہ تو دیکھ ہی لیا ہو گا آپ نے؟' شہباز بولا۔

'فوری نتیجہ۔۔۔ کیا فوری نتیجہ؟' نپولین نے پوچھا۔

'ای میل ری فریش کیجئے۔ نپولین نے استعفی دے دیا ہے۔ اور چند منٹوں بعد میں دے رہا ہوں۔ میں آپکی رکھیل کے نیچے کام نہیں کر سکتا!' شہباز دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

'لگام دو اپنی زبان کو۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ سب کے سکینڈلز ہیں۔ میر اایک بھی نہیں ہے۔ مجھے دلی صدمہ ہوا تمہارے منہ سے یہ سن کر۔۔۔' نپولین کی آواز میں غصہ اور افسوس دونوں موجود تھے۔

'زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔ اب تو یہ زبان زد عام ہے۔۔۔'شہباز طنزیہ انداز میں بولا۔

'میں نے زندگی میں لوگوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو اس کے دماغ کا فتور ہے۔ شہسوار اور تمہارا استعفی منظور!'شہباز یہ سن کر باہر نکل آیا۔ "اب میں زندگی بھر نوکری نہیں کرونگا۔" یہ عہد اس نے اپنے آپ سے کیا اور اپنی چند چیزیں سمیٹ کر دفتر کی چابیاں ریسیپشنسٹ کے حوالے کر دیں۔

باب 32

پرس میں کنڈوم یا چاقو؟

ملک کے سب سے بڑے ٹی وی چینل پر ساروی سرمست ایک لائیو شو میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو لیکچر دے رہی تھی۔ یہ ٹاک شو نہیں تھا۔ ایک تعلیمی شو تھا۔ اس کا طریقہ واردات دیگر پروگرامز سے مختلف تھا۔ ایک موضوع چنا جاتا۔ اس پر کوئی بولنے والا یا بولنے والی آکر اظہار رائے کرتی۔۔ ایسے جیسے سننے والے گدھے ہوں۔ کسی چیز کا کوئی علم نہ رکھتے ہوں۔ پندرہ بیس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی اس میں بطور مہمان شریک ہوتیں۔

'ریپ کے کیسز میں آج کل بہت سی خواتین پریگنینٹ ہو رہی ہیں۔ دیکھیے وقت آگیا ہے کہ ہم تلخ حقائق منطق کی بنا پر۔۔ مذہب، کلچر یا رسم و روایت ایک طرف رکھ کے۔۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ مغرب میں مائیں اپنی بچیوں کو بچپن سے ہی یہ آگاہی دینا شروع ہو جاتیں ہیں کہ اگر کوئی تمہیں ریپ کرے تو بالکل بھی مزاحمت نہ کرنا۔ چپ چاپ پرس سے کنڈوم نکال کر اسے دے دینا۔ پھر کہنا کہ بھائی جو تیری مرضی تو کر مگر کنڈوم استعمال کر۔ ایڈز کا بہت خطرہ ہے۔ تجھے بھی لگ سکتی ہے اور مجھے بھی! ہمیں مغرب کی اچھی باتوں کو اپنانا چاہیے ورنہ دنیا ہمیں محض دہشت گرد ہی سمجھے گی۔ لہذا ہمیں بھی اپنی بچیوں کے سکول بیگز یا پرس میں کنڈوم رکھ دینے چاہییں۔' یہ تھا ساروی کا لیکچر۔

'واہ واہ ساروی صاحبہ۔ آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ تو ناظرین دیکھا آپ نے ساروی صاحبہ نے کیسا زبردست حل پیش کیا۔ میں ان کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ بچپن سے ہی میری والدہ بھی اپنے پرس میں کنڈوم رکھا کرتی تھیں۔ میری بہنیں بھی۔ میری تمام آنٹیاں بھی۔۔۔ اور جب میری شادی ہوئی تو میں نے اپنی بیگم کو بھی مجبور کیا کہ وہ بھی اپنے پرس میں کنڈوم رکھا کرے۔ جب میری بیٹیاں ہوئیں اور جب وہ بڑی ہوئیں۔ تو ہم دونوں نے ملکر انہیں پرس میں کنڈوم کی افادیت پر بریف کیا۔ اب کوئی سوال ہو تو ہاتھ کھڑا کیجئے۔۔ جی آپ۔ اپنا نام بتایئے اور سوال پوچھیے۔۔۔' میزبان ساروی کی باتیں سن کر جوشیلا ہوئے جا رہا تھے۔

'جی میرا نام ناصرہ ہے۔ میں ماس کمیونیکیشن کی سٹوڈنٹ ہو۔ ساروی صاحبہ کی بات کو آگے بڑھاتی ہوں۔ میں نے بہت پہلے ہالی ووڈ کی ایک فلم دیکھی تھی۔۔ فیس آف۔ اس میں

جان ٹریولٹا اپنی بیٹی کو ایک تیز دھار چاقو دیتا ہے جو بناوٹ میں کی رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ اور خاص طریقے سے جھٹکنے پر اس میں سے ایک چھوٹا سا چاقو باہر نکل آتا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو یہ سکھایا کے ریپسٹ کو اپنے قریب آنے دینا۔ اور جیسے ہی وہ تمہاری رینج میں آ جائے تو یہ چاقو اس کی ران میں گھونپ دینا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

ریپسٹ جو نکولس کیج تھا چلاتا ہوا دور بھاگ گیا۔ لیکن میرے خیال میں باپ بیٹی کو غلط پٹی پڑھا رہا تھا۔ مرد تھا نا؟ یہ مرد ہوتے ہی ازلی دشمن ہیں عورتوں کے۔' لڑکی کا طنز ساروی نہ سمجھ سکی۔ الٹا اسے داد دینے لگ گئی۔ 'ماشااللہ بہت پیاری اور سمجھدار بچی ہے یہ۔ جیتی رہو!' ساروی نے ایک نظر لڑکی اور دوسری اینکر پر ڈالتے کہا۔ اینکر بھی لڑکی کی بات پر داد دینے لگ گیا۔

'پھر میڈم لندن میں ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔۔' میں نے زیادہ وقت تو نہیں لے لیا۔ آپ لوگ سننا چاہتے ہیں؟' لڑکی اتنا کہہ کر رک گئی۔

'جی بیٹا۔ بولو بولو۔ بہت سمجھدار ہو تم۔ میں بھی اپنے بچپن میں تمہاری ہی طرح سمجھدار اور ہوشیار ہوا کرتی تھی۔' ساروی خوش ہو رہی تھی۔

'میں ٹیوب سٹیشن سے گذر رہی تھی۔ دو لڑکے زبردستی کرنے لگ گئے۔ میں نے ایک تیز دھار چھوٹا سا چاقو پرس سے نکال کر ایک کے پیٹ میں گھونپ دیا۔۔۔'

'ارے واہ دل خوش کر دیا۔ بیٹی ہو تو ایسی دلیر ہو۔ پھر کیا ہوا؟' اینکر نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

'خون کا فوارہ نکلتا دیکھ کر وہ تو گر گیا۔ دوسرا بھاگ گیا۔ دونوں لڑکے گرفتار ہوئے۔ دونوں ایک وزیر کے بیٹے تھے۔ اس نے استعفی دیا۔ قانون پر اثر انداز نہ ہوا۔ مقدمہ چلا اور پانچ سال کی قید ہوئی۔ لیکن ہمارے ملک میں زارا خان کے ساتھ ایک لڑکے نے ایسا ہی کرنے کی کوشش کی اور اس نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ لڑکا بااثر گھرانے سے تھا۔ بچ گیا۔ زارا جیل چلی گئی۔ یہ سیدھا سادا سیلف ڈیفنس کیس تھا۔ تین برس تک زارا کی ضمانت نہ ہونے دی گئی۔ میڈیا اس کے حق میں نہ بولا۔ کیونکہ گھرانہ بہت بڑا تھا۔'

'رابعہ کے ویب میگزین نے اس کے بارے میں لکھا۔ تو ہمت نسواں ٹرسٹ کی بانی عائشہ صاحبہ نے اس کے لئے آواز بلند کی۔ انہوں نے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کیں اور اعلی عدالت سے اس کی ضمانت کرائی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ عائشہ بی بی بہت کم عمری میں کسی بھی غیر ملکی ادارے سے مدد لئے بغیر اپنے آپ کو منوا چکی ہیں۔ ان کا ٹرسٹ مظلوم عورتوں کی سچی آواز بن چکا ہے۔ لیکن ساروی صاحبہ آپ کی این جی او جو پلتی ہی گورا صاحب کے ڈالرز پر

ہے نے کوئی آواز نہ بلند کی زارا کے لئے۔ شاید آپ بہت مصروف ہوں اس وقت ماؤں کو یہ بھاشن دینے میں کہ اپنی بچیوں کے پرس میں کنڈومز رکھا کرو اور یہ میری این جی او مفت بانٹتی ہے! آپ ساتھ لے کر آئی ہیں فری کنڈومز کے ڈبے؟'

سب لوگ جوش و خروش سے تالیاں بجا رہے تھے اور سار وی احمقوں کی طرح سب کا منہ دیکھ رہی تھی!

باب 33

سید زادے کی جامعہ اب چکلہ!

'سید زادے کی جامعہ جہاں کبھی مجھے پڑھنے میں فخر محسوس ہوا اور اس کے بعد پڑھانے میں۔۔اب ایک چکلہ بن چکی ہے۔ سید زادہ گو عرصہ دراز سے پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے مگر ابھی تک متحرک ہے۔ ہوش و حواس میں ہے۔ جامعہ آتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ ہدایات دیتا ہے۔ دھڑلے سے حکم چلاتا ہے۔ لیکن اپنے ہی ہاتھ سے تعمیر کی گئی اس عظیم درسگاہ کو فحاشی کا اڈہ بنتے دیکھ کر خاموش رہتا ہے۔ اب جامعہ میں کیا کیا خرافات پڑھائیں جا رہیں ہیں۔۔فیمی نزم کے نام پر آرٹ۔۔فن مصوری اور ماہواری کے خون سے پینٹنگز۔۔جامعہ کی دیواروں پر ماہواری کے پیڈز چپکائے جا چکے ہیں۔ مقدس دیواریں ناپاک خون سے رنگی جا رہی ہیں۔ ایسی بیہودگی تو چکلے میں بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ادارے میں پڑھانے سے بہتر کوئلے کی دلالی میں منہ کالا کرا لیا جائے! اس لئے میں نے استعفی دے دیا دے۔ اپنے طالبعلموں اور دوستوں کے لئے میں ہر وقت حاضر ہوں۔ میرا نیا ای میل سگنیچر میں موجود ہے اور یہ ای میل بھی اسی آئی ڈی سے کے گئی ہے۔ خدا حافظ دوستوں!'

ڈاکٹر فاروق کی اس گروپ ای میل پر یقین کرنا نپولین کے لئے بہت مشکل تھا۔ یہ ای میل ایک خاص گوگل گروپ کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہزاروں جاننے والوں جس میں طالب علم بھی شامل تھے کی تھی۔ مقصد یہ ہی تھا کہ اب میں اس جگہ نہیں، فلاں جگہ ہوں۔ میرا یہ ای میل نہیں بلکہ وہ والا ہے، اور میں کیوں جا رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

نپولین دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ سید زادہ اس کی این جی او کے بورڈ کا مسلسل دس برس سربراہ رہا۔ نپولین اسے اپنا استاد مانا کرتا تھا۔ ادارے کی ترقی میں سید زادے کی بصیرت افروز رہنمائی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ پھر اس نے اپنی جامعہ کے تمام وسائل کے منہ نپولین کے ادارے کے لئے کھول رکھے تھے۔ سید زادہ روایتی مگر معتدل انسان تھا۔ نپولین اس کی جامعہ میں ایسی خرافات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جھٹ سے ڈاکٹر فارق کا نمبر ڈائل کیا۔

'ہیلو نپولین۔ کیسے ہو برادر؟' فاروق ہمیشہ کی طرح نپولین سے گرمجوشی اور بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔

'یار بہت دکھ ہوا۔' نپولین بولا۔

'مٹی ڈالو اور آگے چلو۔ اپنا تو یہ ہی اصول ہے بھائی!' فاروق بولا۔

'میرا بھی یہ ہی اصول ہے۔ اچھا سنو۔ میں تمہیں ایک کنٹریکٹ بھیج رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہارا موجودہ پیکج۔ میری پیشکش ہر لحاظ سے بہتر ہو گی۔ تم جلد از جلد ہمیں جوائن کر لو بطور جنرل مینیجر پروگرامز۔ ہمارے پاس تم بطور وزٹنگ فیکلٹی کام کر ہی چکے ہو۔ ماحول سے واقف ہو۔ میں تو کہتا ہوں آج ہی سے جوائن کر لو۔۔۔'

نپولین بہت جذبے سے بات کر رہا تھا مگر فاروق کے جواب نے اسکے جوش پر اوس ڈال دی۔ 'یار میں ضرور جوائن کرتا مگر میں اپنی سٹوڈنٹ کے انڈر کام نہیں کر سکتا۔' فاروق کا اشارہ مینا کی جانب تھا۔ اسے شہسوار اور شہباز والے قصے کا علم تھا۔

'دوسرے یہاں کام کے بندے کی قدر نہیں۔ اس واقعے نے میری سوچ بدل کر رکھ دی ہے۔ میں برین ڈرین پر کڑھتا تھا۔ لیکن اب نہیں۔ اس ملک کو قابل لوگوں کی ضرورت نہیں۔ اسے جید جہلاء سوٹ کرتے ہیں۔ میں واپس امریکہ جا رہا ہوں۔ بہت بہت شکریہ نپولین۔ تم نے آج پھر ثابت کر دیا کہ تم یاروں کے یار ہو۔'

نپولین کو پہلی بار احساس ہوا کہ مینا کو نائب سربراہ بنا کر اس نے بہت بڑی غلطی کی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نپولین اور مینا سال میں نو ماہ فارن ٹورز پر ہوتے۔ ڈنگ ٹپاؤ کام کے لئے مینا ایک جنرل مینیجز ایڈمنسٹریشن رکھ چکی تھی جو ایک دوسری قسم کا "شاہ جی" تھا۔ یہ مہناز کا ہرکارہ تھا۔ ہر چیز کی رپورٹ اسے دیا کرتا۔ اپنے آپ کو "سید" کہتا۔ اصلیت اس کی بھنگی اور چمار سے بھی گئی گذری تھی۔ جو اسے پیچھے سے جانتے تھے ان کے بقول یہ بھانڈ مراثی تھا۔ بلا کا خوشامدی ٹٹو۔

یہ واحد چاپلوس تھا جو نپولین جیسے انسان کو بھی اپنی خوشامد کے جال میں بہت ہوشیاری سے پھنسا چکا تھا۔ نپولین اس پر اندھا اعتماد کرتا۔ اس نے سب سے پہلے نپولین کو اس کے سچے، مخلص اور قابل دوستوں سے دور کیا۔ یہ دوست نپولین کی محبت میں بہت سارے کام کیا کرتے تھے۔۔ مفت نہیں۔ پیسے لیتے تھے۔ سید ان کی پے منٹس روک لیتا۔ دوست مروت میں مہینوں چپ رہتے۔ جب نپولین کو فون کرتے، وہ ان سے کہتا کہ وہ تو پے منٹ منظور کر چکا تھا۔ وہ سید کو ایک ای میل کر دیتا اور کاپی اس دوست کو جس کی پے منٹ میں تاخیر ہو رہی تھی۔ پھر نپولین مینا کے ساتھ کسی اور فارن ٹور پر نکل جاتا۔ دوست بے چارے بے یار و مددگار بے آسرا پھرتے۔ تنگ آ کر بیچارے خاموش ہو جاتے۔ تھک ہار کر پے منٹ پر فاتحہ پڑھ لیتے اور نپولین سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ نپولین کا ادارہ ایسے گلستان میں بدل گیا جس کی ہر شاخ پر الو بیٹھا تھا۔ ان الوؤں کی سرخیل مینا تھی۔

باب 34

چیخیں جانی پہچانی!

'یار سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ اگر میرا دل کرے تو چوک میں کھڑے کتے کو دے دوں۔۔ بھری دوپہر میں۔۔ ہزاروں کے سامنے۔۔ آگے سے بھی، پیچھے سے بھی۔۔ ہر طرح سے۔۔ لیکن اپنے شوہر کو نہ دوں! اس کے باوجود میری شان میں کوئی کمی نہ آئے۔ میں سچی ساوتری رہوں۔ میں شادی شدہ بھی رہوں۔ قابل عزت بیوی، ماں، بہن، بیٹی، ساس اور بہو بھی رہوں۔ اسی معاشرے کی ایسی آئیڈیل عورت بھی رہوں جسے فیمی نازیوں کے علاوہ ہر طبقہ رشک بھری نگاہوں سے دیکھے اور کاپی کرے! اب سمجھ میں آیا تیری؟ اگر اب بھی نہیں آیا تو ایک ڈرنک اور لے لے۔ تیرا گلاس خالی ہو چکا ہے۔'

یہ ایک سہانی شام تھی۔ رانی کے گھر کے وسیع و عریض لان کے علاوہ مہمان گھر کے اندر لاؤنج میں بھی موجود تھے۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لائیو موسیقی چل رہی تھی۔ ایک خوش گلو گلوکار اور گلوکارہ فلمی گانوں اور غزلوں سے طبع آزمائی کر رہے تھے۔ نشاط و سرور کی یہ محفل رانی نے افسانے کے اعزاز میں سجائی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک "نابغہ" اس محفل کی جان تھا۔

کھوڑُو "میرا جسم میری مرضی" کا مفہوم جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ رانی نے پہلے پہل اسے دانشوروں کی طرح دیدے گھما گھما کر سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

'رانی تجھے پتہ ہے ہم کتنے گہرے دوست ہیں۔ نہ میں تیرے آگے نہ تو میرے آگے دانشوری جھاڑ سکتی ہے۔ مجھ سے وہ ڈائلاگ بازی نہ کر جو تو ڈونرز سے کرتی ہے۔ مجھے تو آپس کی زبان میں بتا کہ اس سلوگن کا مطلب کیا ہے!' کھوڑُو بولا جو بہت اعلیٰ تعلیمیافتہ امیر زمیندار اور سیاستدان تھا۔۔ رانی کا پرانا عاشق۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ "میرا جسم میرا مرضی" کیا ہے۔ وہ رانی کو چھیڑ رہا تھا۔ وہ اپنی دوست اور میزبان کو اشتعال دلا رہا تھا تاکہ تنگ آ کر وہ اسے اس نعرے کا مطلب اس انداز میں سمجھائے جس میں وہ سمجھنا چاہتا تھا۔

رانی بھی سمجھ چکی تھی۔ اسے علم تھا جب تک وہ کھوڑُو کو "آسان" زبان میں نہیں سمجھائے گی، وہ اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔ رانی کسی مہمان سے بات کرے تو کھوڑُو ہاتھ میں

جام تھامے لہراتا لہراتا کباب میں ہڈی بن جائے اور دھت شرابی کے انداز میں پوچھے: 'رانی یہ بتا میرا جسم میری مرضی ہے کیا!' وہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہا تھا۔ موج میں آیا ہوا تھا۔ پارٹی کا مزہ لے رہا تھا۔ پورا ڈرم بھی شراب کا پی لے، کبھی دھت نہیں ہوتا تھا۔ جب کھوڑُو کو تیسری بار اسی انداز میں اچنگ اٹھی تو رانی سے نہ رہا گیا۔ اس نے سب کچھ کھول کھول کر بتا دیا "چوک"، "کتے"، "دینے دلانے" اور "آگے پیچھے" والی بات کر کے۔ کھوڑُو ایسے خوش ہوا جیسے موگیمبو خوش ہوا کرتا تھا۔ وہ اب اس 'علم غیب" سے دیگر مہمانوں کو مستفید کر رہا تھا بار بار یہ کہہ کر: " تمہیں پتہ ہے یہ میرا جسم اور میری مرضی اصل میں ہے کیا؟ یہ ہے کہ اگر میرا دل کرے تو چوک میں کھڑے کتے کو۔۔۔۔' یہ کہتے کہتے وہ کتے کی طرح حرکت کرتا مگر بھونکے بغیر۔ کھوڑُو کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے رانی کا لان نان سٹاپ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

'رانی واٹ از فیمی نازی ؟' میکس نے پوچھا اور پھر کہا: 'بہت دلچسپ ٹرم ہے!'

'ارے کچھ بھی نہیں بس میری ایجاد ہے۔ "فیمی نسٹ" سے "فیمی نازی" بنا دیا۔ جب میں عورتوں کو ٹاک شوز پر بے تکان بولتا اور گرجتا برستا دیکھتی ہوں، نازیوں کی یادشدت سے آ جاتی ہے۔ یہ طیش میں منہ سے جھاگ اڑاتے، دوسروں کی بات کاٹتے، پاگلوں کے طرح چلا چلا کر ایک ہی جملہ ہذیانی انداز میں بکے جاتی ہیں بکے جاتی ہیں۔ سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آئے بھونکے جائیں گی بھونکے جائیں گی۔ بس انکے لئے ہے یہ ٹرمینالوجی۔ اصلی فیمی نسٹس کی تو میں بہت قدر کرتی ہوں۔۔۔' رانی نے یہ بات ایسے بھولپن سے کہی کہ سب پھر سے قہقہے بلند کرنے لگے۔

'تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساروی سرمست اور سائرہ عبید اللہ۔۔ دونوں اس عہد کی عظیم فیمی نازیاں ہیں۔۔۔ ان میں سے کون سب سے زیادہ عظیم ہے؟' جب قہقہے کچھ تھمے تو کھوڑُو نقلی دھت حالت میں بولا اور قہقہے دوبارہ بلند ہونا شروع ہو گئے۔ سائرہ اور ساروی اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

'لو بھئی اصلی مہمان تو اب پدھارے۔۔۔' جیسے ہی رانی کے منہ سے یہ جملہ نکلا سب مہمانوں کی نظروں کا رخ وہیں ہو گیا جہاں رانی کی تھیں۔

افسانے گاڑی سے اتر کر لان کی جانب دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔ ساتھ میں اسکی ماں، بھائی اور شمیم تھے۔ لیکن وہ سب افسانے سے ایک قدم پیچھے تھے۔۔ جیسے وہ انکی لیڈر ہو اور یہ تینوں اس کے پیروکار۔ اس کی چال میں بلا کا حسن اور لے تھی۔ اس معاملے میں ماں بھی کچھ کم نہ تھی۔ دونوں اعلی قسم کی نیوی بلیو ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ دونوں کے بلاؤز سلیولیس، بدن سے تنے ہوئے، آدھی آدھی چھاتیاں ڈھانپے! فضا میں ایک آہ بلند ہوئی۔

جیسے شاہد پرویز نے اپنے ستار پر سا سے سا تک کی مینڈھ کھینچ کر ہر پنڈت اور خاں صاحب کو دم بخود کر دیا ہو۔

'خوبصورتی کے دو حسین جزیرے!' میکس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

'بے شک!' رانی ان دونوں کی جانب تکتے تکتے بولی۔ لگ رہا تھا دونوں حسینائیں کتھک جانتی ہیں۔ قدم ایسے ہی ناپ تول کر بڑھا رہی تھیں۔ کسی کے وہم و گماں تک میں نہ ہو گا کہ ان میں سے ایک کسی کی گھریلو ملازمہ ہے اور دوسری اسکی بیٹی۔ ان کی زمین پر قدم رکھنے، اسے اٹھانے اور آگے بڑھنے میں غضب کی خوبصورتی اور ادائیں تھیں۔ کون دل ہو گا اس لمحے جو دھک دھک نہ کر رہا ہو! یہ ہی وہ لمحہ تھا جب رانی مہمانوں کو چھوڑ کر ان کی طرف بڑھی۔

'رانی کے غریب خانے پر آپ سب کو خوش آمدید۔ اس بے رنگ محفل میں رنگ ہی رنگ بھر دیے آپ نے اپنی آمد سے۔۔' رانی نے باہیں پھیلاتے کہا۔ اس اگو ہرء میں صوفیہ اور شاہینہ رانی کے پاس پہنچ کر اس کے دائیں بائیں کھڑی ہو چکی تھیں۔ وہ واقعی رانی تھی۔ اور یہ دائیں بائیں کھڑی خوبصورت لڑکیاں اس کی کنیزیں۔ تاثر کچھ ایسا ملا دیکھنے والوں کو!

بوبی نے رانی کو تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ پیش کیا جو اس نے وصول کرنے کے بعد صوفیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ قد میں تیرہ سالہ بوبی رانی کے برابر ہی تھا۔ اس نے پیار سے بوبی کو گلے لگایا۔ اس لمحے اس کوئی سخت سے چیز اپنی دائیں ران پر محسوس ہوئی۔ اسکے بدن میں اک لہر سی دوڑ گئی۔ اس احساس سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھی۔ یہ اس کے کئی حسین ترین احساسات میں سے ایک تھا۔ لیکن تیرہ سال کے بچے کی بدولت ایسا احساس بدن میں اترتے اس نے دوسری بار محسوس کیا۔ پہلی بار یہ احساس اسے اس کے بھائی عدیل نے دیا تھا۔ رانی کی آنکھوں میں ابھرتی چمک محمودہ پلک جھپکتے محسوس کر چکی تھی۔ بوبی کے بعد رانی افسانے، محمودہ اور شمیم سے گلے ملی۔ ماریہ اور عارف لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ افسانے کو آتے دیکھ کر وہ بھی باہر آ چکے تھے اور اب رانی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

'ماشاللہ افسانے۔۔ماشاللہ محمودہ۔۔دونوں ماں بیٹی آج قیامت ڈھا رہی ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ جڑواں بہنیں لگ رہی ہیں بس ایک کم عمر ہے۔۔اتنا سا فرق ہے۔' ماریہ دونوں سے گلے ملتے بولی۔ نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ عارف بھی ان دونوں سے گلے مل لیا۔ یہ سب کچھ اتنا بے ساختہ اور آناً فاناً ہوا کہ اس کا نوٹس کوئی لے ہی نہ سکا۔ ماریہ بھی نہیں! عارف اس بے ساختگی میں ایک نئے احساس سے روشناس ہو چکا تھا۔

رانی نے افسانے کو ان لوگوں سے فرداً فرداً متعارف کروایا جن سے وہ پہلی بار مل رہی تھی۔ کھوڑو بری طرح افسانے کی ماں پر لٹو ہو چکا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرنکس کے

کاونٹر پر لے گیا جو لان میں ہی سجایا گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے محمودہ کے لئے سکاچ کا ڈرنک تیار کیا۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ جس عورت کو وہ یہ مشروب پیش کر رہا تھا وہ لوئر مڈل کلاس سے تھی۔ محمودہ نے بھی بھرم قائم رکھا۔ ویسے بھی سکاچ اس کے لئے نئی نہ تھی۔ ملک کے ساتھ کئی بار پی چکی تھی۔ رانی کی زیادہ توجہ بوبی کی جانب تھی۔ افسانے ماریہ کے ساتھ لاؤنج میں جا چکی تھی۔

'سچی!' افسانے نے ماریہ سے پوچھا۔

'ہاں۔۔اس میں جھوٹ بولنے والی کیا بات ہے!' ماریہ نے افسانے کی حیرانی دور کرتے کہا۔

'لیکن اتنی جلدی؟ میں تو کم از کم چار سال بچہ پیدا نہ کروں۔۔۔' افسانے بولی۔

'افسانے میری شادی پینتیس برس میں ہوئی۔ بس دو بچے کرنے ہیں چالیس سے پہلے پہلے۔ اس لحاظ سے درست وقت ہے۔' ماریہ بولی۔ اس کے آنگن میں ایک نیا پھول کھلنے والا تھا۔

'اوہو۔ یہ تو میں بھول ہی جاتی ہوں۔ دراصل آپ ابھی بھی چوبیس پچیس کی ہی دکھتی ہیں۔ کب آ رہا ہے بے بی؟'

'بس پانچ ماہ بعد۔۔'

'لڑکا ہے یا لڑکی؟'

'ارے اتنی جلدی جینڈر نہیں پتہ چلتا۔ جب چھ ماہ کا ہو گا تب پتہ چلے گا۔ لیکن میرا دل کہہ رہا لڑکا ہے۔ انشااللہ!' ماریہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے رب سے دعا گو ہو اک بیٹے کے لئے۔

'بیٹا ہی ہو گا۔۔انشااللہ!'

'دیکھ کھوڑُو محمودہ پر لائن مار رہا ہے۔ ایک نمبر کا حرامی ہے یہ۔ آج تیری ماں کی خیر نہیں۔' رانی لاؤنج میں داخل ہوتے افسانے اور ماریہ کے سامنے رکھی میز پر بیٹھتے بولی۔

'ماں اچھی طرح جانتی ہے ان جیسے ٹھرکیوں سے نمٹنا۔' افسانے بولی۔

'تو کھوڑُو کے حرامی پن کو نہیں جانتی۔ ضدی سے ضدی عورت کو بھی دو منٹ میں اپنے بستر پر لے آتا ہے۔ اور تیری اماں بھی خوب بھاؤ دے رہی ہے اسے۔' رانی نے کہا۔

'ماں اس وقت آپکے گھر پر ہے۔ کھوڑُو کیسے اسے اپنے بستر پر لے کر جا سکتا ہے؟' افسانے بولی۔

'تجھے یہ بات سمجھ نہیں آئے گی۔ چھوڑ۔ یہ تیری کزن شمیم بہت پسند آئی مجھے۔ بہت دم ہے اس میں۔ تو اسی کی نوکری کی بات کر رہی تھی نہ مجھ سے اس دن؟' رانی نے افسانے سے پوچھا۔

'جی یہ ہی ہے۔' افسانے بولی۔

'یہ بھی تیری طرح قیمت چکا دے گی؟' رانی نے پوچھا پھر مزید کہتے بولی:

'رکھ لے۔ لیکن انگریزی بولنا سکھا اسے ورنہ ایک خاص لیول سے آگے نہ جا سکے گی۔ اور تمام ادائیں اور نخرے بھی سکھا۔' رانی بولی۔

شمیم بھی بہت خوبصورت تھی اور رانی حسن کی دلدادہ تھی۔ اپنی پسند کا حسن رانی کسی بھی قیمت پر خریدنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی۔

'آپ فکر نہ کریں۔ ہر قسم کی قیمت ادا کرے گی۔ اسے احساس ہے۔ انگریزی کافی بہتر کر بھی چکی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں خود ٹرین کر رہی ہوں۔' افسانے بولی۔

'اگر تو ٹرین کر رہی ہے تو ہو جائے گی۔ شاباش۔ چالیس ہزار پر رکھ لے۔' رانی بولی۔

'تھینک یو رانی۔ یو آر ویری جینیرس!' افسانے نے خوشی سے کہا۔

'تم دونوں گپیں ہانکوں۔ میں ذرا دائی اماں کا شکریہ ادا کر آؤ۔۔۔' رانی یہ کہہ کر لان کی جانب چل پڑی۔

'یہ دائی اماں کون ہے؟' ماریہ نے افسانے سے پوچھا۔

'اصل میں ریحانہ پریگنینٹ ہو گئی تھی کسی سیاستدان سے۔ دائی اماں نے سب پریشانیاں منٹوں میں دور کر دیں۔' افسانے بولی۔

'اچھا صغراں کی بات ہو رہی ہے۔ شاید بوڑھی ہو گئی ہے اس لئے اب اسے رانی نے "دائی اماں" کا خطاب دے دیا ہے۔' ماریہ بولی۔

'کہیں آپ بھی۔۔۔؟'

'ہاں بس ایک دفعہ۔ بہت پرانی بات ہے۔۔' ماریہ مسکراتے بولی۔ استاد اور شاگرد میں کسی چیز کا پردہ نہ تھا۔

'عارف سے؟'

'اور کون ہو سکتا ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میرے تعلقات پہلے دن سے اس لمحے تک سوائے عارف کے کسی اور سے نہیں رہے۔۔' ماریہ نے بہت فخر سے اپنی شاگردہ کو یقین دلایا۔

'غلط۔ میرے ساتھ بھی تو ہیں؟' افسانے نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

'میں مرد کی بات کر رہی ہوں بے وقوف۔ تیرا میرا رشتہ تو ہمیشہ قائم رہے گا۔ بہت مس کرتی ہوں میں تجھے۔ کسی دن چکر لگانا جب عارف نہ ہو۔ بہت دل مچلتا ہے۔'

'کیوں عارف اب بڈھا ہو گیا ہے کیا؟' افسانے نے پوچھا۔

'ارے نہیں۔ منہ زور گھوڑا ہے۔ لیکن تیرے میرے رشتہ کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ تجھے نہیں ہوتی میری ضرورت؟ یا سب کچھ تجھے بوبی سے ہی مل جاتا ہے؟' ماریہ بولی۔

'آپکی بات ہی کچھ اور ہے۔ آپ جیسا کوئی بھی نہیں۔ اچھا پھر ایک بات بتائیے سچ سچ۔۔ میرے علاوہ کس کس سے رہا؟' افسانے بولی۔

'صرف رانی سے! اور رانی سے بہت ہی پرانا ہے۔ کیوں جیلس ہو رہی ہے؟' ماریہ بولی۔

'ہر گز نہیں۔ مجھے پتہ ہے رانی تو آپکی پچیس برس پرانی دوست ہے۔ اتنی تو میری عمر بھی نہیں ابھی۔ رانی گریٹ عورت ہے۔'

'اس میں کوئی شک نہیں۔ اچھی بات ہے تو جیلس نہیں ہوئی۔ میں بھی نہیں ہوئی۔ مجھے پورا پورا علم ہے تیرا کیا چکر چل رہا ہے رانی سے۔۔۔' ماریہ آنکھیں گھما کر بولی۔

'مجھے بھی پتہ ہے کہ آپ کو سب پتہ ہے۔ رانی مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ بلکہ مجھے تو وہ کچھ پتہ ہے جو آپکو بھی معلوم نہ ہو گا۔۔' افسانے نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

'تو مچھلی کو تیرنا سکھا رہی ہے افسانے؟ عدیل کی بات کر رہی ہے نہ تو؟' ماریہ نے یہ کہہ کر افسانے کا پانی اتار دیا۔

'غضب خدا کا! آپ کو تو سب پتہ ہے۔۔۔ مان گئے!' افسانے نے جملہ ختم کرتے ہی قہقہہ لگایا اور ماریہ بھی اسی کی طرح قہقہے لگانے لگی۔ عین اس لمحے دونوں نے ایک باوقار لڑکی کو اندر آتے دیکھا۔ خوبصورت اور مشرقی لباس میں۔ اگلے لمحے دونوں نے رانی کو اس کی جانب بڑھتے دیکھا۔

'آؤ عائشہ آؤ۔ تم نہ آتیں تو یہ محفل ادھوری رہتی۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں تمہاری تشریف آوری کا۔ بھئی ہر جگہ تمہارا چرچہ ہے۔ نیک کام کیا تم نے۔ یقین مانو اصلی کام تو تم کر رہی ہو۔ ہم تو جھک مار رہے ہیں۔' رانی ہمت نسواں ٹرسٹ کی بانی سربراہ عائشہ سے مخاطب تھی۔ اٹھائیس برس کی اس لڑکی کا تعلق بہت بڑے گھر سے تھا۔ یہ عورتوں کے اصلی حقوق کے لئے لڑتی تھی۔ یہ واحد فیمی نسٹ تھی جس کی رانی دل سے عزت کرتی تھی۔ زارا خان کیس کے حوالے سے اسکے کام کی بے حد پذیرائی ہوئی۔'

'آپکی ذرہ نوازی ہے رانی۔ ورنہ آپ کے ادارے کے مقابلے میں ہم تو کچھ بھی نہیں!' عائشہ نے انکساری سے رانی کو جواب دیا۔

'عائشہ ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ جو ڈونر کہتا ہے وہی کر سکتے ہیں۔ مجھے تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے مشن کو بطور رضاکار آگے بڑھاؤں۔ لیکن یقین جانو ایسا کرنے سے کئی گھروں میں چولہا جلنا بند ہو جائے گا۔ اس تماشے میں بہت سوں کا بھلا بھی ہو رہا ہے۔' رانی سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھی۔ وہ تو پھر بھی کچھ کام کیا کرتی تھی۔ باقی صرف استحصال کرتے تھے۔ عائشہ رانی کی باتیں سن کر مسکرا دی۔

'آو میں تمہیں میکس سے ملاتی ہوں۔' رانی کے ملنے سے پہلے میکس ان دونوں تک پہنچ چکا تھا۔ گن سن لینے کی خاطر اس کے پیچھے پیچھے سارہ وی، شبانہ اور سائرہ بھی ہو لیں۔

'ہیلو عائشہ۔ کسی ہو۔ اور مجھے فٹافٹ یہ بتاؤ کہ جینڈر والے قانون پر تم اتنی ناخوش کیوں ہو؟' میکس نے پوچھا۔

'بھئی اللہ میاں نے یا تو مرد پیدا کیا یا عورت یا تیسری جنس جو نہ مرد ہے نہ عورت۔ یہاں تک تو کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اب جینڈر اور لفاظی کے بل بوتے پر درجنوں اجناس پیدا کرنا ماڈرن جہالت ہے۔ اچھا آپ یہ بتائیے کہ جینڈر کے تحت جو بارہ یا تیرہ کیٹیگریز آپ نے ایجاد کی ہیں۔ جن کی تشہیر پر آپ ڈالرز پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ ان میں کتنی کیٹیگریز انڈے دیتی ہیں اور کتنے بچے دیتی ہیں؟ اب ظاہر ہے اس کا کوئی جواب نہیں آپ کے پاس۔ کیونکہ سوال ہی ایک دم بے کار ہے۔ اور سوال یوں بے کار ہے کہ آپ لوگوں کا فلسفہ جینڈر ہی نری بکواس ہے۔ پھر شہریوں کو یہ حق دینا کہ اگر کوئی مکمل مرد یہ محسوس کرے کہ وہ مرد نہیں عورت ہے اور مکمل عورت یہ سمجھے کہ وہ عورت نہیں مرد ہے تو جانتے ہیں کیا ہو گا؟ مرد شادیاں رچائیں گے مردوں سے اور عورت عورتوں سے۔ یہ ہمارے معاشرے میں ہم جنس پرستی کو قانونی قرار دینے کی سازش ہے جسے ہم کامیاب نہیں ہونے دینگے۔ اب آپ لوگ ہم پر اپنا وہ ایجنڈہ تھوپ رہے ہیں جو آپکے معاشرے میں ذی شعور لوگوں کی تنقید کا کڑا نشانہ بن رہا ہے۔ آپ ہی کا چرچ سیم سیکس میرج کو اتفاق رائے سے سپورٹ نہیں کر رہا۔ اس قسم کی بے ہودہ چیزیں خلاف عقل ہیں۔ آپ لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال دلا رہے ہیں۔ اس ملک کی خواتین کے ہزاروں سنجیدہ مسائل ہیں۔ آپ قصبوں اور دیہاتوں میں جائیں۔ وہاں آپکو عورتیں اس جوہڑ سے پینے کا پانی اکٹھا کرتی نظر آئینگی جہاں جانور بھی ساتھ کھڑا پانی پیتا ہے۔ اور آپ سب کے ہاتھ میں اس وقت بیش قیمت وہسکی کا گلاس ہے۔ اس وہسکی کی چند بوتلوں کی قیمت ایک ٹیوب ویل کے برابر ہے۔ دور دراز علاقوں میں ایک ٹیوب ویل لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ یہاں لینڈ مافیا دریاؤں میں مٹی ڈال کر، ان کا راستہ بند کر کے ان پر

کمرشل پلازے کھڑے کر رہی ہے۔ اسی طرح سیلاب آتے ہیں۔ میں نے کئی بار ایس پی آئی کو توجہ دلائی اس ایشو پر۔ پر وہ کہتا ہے ہم تو بہت بڑے بڑے ایشوز اٹھاتے ہیں یہ تو معمولی سا لوکل ایشو ہے۔ جہالت کی انتہا دیکھیئے۔ سیلاب ہر سال لاکھوں لوگوں کو بے گھر کرتا ہے مگر آپکی فنڈڈ این جی او کہتی ہے یہ ایک لوکل اور معمولی سا ایشو ہے! آپ ڈونر لوگ جہالت پیدا کرتے ہیں اور این جی اوز پھیلاتی ہیں۔ لیکن یہ زیادہ عرصے نہیں چلے گا۔ اب سوشل میڈیا کا دور ہے۔ لوگ بیدار ہو رہے ہیں۔۔۔'

عائشہ نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ دیا۔ میکس یس یس کہتا رہا۔ وہ سوچ تو یہ ہی رہا تھا کہ لڑکی درست کہہ رہی ہے۔ لیکن وہ اپنی حیثیت میں پالیسی پر عمل درآمد کروانے والا دفتر تھا۔ پالیسی بنانا اس کے بس سے باہر تھا۔

'لیکن عائشہ کیا برا ہے اس میں اگر غریب ممالک کی عورتوں کو بھی وہ ہی آزادی مل جائے جو ترقی یافتہ ممالک کی عورتوں کے پاس ہے؟ ہماری سوسائٹی میں عورت ہر وہ کام کر رہی ہے جو یہاں صرف مرد کرتے ہیں۔ اور وہ مردوں سے بہتر کر رہی ہیں۔ اسی لئے تو ہم سپر پاور مانے جاتے ہیں۔' میکس عائشہ کو جان بوجھ کر کرید رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیوں عائشہ مغرب کی عورتوں کے حوالے سے سوچ کی مخالفت کرتی ہے۔

'میکس صاحب آپ سپر پاور عورتوں کو آزادی دے کر نہیں لوگوں کو غلام بنا کر بنے ہیں۔ مقامی لوگوں کی زمینوں پر قابض ہو کر آپ نے اپنی سپر پاور کھڑی کی۔ لڑاؤ تقسیم کرو اور حکومت کرو آپ لوگوں کا فلسفہ سیاست رہا۔ عورت کی آزادی تو محض شو پیس ہے آپ کے معاشرے میں۔ کہاں سے آزاد ہے بیچاری؟ صبح سویرے اٹھ جاتی ہے۔ ڈھنگ سے ناشتہ بھی نہیں کرتی۔ کام پر پہنچتی ہے۔ سارا دن کھپتی ہے۔ گھر واپس آ کر گھر کے کاموں میں جت جاتی ہے۔ اس کے پاس کہاں وقت کہ شادی کرے، گھر بسائے، خاندان پروان چڑھائے، اولاد کی تربیت کرے۔ ہمارا مرد دو دو تین تین نوکریاں کرتا ہے گھر چلانے کے لئے۔ زندگی کی تپش سے اپنی عورت کو محفوظ رکھتا ہے۔ اپنی عورت کو گھر سے باہر نہیں نکالتا۔ وہ ہی عورت گھر میں بچوں کی تربیت کرتی ہے۔ اب آپ لوگ این جی اوز کے ذریعے اسی عورت کا ذہن خراب کرتے ہیں آزادی کے نام پر۔ جس قسم کی آزادی کا پرچار یہ این جی اوز آپ کے اشاروں پر کرتی ہیں یہ دراصل بغاوت ہے اسی مرد کے خلاف جو تن تنہا سارے خاندان کو پال رہا ہے۔ یعنی وہ عورت اپنے شوہر کو یہ کہہ دے کہ سنبھالوں گھر اور بچے۔ یہ شادی اور خاندانی سسٹم بلا معاوضہ جسم فروشی ہے۔ میں اپنا جسم کیوں بیچوں مفت میں؟ میں اسے اچھی قیمت پر باہر کیوں نہ بیچوں؟ میرے جسم پر صرف میرا حق ہے۔ میرا شوہر، باپ، بھائی یا بیٹا کون ہوتا ہے

میرے جسم پر حق جتانے والا؟ اور خدا نخواستہ اگر آپکی گمراہ کن برین واشنگ کا شکار ہمارا مرد ہو گیا تو وہ گھر آ کر حکم صادر کر دے گا کہ بس بہت ہو گیا۔ میں کیوں تین تین نوکریاں کروں خاندان پالنے کے لئے؟ اپنی عورت کو کہے گا کہ تو بہت آزادی آزادی کرتی پھرتی ہے صبح سے تو بھی کام دھندے پر لگ۔ اٹھارہ برس کی بیٹی کو بھی یہ ہی کہے گا کہ میری طرح تم سب کرو تین تین نوکریاں کیونکہ تو سب مردوں کے برابر ہو۔ اس کے جواب میں اس مرد کے ماں باپ پہلے ہونگے جو کہیں گے کہ کیا تو پاگل ہو گیا ہے! تو میکس صاحب اس طرح ہمارا خاندانی نظام تباہ ہو جائے گا۔ میکس صاحب آپکے معاشرے میں عورت آزاد نہیں غلام ہے۔ آزاد تو یہاں ہے۔ ہمارے باپ، بھائی اور شوہر رانیوں کی طرح رکھتے ہیں ہمیں۔ ہر قسم کی آزادی ہمیں میسر ہے۔ ہم سب نے تعلیم حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہم سب نوکریاں کرتی ہیں۔ ہم میں بزنس وومین ہیں، سیاستدان ہیں، بیوروکریسی میں ہیں، پولیس اور فوج میں ہیں۔ اور کسے کہتے ہیں آزادی؟ آپ کے ملک میں تو آزاد عورت ابھی تک صدر نہ بن سکی۔ ہمارے ملک میں دو بار بن بھی چکی۔ اگر آپ لوگ پسماندہ اقوام کے لئے واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی رجیم چینج پالیسی ترک کر دیجئے۔ ہم لوگ اپنے مسائل خود طے کر لیں گے۔ جہاں جہاں آپ نے امن کے نام پر رجیم چینج کیا وہاں وہاں دہشت گردی، لاقانونیت، عورتوں اور بچوں کے خلاف ظلم پروان چڑھا۔ عراق، افغانستان، شام، ایران، لبیا، مصر میں دیکھ لیجئے اپنے کارنامے۔ آپ لوگ بحثیت ملک یا قوم کسی سرے سے بھی انسان کہلانے کے لائق نہیں! میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔ رانی کی پارٹی کو مزید سنجیدہ نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔' عائشہ نے مدلل انداز میں کہا۔ دائیں بائیں کھڑے لوگ ہوں ہاں کرنے لگے۔ اس پر میکس نے کہا:

'ویری انٹرسٹنگ۔ ہمیں کسی دن ملنا چاہیے۔ اس بات پر تفصیل سے تبادلہ رائے ہونا چاہیے۔ میں جلد ہی تمہیں اپنے نئے سفیر سے ملواؤں گا۔ یہ باتیں اس کے سامنے کرنے کا زیادہ فائدہ ہو گا۔ میرے خیال میں ہمیں اب موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔' میکس اس بہانے جان چھڑا کر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالدیا۔ اس اثنا میں ماریہ اور افسانے بھی رانی اور عائشہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

جب میکس یہ گروہ چھوڑ کر چلا گیا تو ساروی سرمست نے عائشہ پر چڑھائی کرنے والے انداز میں کہا: 'عورتوں کے خلاف ظلم پر ہم لوگ آواز اٹھاتے ہیں اور تم ہمارے خلاف ہی آواز بلند کرتی رہتی ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟'

'ساروی تم تھوڑی سی بھی شراب پی کر آپے سے باہر ہو جاتی ہو اور اول فول بکنا شروع ہو جاتی ہو۔ اسی بکواس کی وجہ سے تمہاری کئی بار سرعام پٹائی بھی ہو چکی ہے۔ لیکن تم نے ابھی تک

کچھ نہیں سیکھا۔ اب تم یہ چاہتی ہو کہ اس محفل میں بھی وہی سلوک ہو تمہارے ساتھ؟ نہیں اگر واقعی دل کر رہا ہے تو ہو بھی سکتا ہے!' عائشہ کے منہ توڑ جواب کے سامنے ساروی خاموش کھڑی رہی۔ سناٹے کے اس مختصر دورانیے سے شبانہ نے فائدہ اٹھایا۔ ماحول کو مزید تپش سے بچایا اور عائشہ سے مودبانہ انداز میں گذارش کی کہ ساروی کے لہجے میں موجود بدتمیزی کو نظر انداز کر کے سوال پر اپنی رائے ضرور دے۔ جس پر عائشہ بولی:

'ظلم تو عورت پر نہیں بلکہ انسانوں پر ہو رہا ہے۔ اور ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ایک سے ایک دلخراش سانحہ ہر ملک میں ہو رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے وہاں سانحات دبا دیے جاتے ہیں۔ وہاں میڈیا اتنا آزاد نہیں۔ میڈیا تو ہمارے یہاں آزاد ہے۔ مادر پدر آزاد ہے۔ گالم گلوچ اور تھپڑ لائیو شوز میں آن ائر جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عورت اب بھی سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اصل مسائل پر تو آپ لوگ سڑک پر آتے ہی نہیں کیونکہ اس کے لئے آپ کو پیسے جو نہیں ملتے!'

'بھئی آپ لوگ اپنی مہابھارت جاری رکھیے میں باقی مہمانوں کو دیکھ لوں۔' رانی یہ کہہ کر بوبی کی جانب بڑھی جو فانٹا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

'ارے شیرنی کے بھائی ہو کر تم فانٹا پی رہے ہو۔۔ اسے چھوڑو۔ شیر بنو اور یہ پیو!' رانی یہ کہہ کر کاونٹر سے ایک جام اٹھا کر اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ 'شیر بن کر دکھاؤ۔۔ ایک ہی سانس میں چڑھا جاؤں!' رانی نے بچے کو دم دیا۔ بچہ بھی واقعی شیرنی کا ہی تھا۔ دوسرا سانس نہیں لیا۔ منہ نہیں بنایا۔ پورا گلاس چڑھالیا۔ رانی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اسے عدیل یاد آگیا۔

'واہ بوبی۔ جی خوش کر دیا۔ ایک اور لو! مزہ تو تب ہے اگر تم اسے بھی پہلے والے کی طرح چڑھا جاؤں!'

'رانی آنٹی۔۔ یہ لیجئے!' اگلے لمحے گلاس خالی تھا۔ رانی نے بھینچ کر اسکے ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

'میں آتی ہوں۔ تم تیسرا ابھی لو!' رانی بولی۔ اسے اپنے مہمانوں کا خیال بھی تھا۔

'بوبی کی ماں نظر نہیں آرہی۔۔۔ کہاں گئی؟' رانی نے ادھر ادھر دیکھتے سوچا۔

محفل عروج پر پہنچ چکی تھی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ افسانے اور ماریہ اپنی اپنی پلیٹیں لے کر واپس لاونج میں آچکی تھیں۔ زیادہ تر مہمان باہر موسیقی اور کھانے دونوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عارف شمیم سے گپیں لگا رہا تھا۔ صوفیہ، شاہینہ، ستارہ اور عمرانہ ایک علیحدہ گروپ کی صورت میں کھسر پسر کر رہیں تھیں۔ سائرہ شبانہ اور ساروی عائشہ کے بیچ پدر سری نظام پر گرما گرم بحث جاری تھی۔

'کیا خیال ہے؟' ماریہ نے افسانے کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ اسے ان نگاہوں کا مطلب اچھی طرح معلوم تھا۔

'چلیئے لیکن صرف دس منٹ!' افسانے بولی۔

'دس بھی بہت ہیں!' ماریہ بولی۔ دونوں خواتین لاونج سے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ وہ اسی کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں جہاں افسانے اور میکس کی تلاطم خیز ملاقات ہوئی تھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر افسانے کے پردہ سماعت سے ہلکی مگر میٹھی میٹھی چند مانوس چیخیں ٹکرائیں۔ اس کے کانوں میں ایسی آواز ہمیشہ اس وقت ٹکراتی جب ماں اور باپ دونوں بند کمرے میں ہوتے۔ لیکن چیخوں کی دوسری آواز سے اس کے کان مانوس نہ تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس کے کان بج رہے ہوں۔ تجسس تو اسکے خون میں تھا۔ کسی سوال کا جواب نہ ملے تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں میل دور بھاگ جایا کرتی۔ ادھر ماریہ اس کی جانب ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا راز دھماکے سے کھلنا چاہ رہا ہو۔

افسانے نے دروازہ ہینڈل گھما کر ایک ہی جھٹکے میں کھول دیا۔ آوازیں محمودہ کی تھیں جو اسی بستر پر موجود تھی جہاں کبھی افسانے نے پوری ایک رات میکس کے ساتھ گذاری تھی۔ صوفے سے لیکر قالین تک ایک خوبصورت نیوی بلیو ساڑھی بکھری پڑی تھی۔ دروازے کے جھٹکے کی آواز نے محمودہ کو کھوڑُو کے جسم سے آزاد کر دیا۔ دونوں اچھل کر کھڑے ہو چکے تھے۔ ماریہ نے اس لمحے محسوس کیا کہ افسانے کے جسم کی ہر شے ماں کی ہو بہو نقل تھی۔ کمرے میں تین لوگ قطار میں کھڑے تھے۔۔ خاموش۔۔ منظم۔ سب سے آگے افسانے، اسکے پیچھے ماریہ اور آخر میں رانی جو اپنے مہمانوں کو تنہا ہرگز نہ چھوڑا کرتی!

باب35

عظیم نیکی!

'میں تم سے اس طرح زیادہ عرصہ نہیں مل سکوں گی شہباز!'غزالہ نے کہا۔

'کیوں؟ کیا افضال کی غیرت جاگ چکی ہے۔۔۔'شہباز نے حیران ہو کر پوچھا۔

'افضال تو کبھی بھی کباب میں ہڈی نہیں بنتا۔ میرا شوہر آ رہا ہے۔'

'وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔۔ویسے بھی تم کونسا مجھے ہر روز یاد کرتی ہو۔ مہینے میں ایک بار ملاقات ہوتی ہے۔ اس بار چھ ہفتے بعد ہو رہی ہے۔ لاسٹ ٹائم تو تمہارا شوہر صرف دو ہفتے کے لئے آیا تھا۔'شہباز نے کہا۔ وہ اس وقت غزالہ کے گھر پر تھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ آج کافی عرصے بعد غزالہ نے اسے رات کے وقت بلایا تھا۔ افضال گھر پر نہیں تھا۔

'وہ بچوں سمیت آ رہا ہے۔۔ہمیشہ کے لئے!'غزالہ بولی۔ وہ اداس تھی۔

'تم اتنی افسردہ کیوں ہو ڈارلنگ؟'

'جانتے تو ہو۔۔۔میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ یہ سوچ کر اداس ہوں۔ تم کیوں نہیں میری بات مان لیتے۔۔۔'غزالہ نے کہا اور پھر وہ صوفے سے اتر کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر شہباز کی گود میں رکھ دیا۔ شہباز اس کے بالوں، گالوں اور ماتھے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔

'کون سی بات۔۔مرڈر والی؟'شہباز بولا۔

'ہاں۔۔صرف یہ ہی ایسا طریقہ ہے۔۔ہم شادی کر لینگے۔۔میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ہم دونوں کو ساری عمر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ ہم یہ ملک ہی چھوڑ دینگے۔ کسی ساحل پر گھر خرید لینگے۔ تم مجھے جی بھر کر پیار کرنا۔ میں تمہیں ایک پل کے لئے اپنی آنکھوں سے دور نہیں ہونے دونگی۔ میں تمہاری داسی بن کر رہوں گی۔ بس ان دونوں کو راستے سے ہٹا دو۔۔۔یا پھر مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں۔'غزالہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ شہباز کو قتل پر راضی کر لے۔

'مجھے قتل کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔۔ہوتا تو بھی نہ کرتا!'شہباز نے کہا اور لاونج غزالہ کے قہقہے سے گونج اٹھا۔

'اس میں قہقہہ لگانے کی کیا بات ہے؟ اوہو۔۔اچھا۔ سمجھ گیا۔ آئی ایم سو سٹوپڈ۔ تجربہ ہوتا تو بھی نہ کرتا! فنی۔۔'شہباز کو حماقت کا احساس ہو ہی گیا۔

'قتل کبھی نہیں چھپتا۔ اور یہ اتنا آسان نہیں۔ اپنی خوشی کے لئے دو انسانوں کی جان! نہیں۔۔میں نہیں کر سکتا۔۔۔بے شک وہ کتنے بڑے گناہگار یا برے انسان ہوں۔ وہ اپنے رب کے آگے جوابدہ ہونگے۔ میں یا کوئی بھی۔۔کون ہوتا ہے انہیں سزا کے طور پر قتل کرنے والا؟'شہباز مضطرب ہو کر بولا۔

'کیا تم ایک عورت سے بھی زیادہ بزدل ہو؟'

'کیا مطلب؟'شہباز نے پوچھا۔

'تم نہیں کرتے تو نہ کرو۔ میں قتل کر دونگی۔ تم نامرد ہو۔ ڈرپوک ہو۔ مذہب، جزا و سزا کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرا پیار سچا ہے۔ صرف تم ہی میرا پیار ہو۔ تمہاری خاطر میں قتل کرونگی ان دونوں کو۔ پھر تو اپناؤ گے نہ مجھے؟'غزالہ نے شہباز کو ایک اور امتحان میں ڈال دیا۔

'ہوش میں آؤ غزالہ۔ مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ کبھی تم کہتی ہو کہ افضال تم سے سچا پیار کرتا ہے جبکہ میں تمہارے جسم سے پیار کرتا ہوں۔ اب تم اسے قتل کرانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اپنے بچوں کے باپ کو بھی ختم کرنا چاہتی ہو۔۔۔'

'کتنی بار بتایا تمہیں کہ میرے دونوں بیٹوں کا باپ میرا بھائی افضال ہی ہے۔ میں بچوں کے باپ کو قتل نہیں کر رہی۔۔۔'غزالہ نے شہباز کو ٹوکتے کہا۔

'ایک ہی بات ہے۔ افضال کے معاملے میں تم اپنے بھائی اور بچوں کے باپ کو قتل کرو گی۔ اور دوسرا نشانہ تمہارا اپنا شوہر ہو گا۔ دیکھو ہم مہینے میں صرف ایک بار ملتے ہیں۔ دو تین گھنٹے تو گذار ہی لیتے ہیں۔ تم ایک نہیں دو مہینوں میں مجھ سے ایک بار مل لیا کرنا۔ اس طرح یہ سلسلہ تاحیات جاری رہ سکتا ہے۔'شہباز نے ایک دوسرا حل پیش کرتے کہا۔

'میں تمہارے بغیر اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ تم سمجھ نہیں پا رہے ہو!'غزالہ یہ کہتے رو رہی تھی۔

'پھر تم مہینے بعد کیوں ملتی ہو۔۔روز کیوں نہیں؟'

'مجبوری ہے! لیکن ملتی تو ہوں نا؟ اب یہ بہانے چھوڑو۔ سیدھے سیدھے بتاؤ دونوں کو قتل کر سکتے ہو یا نہیں؟ نہیں کر سکتے تو فوراً نکل جاؤ۔ اس کے بعد میں تم سے دوبارہ کبھی رابطہ نہیں کرونگی۔' غزالہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ شہباز کو معلوم تھا وہ بہت ضدی ہے۔ جس چیز کا ارادہ کر لے۔۔کر کے ہی چھوڑتی ہے۔

تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔'شہباز نے کہا۔

'ثابت کر کے دکھاؤ!'غزالہ بولی۔

'تم نے ابھی ابھی کہا کہ اگر میں قتل نہیں کرونگا تو تم کرو گی اور پھر مجھ سے شادی کرو گی۔۔۔'شہباز نے اسے اپنے تئیں آڑے ہاتھوں لیتے کہا۔

'تم بے وقوف ہو! میں نے ایک سوال بھی کیا تھا۔۔ کہ اگر میں انہیں قتل کردوں تو کیا تم مجھ سے شادی کروگے۔۔ تم نے اس کا جواب نہیں دیا!' غزالہ نے اسے لاجواب کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ غزالہ سے جیتنا ناممکن ہے۔

'شادی کروں گا۔۔ لیکن میں قتل ہرگز نہیں کروں گا۔ اور میرا مشورہ ہے تم بھی نہ کرو۔ مسئلہ باآسانی حل ہو سکتا ہے۔۔۔'شہباز اب آخری کوشش کر رہا تھا۔

'کیسے؟'

'دیکھو افضال تو تمہارا سگا بھائی ہے۔ رہا شوہر کا معاملہ۔ تم اس سے جب چاہو خلع لے سکتی ہو۔ اس کے بعد تم مجھ سے شادی کر لینا!'شہباز نے اپنی بساط کے مطابق عقل لڑاتے مسئلہ چٹکی بجاتے حل کر دیا۔ اور حل بھی درست تھا۔

'اس صورت میں کیا تم مجھے افضال سے شئیر کر لوگے۔۔۔'غزالہ نے پوچھا۔

'کیا کروں۔۔۔ مجبوری ہے! کر لوں گا۔ کم از کم دو انسانوں کی جان تو بچ جائے گی۔'شہباز بے بسی کے عالم میں بولا۔

'پھر افضال اور میرا شوہر ہم دونوں کو قتل کر دینگے۔ ان دونوں کے ہوتے میں اور تم شادی نہیں کر سکتے۔۔۔'غزالہ نے زچ ہو کر کہا۔

'تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔ افضال خود مجھے بلاتا ہے تمہارے ساتھ سیکس کے لئے۔ وہ پہلے ہی بے غیرت ہے۔ وہ کیوں قتل کرے گا مجھے؟ اس کے ہوتے تم مجھ سے ملتی ہوں۔ کئی بار اس کی موجودگی میں ہم اس گھر میں اسی جگہ مل چکے ہیں۔ وہ تمہاری اور میری وڈیو بناتا ہے۔ اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ تمہارا شوہر تمہارے پاس ہوتا ہی نہیں۔ کبھی کبھار آتا ہے۔ ہو سکتا اس کی کوئی اور بیوی ہو۔ مسئلہ تمہیں شوہر سے ہے افضال سے نہیں۔۔۔'شہباز نے غصے سے کہا اور غزالہ کو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے پڑی میز پر بٹھا دیا۔

'مجھے اپنی گود میں رہنے دو اور کچھ نہ کہو۔ تم سمجھ نہیں سکو گے اور میں سمجھا نہ پاؤں گی۔ لیکن میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ اور تمہیں ناراض بھی نہیں کر سکتی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئیندہ تمہیں مجبور نہیں کرونگی۔۔۔'غزالہ کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھی۔

'اگر تم مجھ سے واقعی سچا پیار کرتی ہو تو یہ قتل والی سوچ کو ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر اس نے ملانا ہو گا تو ملا دے گا ورنہ ہم اوپر جا کر ضرور ملیں گے!' یہ کہتے ہوئے شہباز کے بھی آنسو نکل آئے۔

'کر دیا ختم اس سوچ کو۔۔۔ہمیشہ ہمیشہ کے لئے! اب بے فکر ہو جاؤ اور خوش بھی۔ تمہارے لئے ایک سرپرائز ہے۔' غزالہ نے شہباز کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی انگلیوں سے غزالہ کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

'تم سے بڑا کیا سرپرائز ہو گا؟'شہباز نے کہا۔

'آئیندہ سے تم مجھے جب چاہو فون کر سکتے ہو۔ اور مجھ سے ملنے یہاں آ بھی سکتے ہو۔ لیکن آنے سے پہلے فون ضرور کر لینا۔ ہو سکتا ہے میں گھر پر نہ ہوں یا افضال گھر پر ہو۔۔یا میرا شوہر۔ میں آج کے بعد تم سے اکیلے ملا کرو نگی۔ افضال نہیں ہو گا اب۔ کیا ہم شہر یا ملک سے باہر مل سکتے ہیں۔۔چند دنوں کے لئے؟ غزالہ یہ کہتے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سچائی اور صرف سچائی تھی۔

'کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دنیا کے کسی کونے میں مل سکتے ہیں۔۔۔'شہباز بولا۔

'لیکن یہ کونا میرے گھر سے قریب ترین ہو تو اچھا ہے!' غزالہ بچوں کی طرح ہنستے ہنستے بولی۔ شہباز کو اس کی معصومیت پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

'آلویو!' اس نے کہا اور غزالہ نے اپنا سر پھر اسکی گود میں رکھ دیا۔ لیکن اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ راحت اور سکون پہنچانے والی ملکہ بن چکی تھی۔ اس معاملے میں وہ خود غرض نہ تھی۔ اپنے غلاموں کے لئے وہ راحت اور سکون کے خزانے کھول دیا کرتی تھی۔ شہباز کی آنکھیں سورج کی طرح دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس نے ایک بہت عظیم نیکی کی۔۔ایک ضدی عورت کو دو بے گناہ انسانوں کی جان لینے کے مصمم ارادے کو شکست دے کر۔ غالباً یہ اسکی پہلی فتح تھی۔ اس سے پہلے وہ غزالہ سے شکست کھاتا رہا!

باب36

پدر سری نظام اور من و سلویٰ!

'میڈم یہ پدر سری نظام کو ذرا آسانی سے ایکس پلین کر دیجئیے۔'
یہ سوال سائرہ عبید اللہ سے ایک نوجوان لڑکی نے کیا جس کی عمر غالباً بیس برس ہو گی۔ سائرہ ایک مکالمے "عورتوں کی آزادی میں حائل کون؟" میں بطور ماہر مدعو تھی جو ایک این جی او "بکے جا جو منہ میں آئے" نے منعقد کر رکھا تھا۔ اسکے مقابل عائشہ تھی۔

"بکے جا جو منہ میں آئے "جمہوریت اور آزادی اظہار پر یقین رکھنے والا ادارہ تھا۔ تصویر کا ایک ہی رخ دکھانے کا قائل نہ تھا۔ اپنے ہر پروگرام میں مخالف نظریے کے حامی طبقے کو بھی مدعو کیا کرتا تھا۔ اس این جی او کی سربراہ اور بانی مہناز تھی جو دیگر کئی این جی اوز کی بورڈ ممبر تھی۔

مہناز کا پس منظر زبردست تھا۔ قریب پچھتر برس کی اس "جہاندیدہ" خاتون کے کھنڈرات سوائے اس کے ماضی کے شاہکار حسن کے مزید کچھ بتانے سے قاصر تھے۔ خود تو سیاست سے کوئی لینا دینا نہ تھا مگر ہر قسم کی سیاسی جماعت کے سربراہ سے اس کے گہرے اور ذاتی مراسم تھے۔ پچھلے پچاس برس سے مسلسل سینیٹر تھی۔ چونکہ خود حسن کی اک عظیم مثال تھی اس لئے اس وصف کی طاقت سے اچھی طرح آشنا تھی۔ کون وزیر ہو گا جواب بھی اس کے آگے پیچھے نہ پھرتا ہو۔ وجہ یہ کہ اب اسکی واحد قابلیت یا ہتھیار اس جیسی ہی دو خوبصورت جوان بیٹیاں تھیں۔ ماشااللہ دونوں ہی سینیٹرز تھیں۔ ماں کی طرح یہ بھی ہر چڑھتے ہوئے سورج کو خوش کرنے اور اسے گرہن لگانے میں ماہر تھیں۔ بہت سی این جی اوز والیاں مہناز کو اپنا روحانی گرو مانتیں۔ رانی ان میں شامل نہ تھی۔ وہ مہناز سے بھی اوپر کے لیول کی چیز تھی۔

مہناز خطرناک درجے تک خود پسند عورت تھی۔ اس عمر میں بھی آئینہ اپنے پرس میں رکھتی۔ کوئی محفل ہو، ہر پانچ منٹ بعد لازمی اسے باہر نکال کر اپنا چہرہ دیکھے بغیر نہ رہتی۔ اگر آئینہ نہ ہوتا تو یہ حسین بڑھیا جوانی میں ہی مر چکی ہوتی۔ کسی زمانے میں یہ ایک امریکی صدر کی داشتہ رہی۔ لیکن وطن سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس رشتے کی قیمت اس نے سرکاری خزانے میں جمع کرائی۔ ملک کو بہت ساری پابندیوں سے بچائے رکھا۔ وطن کی معشیت کو دیوالیہ نہ

ہونے دیا۔ اگر وہ آج بھی گئے دنوں کی طرح خوبصورت ہوتی تو آئی ایم ایف سے اپنے فتنہ انگیز حسن کی بدولت ہر شرط منوا چکی ہوتی۔

'سائرہ تم مثال دے کر سمجھاؤ۔ یہاں ہر عمر کے بچے اور بچیاں ہیں۔ اصل فن تو مشکل بات کو آسان کر کے پیش کرنا ہے۔' مہناز نے کہا جو اس پروگرام میں میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

'بیٹیاں سمجھو کہ پدر سری نظام بندریا کا تماشا ہے۔ جس میں باپ مداری ہے۔ اور بندریا بیٹی ہے۔ باپ بندریا کو سلمی ستاروں سے لیس کپڑے پہناتا ہے۔ پھر ڈگڈگی بجاتا ہے۔ یہ کپڑے اور ڈگڈگی سونے کا نوالہ ہے۔ بندریا اچھلتی کودتی ہے۔ کرتب دکھاتی ہے۔ اگر نہ کرے تو مداری یعنی باپ ایک چھڑی نکالتا ہے۔ یہ چھڑی شیر کی آنکھ ہے جس سے وہ بیٹی کو دیکھتا ہے۔ بندریا بیٹی یہ چھڑی دیکھ کر اوقات میں آجاتی ہے۔ بغاوت پر نہیں اترتی۔ اگر وہ بغاوت کر لے تو چھڑی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ بندریا ہے۔ ایک ہی جست میں چھلانگ لگا کر مداری کی آنکھیں نوچ لے گی۔ مداری چھڑی کو بھول کر اپنی جان بچانے کی فکر کرے گا۔ بس آپ لوگوں نے چھڑی سے نہیں ڈرنا۔ یہ چھڑی کا خوف۔۔ جو مداری یعنی باپ کے ہاتھ میں ہے۔۔ ہماری آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہی ہے۔ باپ اور بھائی ہمیں ہنسنے سے منع کرتے ہیں۔ قہقہ لگانے سے منع کرتے ہیں۔ کھلا گلا پہننے سے منع کرتے ہیں۔ کھل کر بیٹھنے سے منع کرتے ہیں۔ آدھے بازو یا بغیر بازو قمیض نہیں پہننے دیتے۔ سیلولیس بلاؤز کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں بوائے فرینڈ رکھنے کی اجازت نہیں۔ ہمیں مجبور کر دیتے ہیں کہ ہم اپنے بوائے فرینڈ سے رات کے اندھیرے میں پارکوں میں ملیں۔ ہمیں جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً ہمیں جھوٹ گھڑنا پڑتا ہے کہ اماں میں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں نوٹس لینے۔ ہمارا باپ یا بھائی ہمیں اس سہیلی کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے جہاں سے ہمارا بوائے فرینڈ ہمیں پک کرتا ہے۔ اسطرح کتنا ٹائم ضائع ہوتا ہے! پھر ہمیں چھپ چھپا کر کسی گیسٹ ہاؤس میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار وہاں پولیس کا چھاپہ بھی پڑ جاتا ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں ملبہ ہم پر گرتا ہے کہ ہم نے خاندان کی ناک کٹوا دی۔ بھئی اگر مغرب کی طرح ہمیں مکمل آزادی ہو تو پھر گیسٹ ہاؤس میں مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اتنے پیسے بھی ضائع ہوتے ہیں۔ یہ ہی پیسہ وہ ہم دونوں پر بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ آرام سے رات آٹھ بجے ویک اینڈ پر وہ ہمارے بوائے فرینڈ کو ویلکم کر لیں۔ وہ دو دن آرام سے ہمارے پاس ہی رہے فیملی ممبر کی طرح۔ ہمارے بھائیوں سے، ماں باپ سے، انکلز سے، پڑوسیوں سے، بہنوں سے گھل مل جائے۔ ویک اینڈ ختم ہو تو رات کو چلا جائے۔ اس میں کیا برائی ہے آخر؟ ویسٹ کے والدین ایسا کر سکتے ہیں تو

ہمارے کیوں نہیں۔ ویسے تو وہ ویسٹ کی ہر چیز اپنا لیتے ہیں۔ سب کے پاس جدید ماڈل کی گاڑیاں اور آئی فون ہیں۔ یہ آزادی کیوں ہضم نہیں ہوتی انہیں؟ خود جہاں مرضی منہ کالا کرتے پھریں۔ پھر بھی سات پردوں میں چھپا کر ہی رکھنا ہے ان منافقوں نے ہمیں!'

'اور اس پدر سری آمریت میں ہماری ماں ہمارے باپ اور بھائی کا ساتھ دیتی ہے۔ اسے ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ کیونکہ اسے بھی چھڑی دکھائی جاتی تھی۔ اس چھڑی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکدم ختم کر دی ہے۔ ہماری ماؤں نے، نانیوں نے، دادیوں نے اس پدر شاہی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا ہے۔ ہمیں ان کا بدلہ بھی لینا ہے۔ کل انہوں نے اس نظام کے خلاف بغاوت کی ہوتی تو آج ان کی بیٹیاں، نواسیاں یا پوتیاں یہ بدنصیب گھڑی نہ جھیل رہی ہوتیں!'

سائرہ اس وقت گلا پھاڑ پھاڑ کر بات کر رہی تھی جیسے وہ ہزاروں کے مجمعے سے مخاطب ہو۔ اس کے سامنے ڈیڑھ سو کے قریب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے کالر سے مائک بھی لگا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اونچی اونچی آواز میں بات کر رہی تھی۔ مہناز کی این جی او میں سب سے خوبصورت بات یہ آڈیٹوریم تھا۔ قریب تین سو لوگ اس میں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ اس آڈیٹوریم میں اچھوتے موضوعات پر مکالمہ رکھتی۔ ہر مکتبہ فکر کے حامل شخص کو یہاں اظہار رائے میسر تھی۔ یہ مکالمہ آن لائن لائیو نشر ہوتا۔ حاضرین کے علاوہ ہزاروں لوگ اسے یوٹیوب یا فیس بک پر لائیو دیکھتے۔

'وونڈر فل پوائنٹ۔ جی بی آپ کا کیا موقف ہے اس حوالے سے۔۔۔' مہناز نے پہلے سائرہ کو خراج تحسین پیش کیا۔ پھر وہ عائشہ سے ہم کلام ہوئی۔ عائشہ کے مزاج میں تحمل اور ٹھہراؤ تھا۔ بات کو غور سے سنتی۔۔ پھر جواب دیتی۔ وہ خط کی جگہ تار لکھنے میں ماہر تھی۔ جہاں دوسرے پورا صفحہ لکھتے، وہاں وہ جملہ لکھتی۔

'سائرہ صاحبہ کی کہانی دردناک ہے۔ واقعی وہ باپ قابل نفرت ہے جو اپنی بیٹی کو بندریا بنا کر گلی گلی نچائے۔ اور اگر وہ نہ ناچے تو چھڑی سے پیٹے۔۔۔'

'یہ کیا بکواس کر رہی ہے تو! میرے باپ تک پہنچ رہی ہے۔۔ بدتمیز لونڈیا۔ زبان کو لگام دے ورنہ تیری گدی پکڑ کر زبان کھینچ لونگی۔۔۔' سائرہ طیش میں آکر گالم گلوچ پر اتر آئی۔

'ایک منٹ سائرہ۔۔ ایک منٹ۔۔ عائشہ صاحبہ آپ کی باری کے دوران بیچ میں نہیں بولیں۔ آپ کو بھی نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اور یہ بازاری زبان آپ جیسی بزرگ خاتون کو زیب نہیں دیتی۔ آپ ہمیں سکھانے آئیں تھی۔۔۔ کیا؟؟؟ یہ گالیاں؟' وہی لڑکی بولی جس نے سائرہ سے سوال کیا تھا۔

'بھئی غصہ حرام ہے اسلام میں۔ پانی پیو پانی۔۔۔ہاں عائشہ۔۔ پلیز کیری آن۔'اب کے مہناز نے مداخلت کی۔ پہلے سائرہ کو ٹھنڈا کیا پھر عائشہ کو بات جاری رکھنے کا موقع فراہم کیا۔

'شکریہ مہناز! میں یہ کہہ رہی تھی کہ قابل نفرت ہے وہ باپ جو اپنی بیٹی کو بندریا بنا کر گلی گلی نچائے۔ روپیہ دو روپیہ اکھٹا کرے اس کا تماشہ راہگیروں کو دکھا کر۔۔اور اگر وہ نہ ناچے تو چھڑی سے پیٹے۔ پھر اس بندریا بیٹی کو اس کی ماں اور بھائی چھڑی سے پیٹتے رہیں اگر وہ ناچنے سے، کرتب دکھانے سے انکار کر دے۔۔۔بہت افسوسناک واقعہ ہے۔ میں جاننا چاہوں گی کہ کتنے عرصے تک سائرہ بیگم کے والد محترم، والدہ ماجدہ اور بھائی صاحب نے انہیں اس ظلم کا نشانہ بنائے رکھا؟ کیسے انہوں نے اس پدر سری نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حقیقی آزادی لی؟ جی سائرہ صاحبہ ہمیں بتائیے!' اپنی بات مکمل کر کے عائشہ اب سائرہ اور شرکاء کی جانب دیکھ رہی تھی۔

'میرے والد تو بہت عظیم انسان تھے۔۔۔'سائرہ بولی۔

'تو پھر آپکے بھائی نے بنایا تھا آپ کو بندریا؟'عائشہ نے پوچھا۔

'تو پھر بکواس کرنا شروع ہو گئی۔ میرا بھائی جیسا بھائی تو ساری کائنات میں نہ ہو گا۔ میرے والد نے بہت شفقت سے پالا پوسا۔ ماں نے بہت پیار دیا۔ بھائیوں نے بہت لاڈ اٹھائے۔ مجھے بیرون ملک اعلی تعلیم دلائی اپنا گھر گروی رکھ کر۔ ہر طرح کی آزادی دی۔ ہر طرح سے سپورٹ کیا۔ اللہ تعالی ان سب کو جنت الفردوس میں اعلی مقام دے! آمین ثم آمین!' سائرہ بولی۔

'تو پھر آپ انہیں گالیاں کیوں دے رہیں تھی؟'عائشہ نے پوچھا۔

'میں نے کب دی گالی انہیں؟'سائرہ نے حیرانی سے پوچھا۔

'بڑی بی پدر باپ کو کہتے ہیں۔ پدر سری نظام وہ سسٹم ہے جس میں گھر کے معاملات میں باپ کا یا کسی اور مرد کا حکم چلتا ہے۔ ہم سب کے ماں باپ اور بھائی آپ کے والدین اور بھائیوں کی طرح عظیم ہیں۔۔۔کیوں بھئی نوجوانو۔۔۔ آپکے ہیں یا نہیں ہیں؟ کس کس کے باپ نے اسے بندریا بنا کر، زرق برق کپڑے پہنا کر، ڈگڈگی بجا کر گلی گلی، سڑک سڑک پھرایا اور چار پیسے اکھٹے کئے؟ شاباش ہاتھ کھڑا کر دے وہ لڑکی۔۔۔'عائشہ نے حاضرین کو جوش دلاتے پوچھا۔

'ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں! ہم سب کے باپ اور بھائی عظیم ہیں۔ سب نے ہمیں تعلیم دی، نوکری کرنے کی اجازت دی، اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی دی۔ سب نے ہمیں وراثت میں حصہ دے رکھا ہے۔ سائرہ صاحبہ ہمیں گمراہ کر رہی ہیں۔ وہ ہمیں اپنے ماں

باپ سے بھائیوں سے نفرت کرنا سکھا رہی ہیں۔۔۔'شرکاء میں سے ایک لڑکی بولی جو گفتگو سے کوئی لیڈر دکھائی دیتی تھی۔

'کیا میں درست کہہ رہی ہوں یا غلط؟' وہی لڑکی اب سننے اور دیکھنے والوں سے پوچھ رہی تھی۔

'آپ درست سائرہ غلط، مہناز غلط۔۔۔ ٹھس ٹھس' گندے ٹماٹر اور انڈے کہیں سے اچانک برسنا شروع ہو گئے۔ مہناز تو کامیابی سے رفو چکر ہو گئی۔ سائرہ کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اسکی ساڑھی اسکی ہیل میں پھنس گئی۔ وہ گر چکی تھی۔ انڈے اور ٹماٹر من و سلوی کے طرح اس پر نازل ہو رہے تھے۔ عائشہ کے بس میں آج پہلی بار اپنی ہنسی کنٹرول کرنا ناممکن ہوا!

باب 37

قدرت کا کرشمہ!

'اومائی گاڈ! شی ہیز ڈن اٹ۔ وہ رہ نہ سکی۔۔' شہباز پر سکتہ طاری تھا مگر اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس سکتے کی وجہ ایک انگریزی روزنامہ تھا جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس کے تیسرے صفحے پر ایک خبر تھی۔۔ ملک کے دو مشہور بزنسمین ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق! ایک افضال تھا اور دوسرا اشرف ملک۔۔ غزالہ کا شوہر۔ دونوں کسی پہاڑی مقام سے واپس گھر لوٹ رہے تھے۔ گاڑی تیز رفتاری کے سبب بے قابو ہو کر گہری کھائی میں جا گری۔ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے۔

'غزالہ نے مجھ سے جھوٹ بولا! باز نہیں آئی۔۔۔ کر ہی دیا دو بے گناہوں کو قتل۔ کتنی خطرناک عورت ہے یہ۔ کسی دن میرے ساتھ بھی ایسا کر سکتی ہے! مجھے اس سے دور رہنا چاہیے!' یہ سوچ اس کے ذہن میں نہ چاہتے ہوئے بھی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اسے رد کرنا چاہتا تھا۔۔ ایک دوسری سوچ سے۔۔۔ 'غزالہ نے انہیں ٹھکانے لگایا بھی تو کس کی خاطر؟ اسی کی خاطر۔۔ شہباز کی خاطر! کہیں ایسا تو نہیں غزالہ کو ان دونوں کی موت سے بہت کچھ پیسہ ملنا ہو۔۔ ممکن ہے انشورنس کی مد میں۔۔ اور اسی لئے اس نے دولت کے لئے یہ کام کیا ہو؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس پہلے ہی بہت پیسہ تھا۔ اور وہ تو سوشل بھی نہ تھی۔ تنہائی پسند لوگوں کو پیسے کی ہوس نہیں ہوتی۔ یقیناً اس نے یہ کام میری خاطر ہی کیا ہے!'

یہ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے غزالہ کے پاس جانا چاہیے۔۔ بغیر فون کیے! دس منٹ بعد وہ غزالہ کی گلی کی مین سڑک پر تھا۔ چار جدید اسلحے سے لیس کمانڈوز گلی کے نکڑ پر مستعد کھڑے تھے۔ انہوں نے بہت تمیز کے ساتھ اسے بتایا کہ کئی بڑی شخصیات تعزیت کے لئے آئی ہوئیں ہیں۔ وہ ایک گھنٹے بعد آئے۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ شہباز سمجھ سکتا تھا۔ غزالہ اور افضال اثر ورسوخ والے لوگ تھے۔ سب بڑے لوگوں کی وڈیوز تھیں ان کے پاس۔ ایک گھنٹے بعد گلی عام لوگوں کے لئے کھلی تھی۔ بہت سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔ لاؤنج سے فرنیچر ہٹا کر قالین پر سفید چادریں بچھا دی گئی تھیں۔ غزالہ سفید کپڑوں میں سفید دوپٹے میں تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔۔ جیسے آنسوؤں کا سیلاب ان سے گذر کر تھم گیا ہو۔ اسکے دائیں اور بائیں جانب دو خوبصورت بچے موجود تھے۔۔ چار پانچ برس کے۔ دونوں

میں سال بھر سے زیادہ کا فرق نہ ہو گا۔ انہیں دیکھتے ہی شہباز کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ دونوں غزالہ ہی کے بیٹے ہیں۔ ان کی شکلیں بالکل اپنے باپ پر گئی تھیں۔۔افضال پر۔ وہ حیران تھا مماثلت پر۔

شہباز کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی۔ بچے بیٹھے رہے۔ اسنے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ حالت سوگ میں بھی اس کے چہرے پر دلکش حزن برس رہا تھا۔ وہ واقعی دل شکستہ لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ عورت دہرے قتل کی مرتکب ہو سکتی تھی۔ یا اس قسم کے خوفناک جرم کی پلاننگ کر سکتی تھی۔

غزالہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ چال میں چھپا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ وہ اب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ غزالہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بھی اب وہیں تھا۔

'تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ کیوں کیا ایسا؟ تم نے تو یقین دلایا تھا کہ تم اس سوچ کو ختم کر چکی ہو۔۔۔پھر بھی۔۔۔ آج تم میری نظروں سے گر چکی ہو۔ میرے دل سے اتر چکی ہو۔ میں کوس رہا ہوں اس دن کو جب تم سے ملنے چلا آیا۔ اس دوہرے قتل کو میں روک سکتا تھا۔ لیکن میں نے کچھ نہ کیا۔ مجھے دکھ ہے خاموش رہنے کا۔ مجھے افضال کو تمہارے ارادوں سے باخبر کر دینا چاہیے تھا۔ تمہیں شرم نہ آئی۔۔اس بھائی کو قتل کروا دیا جو تمہارے پیار میں اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اپنا گھر بھی نہ بسا سکا! وہ تمہارے بچوں کا باپ بھی تھا۔۔۔'

'کیسا دھوکہ؟ کیا کر دیا میں نے؟ تم نے تو افسوس تک نہ کیا انکی موت کا اور یوں ہی بے تکان بولنا شروع کر دیا۔ یہ کوئی طریقہ ہے؟ غزالہ اسکی بات کاٹ کر شکوہ کرنے لگی۔

'تم نے کیا ہے یہ سب کچھ۔۔۔ پورا پلان کر کے! اچھی طرح سوچ سمجھ کر۔ میں کہتا ہوں زبردست طریقے سے کیا! تمہیں تو کوئی پروفیشنل سیریل کلر ہونا چاہیے۔ کتنی مہارت سے کیا۔ قتل کا شک تک بھی نہ ہو گا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا باپ ہو یا شرلاک ہومز کا۔۔کوئی بھی اس قتل کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اور کیسے پہنچے گا؟ قتل تو ہے ہی نہیں سرے سے۔ ٹریفک ایکسیڈنٹ ہے! گاڑی کی بریکیں فیل کر دی ہو نگی۔ بریک آئل سلنڈر ڈھیلا کر دیا ہو گا۔ وہیل لوز کر دیا ہو گا۔ سو چیزیں پڑی ہیں یوٹیوب پر۔ دیکھ کر کر دیا ہو گا کچھ اور گاڑی کھائی میں جا گری۔ اور دونوں مر گئے۔۔۔'

'ہاں لوگ بچ بھی جاتے ہیں۔ وہ فوراً کیوں مر گئے؟ میں یہ سب کرنے کے بعد یہاں سے چشم زدن میں ایک چھلانگ مار کر کھائی میں اتر بھی گئی اور انہیں گلا گھونٹ کر مار بھی دیا۔ یہ کیوں نہیں کہتے؟ فلمیں کم دیکھا کرو۔ ہر وقت فلمی مناظر تمہاری آنکھوں میں گھومتے رہتے

ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے یہ دوسری بار ہوا۔ افضال کو پرانی عادت تھی پی کر گاڑی چلانے کی۔ تین برس پہلے اسی طرح ایک برانڈ نیو گاڑی کھائی میں گرا چکا تھا۔۔'

'اچھا تو جو تجربہ پہلی کوشش میں ناکام ہوا وہی دوسری کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ بہت بہت مبارک ہو! واہ بھئی واہ غزالہ بیگم۔ تم تو ایک عظیم ساحرہ ہو۔' شہباز طنزیہ لہجے میں بولا۔

'ایک منٹ۔۔۔۔' غزالہ یہ کہہ کر بیڈروم کی الماری کی طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس فائل سے اس نے ایک کاغذ نکال کر شہباز کے ہاتھ میں دیا۔ اس کاغذ پر کسی اخبار کا تراشا چسپاں تھا۔ قریب تین برس ہی پرانی خبر تھی۔ ایک گاڑی کے کھائی میں گرنے کی۔ گاڑی مکمل تباہ ہو چکی تھی۔ ائربیگ کی وجہ سے ڈرائیور اور اسکی بیوی معجزاتی طور پر بچ گئے۔ کسی کو خراش تک نہ آئی۔ ڈرائیور کا نام افضال تھا اور بیوی کا غزالہ!

شہباز ایک نظر تراشے پر ڈالتا۔ پھر غیر یقینی کی کیفیت میں دوسری نظر غزالہ پر۔ اب غزالہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اتنے میں دونوں بچے بیڈروم تک پہنچ چکے تھے۔ ماں کو روتے دیکھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ ان دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتے غزالہ نے شہباز سے بس ایک ہی جملہ کہا اور کہنے کے بعد واپس لاؤنج میں چلی گئی۔

'کائنات میں سب سے بڑھ کر مجھے یہ دونوں بچے عزیز ہیں۔ ان کی قسم میں نے یہ نہیں کیا۔ رب ہماری سن چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم ایک ہو جائیں۔۔ ہمیشہ کے لئے۔ قدرت کو یہ ہی منظور تھا۔ دعا کا وقت ہو چکا ہے۔ تم بھی آ جاؤ نیچے!'

اخبار کا تراشہ وہ شہباز کے ہاتھ میں ہی چھوڑ گئی۔ اب وہ اسے دوبارہ پڑھ رہا تھا۔۔ محض یہ امر یقین بنانے کے لئے کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا! جو کچھ ہوا وہ جیتی جاتی حقیقت تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے خواب اکثر حقیقت سے بھی کہیں زیادہ سچے ثابت ہو جایا کرتے تھے!

باب38

ندامت نہیں عظمت!

'اس دن کو کیسے ہینڈل کیا آپ نے؟' رانی نے افسانے سے پوچھا۔ آج وہ افسانے سے "تو" نہیں، "تم" بھی نہیں، "بیٹا" بھی نہیں۔۔بلکہ "آپ جناب" والے انداز میں مخاطب تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کوئی آس پاس تھا۔ بس یہ اس کی ادا تھی۔ اور اس ادا سے کوئی خاص موڈ کا تاثر دینا ہرگز مقصود نہ تھا۔ مثلاً وہ بہت زبردست اور مست موڈ میں اپنے دوستوں سے "آپ" میں بھی اور "تم" میں بھی گفتگو کیا کرتی تھی۔

'میں آپ کو بعد میں بتاؤ گی۔ لیکن پہلے آپ بتایئے کہ آپ نے کیسے لیا اس واقع کو؟' افسانے نے الٹا رانی سے سوال کر ڈالا۔

'بھئی میرے لئے اب کچھ سرپرائز نہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھ لیا دنیا میں۔ کھوڑُو تو ہے ہی ایک نمبر کا حرامی۔ اس کی آنکھوں سے محمودہ کو دیکھ کر جو ہوس ٹپک رہی تھی مجھے یقین تھا کوئی کانٹ کر کے چھوڑے گا۔ اسی لئے میری ایک نظر اس پر تھی اور دوسری محمودہ پر۔ نہ جانے کون گھڑی اسے لے کر میکس والے روم میں گھس گیا۔ بے صبرا اتنا کہ کنڈی تک نہ لگائی۔ چل وہ تو ہے ہی پیدائشی بے غیرت لیکن محمودہ کو یہ کیا سوجھی؟ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بڑی جہاندیدہ خاتون ہیں آپ کی والدہ۔' رانی نے آخری جملہ افسانے کی نقل مارتے کہا جس پر دونوں ہنس دیں۔

'کھوڑُو حرامی اور بے غیرت ضرور ہے مگر زور زبردستی کرنے والا انسان ہرگز نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ محمودہ کو اس کی مرضی کے بغیر اوپر لے گیا ہو۔ وہ چاہتی تو اسے طریقے سے ہینڈل کر سکتی تھی۔ پھر وہ دوبارہ اصرار بھی نہ کرتا۔ محمودہ نے یقیناً اسے بہت ہی گھنا بھاؤ دیا ہو گا۔ تب ہی اس نے دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا۔ خیر جانے دو۔ یہاں ایسا ایک نہیں سینکڑوں بار ہو چکا ہے۔ میرے گھر پر نہیں اوروں کے گھر پر بھی ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ شبانہ کے گھر پر پارٹی زوروں پر تھی۔ اس نے شبانہ کو ہی گھیر لیا۔ بہت برسوں کی بات ہے جب اس کا حسن شباب پر تھا۔ وہاں بھی میں نے ہی ان دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑا تھا۔ یہ باتھ روم کے بہانے شبانہ کو اندر لے گیا اور ہو گیا شروع۔ شبانہ تو ہر گھڑی تیار کامران رہتی ہے اس قسم کی مہم جوئی کے لئے۔ تو جو کچھ اس نے اور محمودہ نے کیا میرے لئے تو کیا پارٹی میں ہر مہمان کے لئے بہت پرانا قصہ

تھا۔ تجھے ایک راز بتاؤ؟' رانی نے اب سرگوشی کرتے کہا تاکہ سسپنس پیدا ہو حالانکہ آس پاس نہ بندہ نہ بندے کی ذات!

'جی بتایئے!' افسانے بولی۔

'کیا تو نے ایک بات نوٹ کی؟' اگر نہیں تو اب کرنا۔ یہ سب بیگمات ڈرائیورز بڑے ہینڈسم رکھتی ہیں۔ جوان۔ لمبے چوڑے۔ مضبوط جسم کے۔ تن ساز قسم کے۔ کسی کا بھی قد چھ فٹ سے کم نہیں ہوتا۔ سب کے شوہر منحنی ٹائپ۔ بیوی کے ایک جھٹکے کی مار نہیں۔ تو تیرے خیال میں کون انکی پیاس بجھاتا ہو گا۔۔۔؟ رانی نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

'ڈرائیورز؟' افسانے نے ایسے انداز میں کہا جیسے ابھی بھی کوئی شک کی گنجائش باقی ہو۔

'جی ہاں!' کیا کیا بتاؤں کہ کیا کیا یہ گناہ گار آنکھیں دیکھ چکی ہیں! ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی یادداشتیں لکھوں گی۔ پھر کھولوں گی سب کا کچا چھٹا!' رانی اب کسی متقی پرہیزگار ولی کے انداز میں بات کر رہی تھی۔

'خیر تو بتا تیری طرف کیا تماشہ لگا گھر پہنچنے کے بعد؟' رانی نے پوچھا۔ وہ لمبے چوڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ٹانگیں اس نے میز پر دھری ہوئیں تھی۔ افسانے کا سر اسکی گود میں تھا۔ افسانے لیٹی ہوتی تھی۔ وہ رانی کی لاڈلی بیٹی کا روپ لگ رہی تھی۔ اب رانی "آپ" سے "تم" والا گئیر لگا چکی تھی۔

'میں نے تو آپ کی بات پلے باندھ لی تھی۔۔ اسی دن جب آپ نے کہا تھا کہ کسی شے کا بھی پچھتاوا نہ کرنا۔ چند لمحوں کے لئے سکتے میں ضرور آئی تھی سب کچھ دیکھ کر مگر فوراً نارمل ہو گئی۔ راستے بھر نارمل رہی۔ مگر ماں مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو چکی تھی۔ اس لئے کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میں صبح اٹھی تو ماں کام پر جا چکی تھی حالانکہ چھٹی کا دن تھا۔ میں سمجھ گئی کہ ماں میرا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ خیر۔۔ شام کو واپس آئی تو سر درد کا بہانہ کر کے سونے چلی گئی۔ میں نے بھی سونے نہ دیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیوں مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں جو ہوا۔ لیکن ہم سہیلیاں بھی تو ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہم دونوں حمام میں ننگے ہو چکے ہیں۔ کیونکہ اس کا اور کھوڑو کا رشتہ ایسا ہی تھا جیسے میرا اور بوبی کا یا میرا اور میکس کا۔ اس پر اس نے پہلی بار مجھ سے نظریں ملائیں۔ اس نے اتنا کہہ کہ یہ سب کچھ اس نے میری خاطر کیا تھا!'

'کیا تو نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کھوڑو کے ساتھ سو جائے؟' رانی نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔ میں نے ایک فرمائش کی تھی۔۔ کہ بوبی جیسا ایک بھائی اور دے مجھے۔ اور یہ بوبی کی بھی دلی خواہش تھی۔۔ بہت پرانی۔' افسانے بولی۔

'تو کیا رحیم صاحب تا حیات روزے سے ہوتے ہیں؟' رانی اب چسکے لینا شروع ہو چکی تھی۔ اس کی یہ عادت غالباً پیدائیشی تھی۔

'یہ بات نہیں ہے۔۔ ابا تو ہر وقت چپکے رہنا چاہتے ہیں۔ ماں ہی ہے جو انہیں لفٹ نہیں کراتی۔ وہ تو دن میں دس بار روزہ توڑتے اور دوبارہ سحری بھی کر لیتے ہیں۔ بس حکم الہی نہیں ہو رہا۔۔۔' افسانے رانی کے خدشات دور کرتے بولی۔

'تو کوئی فرشتہ اترا تھا محمودہ بیگم پر یہ بتلانے کے لئے کہ حکم الہی کھوڑو کے ساتھ مشروط ہے؟' رانی اب حیران ہونا شروع ہو چکی تھی۔

'یہ بات نہیں ہے۔۔۔ بات کچھ اور ہے۔ کیسے سمجھاؤں؟ پوری داستان امیر حمزہ بتانا پڑے گی۔۔' افسانے بھنا کر بولی۔

'تو بتانا! میں ہمہ تن گوش ہوں۔ دیباچے سے شروع ہو جا!' رانی اس کا ماتھا سہلاتے بولی۔

'اصل میں بوبی میرا سگا بھائی نہیں؟' افسانے بولی۔

'دو خصم کیے ہونگے محمودہ نے!' رانی بولی۔

'ارے نہیں۔۔'

'پھر لے پالک ہو گا بوبی۔۔۔' رانی نے دوسرا اندازہ لگایا۔ اسے اندازے لگانے کا ازلی شوق تھا۔

'نہیں۔۔۔ بوبی کا باپ میرا باپ نہیں۔۔ ملک ہے!'

'کیا؟؟ نہیں یار!' رانی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے بعد افسانے نے اسے داستان کے باقی ابواب سنائے جنہوں نے رانی کی حیرت اور تجربے میں ایک نیا اضافہ کیا۔

'جب ملک نے محمودہ کی خواہش پوری کر دی تو اسے کھوڑو کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟' رانی اب بات کو مکمل سمجھ چکی تھی۔ چند کڑیاں باقی تھیں۔ انہیں ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔

'ملک نے تو پوری دیانتداری کا مظاہرہ کیا لیکن حکم الہی پھر بھی نہ ہوا۔ لہذا اماں نے سوچا کہ دوسرا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔' افسانے نے کھوئی ہوئی کڑی ملا دی۔

'اچھا۔۔۔ لیکن اگر کھوڑو کا تیر بھی نشانے پر نہ لگا تو مجھے ضرور بتائیو۔ پھر میں اسی سیاستدان کے بیٹے کا تیر محمودہ کے ترکش میں ڈالونگی جس نے ریحانہ کو دائی اماں تک پہنچا دیا۔ بڑا پر اثر تیر ہے اس کا۔ میں آزما چکی ہوں۔۔ ایک نہیں کئی بار!' یہ کہہ کر رانی نے ایک کھلا قہقہہ لگایا جس کا ویسا ہی جواب افسانے نے بھی دیا۔

'اور بوبی کو کیسی لگی پارٹی؟'

'بوبی کو بڑا مزہ آیا۔ وہ کہہ رہا تھا ایسی پارٹیاں اس نے صرف فلموں میں دیکھیں۔ اور آپ نے اسے بھی لائن پر لگا دیا۔ کافی نشے میں تھا وہ!' افسانے بولی۔

'اچھا! کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کیا اس نے؟'

'نہیں ایسا کچھ نہیں کیا۔ راستے بھر میرے ساتھ کھیلتا رہا!' افسانے نے مسکرا کر کہا۔

'جیسے ہم دونوں اکثر کھیلتے ہیں؟؟ ہے نا؟' رانی اب مکمل شرارت کے موڈ میں تھی۔ اس کا بھی اب دل کھیل کی جانب مائل ہو چکا تھا۔

'جی ہاں! اور وہ بہت جلد آپ کے ساتھ بھی کھیلے گا۔۔۔ چھپن چھپائی اور پکڑم پکڑائی۔ میں نے اچھی طرح ذہن سازی کر دی ہے اس کی۔ سبق رٹا دیا ہے۔ آپ کے ہاتھ نہیں آئے گا وہ۔ بہت پھرتیلا ہے۔

'بڑے بڑے بھیگی بلی بن چکے میرے آگے۔ ایسے کئی بوبی تجھے جلد دکھاؤں گی۔ تو اپنا بوبی بھول جائے گی!' رانی نے ایک بار پھر فلک شگاف قہقہ لگاتے کہا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ اس کا دل کھیلنے کے لئے مچل تھا۔ اس سوچ نے ماحول کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بنا دیا۔

باب39

خاتون اول کے پدر سری نظام پر خیالات!

'میرا تو دل ڈوبنے لگ جاتا ہے جب میں آپ لوگوں کی گفتگو سنتی ہوں۔۔عورتوں کے حقوق کے حوالے سے۔۔۔۔ آپ لوگوں کی۔۔اس ہال میں بیٹھی ہوئی خواتین کی۔۔۔۔جو اپنے آپ کو فخر سے فیمینسٹ کہتی ہیں۔ آپ میں سے بہت ساری میری ہم جماعت رہیں۔ بہت سی میرے گاؤں سے ہیں۔ بہت سوں نے میرے ساتھ کام کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سب قابل خواتین ہیں۔ لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب آپ جاہلانہ گفتگو کرتی ہیں۔ ایسی جو سفید جھوٹ ہے۔ حقیقت کے برعکس ہے۔ یہ سامنے پہلی قطار میں انم تشریف فرماں ہیں۔ یہ میرے ساتھ کام کر چکی ہیں۔ میرے گاؤں سے ہیں۔ انم بیٹا! ذرا اپنی کہانی ہمیں سناؤ۔۔۔'

ایک بہت بڑے ہال میں ہزاروں لوگوں سے۔۔جن میں بھاری اکثریت خواتین کی تھی۔۔ملک کی خاتون اول مخاطب تھی۔ یہ زمیندار گھرانے کی عورت تھی۔ انتہائی اعلی تعلیمیافتہ اور قابل عزت۔ بہت بڑے بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی سرابرہ رہی۔ حال ہی میں ریٹائر ہوئی تھی۔ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اس کا کام بے مثال تھا۔ حوالے دیے جاتے تھے۔ اس کے پیروکار اور پرستار۔۔مرد اور عورت دونوں۔۔لاکھوں میں تھے۔ یہ ہی اپنے شوہر کی سیاسی مہم چلاتی تھی۔ اسکی تقاریر لوگوں میں جذبہ بیدار کرتیں۔ اس جیسی پروقار اور متین خواتین دنیا میں بہت ہی کم ہونگی۔

ملک میں ایک عظیم الشان اجتماع جاری تھا۔۔عورتوں کا۔ عورتوں کے لئے کام کرنے والی مقامی، علاقائی، صوبائی اور ملکی تنظیموں کا۔۔چھوٹی بڑی سب کا۔ یہ اس اجتماع سے بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہی تھی۔ اس کی بات بہت وزن رکھتی تھی۔ یہ انتہائی رعب دار خاتون تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ بول رہی ہو اور کوئی اسے ٹوک دے۔ سب اسے انتہائی توجہ سے سنا کرتے تھے۔ اس کا ہر لفظ نپا تلا ہوتا جیسے برسوں سوچ کر کاغذ پر ڈھالا گیا ہو۔ ایک لفظ بھی فالتو نہ ہوتا اس کی تقریر میں۔ اپنی تقریر کے ابتدائی کلمات کے بعد یہ چاہتی تھی کہ انم اپنا تجربہ دوسروں کے ساتھ بانٹے۔ انم اٹھ کر سٹیج پر آ گئی۔ ڈائس خاتون اول نے اس کے حوالے کر دیا اور خود جا کر سٹیج پر بیٹھ گئی۔

'ہم دو بہنیں ہیں۔ ہم دونوں اس وقت آزاد معیشت دان ہیں۔ ریسرچ کرتے ہیں۔ میرے والد صاحب گاؤں میں میڈم (خاتون اول) کے ایک مزارعے تھے۔ انکے پاس ایک سائیکل تھی۔ اس سائیکل کے کیریئر پر انہوں نے ایک بڑا سا لکڑی کا ڈبہ نصب کیا ہوا تھا۔ ہم جڑواں بہنیں اس وقت گاؤں کے سرکاری سکول میں پہلی جماعت میں تھیں۔ بابا ہم دونوں کو اس ڈبے میں بٹھا دیتے۔ اور سائیکل چلاتے ہمیں سکول چھوڑ آتے۔ چھٹی کے وقت اسی طرح ہمیں گھر واپس لے آتے۔ کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ ہمیشہ ہمارے لئے ٹافیاں بسکٹ لے کر آتے جو ہم واپسی پر گھر آتے کھاتے جاتے۔ ہمارا سکول گھر سے قریب آٹھ کلومیٹر دور تھا۔ سکول سے گھر تک بابا کے روز دو چکر لگتے۔ اس طرح وہ روز بتیس کلومیٹر سائیکل کھینچتے۔ یہ سلسلہ پانچ برس جاری رہا۔ اس کے بعد بابا کو میڈم نے ایک نیا سکوٹر دلا دیا جس پر وہ ہمیں کالج لیول تک پک اینڈ ڈراپ کرتے رہے۔ اب میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ کیا مجھے اپنے بابا کو گالی دینا چاہیے؟ کیا مجھے ان کے خلاف بغاوت کرنا چاہیے؟ کیا مجھے لپک کر ان کی آنکھیں نوچ لینا چاہییں؟ اگر میں ایسا کروں تو آپ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرینگی؟' ذہین لڑکی یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ہال میں سکوت طاری تھا جسے چند لمحوں بعد ایک کالج کی بچی نے توڑا۔۔۔ یہ کہہ کر۔۔۔ 'آپ کو اپنے بابا پر فخر کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں!' اگلے لمحے ہال تالیوں سے کئی منٹ گونجتا رہا۔ جب شور تھما اور خاموشی کا سلسلہ بحال ہوا تو لڑکی آگے بڑھی۔۔۔ یہ کہتے:

'تو پھر کیوں آپ فیمینسٹس اس ملک کی معصوم، بھولی بھالی بچیوں کو یہ درس دیتی ہیں کہ اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرو۔ کیوں یہ نعرے ہمیں سننے کو ملتے ہیں کہ "پدرسری نظام کی تو میں بینڈ بجادوں گی۔ پدرسری نظام میں باپ مداری اور بیٹی بندریا ہے جسے باپ نچا نچا کر پیسہ اکھٹا کرتا ہے۔" آپ سب سننے والوں سے ایک سوال ہے۔ ہاں یا ناں میں جواب دیجئے گا۔۔۔ کیا آپ کا بھائی یا باپ آپکو مداری کی طرح لگا؟'

'ہرگز نہیں!' ہال اس جملے سے گونج اٹھا۔

'تو پھر کون آپ کو مداری لگتا ہے؟' کوئی سمجھا سکتا ہے مجھے؟ لڑکی نے جب یہ سوال داغا تو شبانہ نے ہاتھ بلند کیا۔

'شبانہ آپ ڈائس پر تشریف لے آیئے!' خاتون اول نے کہا۔ چند لمحوں بعد شبانہ ڈائس پر تھی۔ وہ مائک کو سنبھال چکی تھی۔ اب وہ بولنے کے تیار تھی۔

'میرے والد یا میرے بھائی یا میرے خاوند یا میرے تایا، یا چچا یا ماموں یا گھر کا کوئی بھی مرد سرپرست ایسا نہ تھا۔ آپ یہ غلط سمجھتی ہیں کہ جب ہم پدر سری نظام کی مذمت کرتے ہیں اور اسے مداری، بندریا، ڈگڈگی اور چھڑی سے تشبیہ دیتے ہیں تو ہماری نیت اپنے باپ یا دیگر مرد افراد کو گالی دینے کی نہیں ہوتی۔ ہم تو معاشرے کی مظلوم عورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہیں باپوں نے، بھائیوں نے، شوہروں نے اور دیگر مرد حضرات نے پدر سری یا پدر شاہی نظام کے تحت بندریا بنا دیا۔ پاؤں کی جوتی بنا دیا۔ ظاہر ہے ہمارے بابا ایسا کرتے تو ہم کیسے اعلی تعلیم باہر کی جامعات میں حاصل کرتے؟ ہم اپنے نہیں دوسروں کے باپوں کو مداری کہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج میں یہ عظیم غلط فہمی دور کر چکی ہونگی۔ بہت بہت شکریہ!' شبانہ نے بات ختم کی اور اپنی نشست دوبارہ سنبھال لی۔ اب لڑکی شروع ہوئی:

'آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ اس ملک کی دس کروڑ خواتین کی ترجمانی کریں اور وہ بھی غلط۔ آپ کے پاس کوئی اعداد و شمار ہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ دس کروڑ عورتوں کے باپ یا بھائی بیٹیوں یا بہنوں کو بندریا بناتے ہیں۔ انہیں جھلمل جھلمل کپڑے پہنا کر ڈگڈگی بجا کر چھڑی دکھا کر سر بازار نچاتے ہیں؟'

کسی نے چوں تک نہ کی۔ ہال میں لوگوں کے سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لڑکی بات آگے بڑھاتے بولی:

'اکا دکا اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی؛ کسی نے غیرت کے نام پر اسے قتل کر دیا؛ کسی ذہنی مریض نے اپنی سگی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کر لیا تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ دس کروڑ خواتین کے باپ یا بھائی ایسا ہی کرتے ہیں؟ بولیے۔ میں آپ کا جواب سننا چاہتی ہوں۔'

'ہرگز نہیں!' ہال ایک بار پھر اتفاق رائے سے گونج اٹھا۔

'لیکن جب آپ اس قسم کے واقعات کی تشہیر چلا چلا کر، اچھل اچھل کر منہ سے جھاگ اڑا اڑا کر کرتی ہیں تو باہر کی دنیا یہ ہی سمجھتی ہے کہ اس دیس کا ہر باپ ایسا ہی ہے جیسے آپ پیش کر رہی ہیں۔ آپ بھول جاتی ہیں کہ آپ سب اس دیس کی سفیر ہیں۔ آپ کو سفیر امن ہونا چاہیے۔ سفیر منطق ہونا چاہیے نہ کہ سفیر فساد! ایسا کر کے آپ باہر کی دنیا پر اپنے دیس کا انتہائی گھٹیا اور منفی تاثر قائم کرتی ہیں۔ پھر وہ آپ کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ واقعی اس معاشرے کی عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ "میرا جسم میری مرضی" ہے۔ "پدر شاہی نظام" ہے۔'

'کچی بستیوں میں نالوں کے نزدیک رہنے والی غریب عورتوں کے گھر سب سے پہلے سیلاب میں بہتے ہیں کیونکہ امیر لوگوں کے گھرون کا کچرا اس میں پھینکا جاتا ہے جو نالوں کے پاٹ مختصر کر دیتا ہے۔ جبکہ امیر لوگ گراؤنڈ فلور کا فرنیچر دوسرے یا تیسرے فلور پر منتقل کر کے فائیو سٹار ہوٹلز میں چیک ان ہو جاتے ہیں۔ سیلابی ریلوں کے گذرنے کے بعد اپنے محلوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ذرہ برابر نقصان نہیں ہوتا انہیں۔ کچی آبادی کی غریب عورت جس نے بیٹی کا جہیز پائی پائی جمع کر کے اکھٹا کیا ہوتا ہے روتی ہے۔'

'دہائیوں کی جمع پونجی منٹوں میں لٹ جاتی ہے۔ کیا آپ انکی ترجمان بنتی ہیں؟ آپ یہ مطالبہ تو کبھی بھی نہیں کرتیں کہ امیر لوگوں کے گھر کا کچرا نالوں میں نہ ٹھکانے لگایا جائے۔ امیر لوگ اپنی فیکٹریوں کا زہریلا فضلہ دریاؤں میں نہ پھینکیں۔ ایسا کر کے وہ غریبوں سے پینے کا پانی تک چھین لیتے ہیں۔ خود وہ امپورٹڈ پانی پیتے ہیں۔ آپ ان کی طرفدار بن کر یہ بتاتی ہیں کہ جا اپنے باپ اور بھائی کے خلاف بغاوت کر۔ تیری بیٹی کے جہیز کا سامان سیلاب نہیں پدر سری نظام بہا کرلے گیا۔ اگر تیرے جسم پر تیری مرضی چلتی تو آج سیلاب ہی نہ آتا! وہی باپ اور بھائی ان خواتین کو پلاسٹک کے ٹب میں یا لکڑی کی چارپائی پر بٹھا کر محفوظ مقام تک پہنچاتا ہے۔ سیلاب کے بعد دوبارہ سے گھر تعمیر شروع کرتا ہے۔ اور آپ اسے ہی گالیاں دیتی ہیں۔ سبحان اللہ! میں ایس پی آئی کی گوہر صاحبہ کو یہاں موجود دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ امیر لوگوں نے نالوں پر مٹی ڈال کر پلازے بنا دیے۔ گوہر کو میں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ اس پر کیس سٹڈی ہونی چاہیے۔ مگر انہوں نے جواب تک نہ دیا۔ ان کی عظیم الشان این جی او جبری شادی پر بہت بڑی ریسرچ میں مصروف تھی۔' لڑکی یہ کہہ کر گوہر کی جانب دیکھنے لگی۔

'جی گوہر آپ نے ہاتھ کھڑا کیا ہے۔ کچھ کہنا ہے تو ڈائس پر آ جایئے تاکہ سب آپ کو دیکھ بھی سکیں۔' یہ خاتون اول تھی۔ گوہر ڈائس پر پہنچی اور ڈھٹائی سے بولی:

'دراصل آپ کو تو معلوم ہیں ہم ایک غریب دیس ہیں۔ خزانہ خالی ہے۔ ہمیں فنڈنگ ہی جبری شادی کے لئے ملی تھی۔ اب اسے نالوں کے پاٹ چوڑا کرنے پر تو لگانا ممکن نہ تھا۔ آپ سب جانتے ہیں گرانٹ کو اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جس کے لئے وہ حاصل کی گئی ہو۔ دوسری بات، یہ بہت چھوٹا مسئلہ ہے۔ ہم پالیسی ساز ادارہ چلاتے ہیں۔ ہمارا کام پھاوڑے لے کر نالوں کی بھل صفائی کرنا نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے آپ سب کو ہمارے موقف سے اتفاق ہو گا!'

یہ کہہ کر گوہر واپس اپنی جگہ پر چلی گئی۔ اب خاتون اول کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر انم بھی اپنی نشست پر براجمان ہو گئی۔

'شکریہ گوہر۔ آپ نے سچ کہا۔ آپ میری اسسٹنٹ رہ چکی ہیں۔ کوئی غلط نہیں کہا آپ نے۔ واقعی گرانٹ کو اس کام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کام کے لئے وہ مانگی گئی ہو۔ لیکن یہاں ایک اہم سوال ہے۔۔۔ کیا ہماری ترجیحات درست ہیں یا گمراہ کن؟ آپ لوگ جبری شادی کے بجائے ماحولیاتی تبدیلی پر بھی تو پروپوزل پیش کر سکتے تھے۔۔۔ آپ نے اپنے نئے دفتر کی آرائش پر جتنا پیسہ خرچ کیا، اتنے میں ایک درجن نالوں کی بھل صفائی ہو سکتی تھی۔ آپ فور بائی فور جیپ میں دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر آتی ہیں۔ بہترین سڑک ہے دونوں مقامات کے درمیان۔ آپ کے دفتر اور گھر کے درمیان کوئی ندی نالے یا کیچڑ سے بھرے جوہڑ نہیں جو فور بائی فور گاڑی کی ضرورت پڑے۔ جو خرچہ پٹرول اور مرمت کی مد میں اس گاڑی اور اس جیسی کئی گاڑیوں پر آتا ہے وہ حقیقی مسائل پر بھی تو خرچ کیا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ سادگی کیوں نہیں اختیار کرتے؟' کوئی جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ہال میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

'کیا اس معاشرے میں عورتوں کے بڑے بڑے مسائل یہ ہی ہیں جو آپ ڈونرز کو اٹھتے بیٹھتے رٹاتی ہیں: شادی قانونی ریپ ہے؛ ہم جنس پرستی حقیقت ہے اسے قانونی تحفظ دے دینا چاہیے؛ سزائے موت ختم کر دینی چاہیے؛ عورتوں کو اسقاط حمل کا حق ملنا چاہیے جسے مغرب میں کئی حلقے رد کر چکے ہیں؛ لڑکیوں کو گھر سے بھاگ کر شادی کر لینا چاہیے؛ انہیں رات کی تاریکی میں پارکوں میں گھومنے کی آزادی ہونی چاہیے؛ وہ رات کے نو بجے گھر سے دہی خریدنے باہر جا سکیں؛ وہ بھڑکیلا لباس جو ستر پوشی کے لئے ناکافی ہو پہن کر گھومیں مگر مرد نظر بھی نہ اٹھائے؛ عورت محرم کے بغیر اکیلی ملک کے ایک کونے سے ویران راستوں پر گاڑی چلاتے دوسرے کونے تک باحفاظت پہنچ سکے۔ اگر بھائی صرف نیکر پہن کر پارک میں بھاگ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بھاگ سکتی؟ میں جو مرضی پہن کر سکول میں کلاس لوں۔۔۔ بے شک میں ننگی ہو کر کلاس لوں۔۔ طلباء کا فرض ہے کہ وہ استانی کا لباس نہ دیکھیں، سبق پر توجہ دیں؟ اگر یہ مسائل شد و مد سے بین الاقوامی فورمز پر اٹھائے جائیں گے تو باہر والے ان ہی کاموں پر اپنے شہریوں کے ٹیکس کا پیسہ خرچ کرینگے۔ ہمارے مسائل یہ ہرگز نہیں۔ نہ ہی یہ مسائل آپ کے ہیں۔ کیونکہ آپ نے تو ہر قسم کی آزادی اپنے باپ اور بھائی سے پہلے ہی حاصل کر رکھی ہے۔ اور ہمارا معاشرہ پدرشاہی نہیں بیگم شاہی نظام پر چلتا ہے۔ بیوی شوہر کو غلط راہ پر ڈالتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کی سہیلی کے پاس تو سونے کی دس چوڑیاں ہیں۔ میرے پاس تو ایک انگوٹھی بھی نہیں۔ شوہر اسے کہتا ہے کہ بیگم میں رشوت نہیں لیتا۔ رزق حلال کماتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے اور کہتی ہے کہ تم بے وقوف ہو جو نہیں لیتے۔ سب لیتے ہیں۔ تم کیوں نہیں لیتے؟

بیوی اور بچوں کی جائز و ناجائز خواہشات پوری کرتا کرتا مرد گناہوں کے دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ میک اپ گھر پر بھی ہو سکتا ہے۔ ہر روز بیوٹی پارلر جانے کی ضرورت نہیں۔ شوہر بیچارہ عورت کے خرچے پورے کرنے کے لئے سارے معاشرے کو کرپشن کے ناسور میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شوہر تو نہیں جاتا بیوٹی پارلر! شوہر نے تو ویکسنگ نہیں کرانی ہوتی! شوہر نے تو سونے کی چوڑیاں نہیں پہننا ہوتیں! بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ اپنا کام اس انداز میں کریں کہ اچھا کام کرنے والے گمنام نہ ہو جائیں۔ بد دل نہ ہو جائیں! خدا حافظ!'

تین چوتھائی ہال کھڑا ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جو چپ تھے وہ سب وہ ہی تھے۔۔ بڑی بڑی این جی اوز کے کرتا دھرتا۔۔ لیکن زیادہ دیر بیٹھے وہ بھی نہ رہ سکے۔ منافقت اور چاپلوسی نے انہیں بھی کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

باب 40

فیمی نازی ازم!

'بہت عمدہ کام کر رہا ہے آپ کا ویب میگزین۔ پدر سری نظام پر آپ کا بے لاگ تجزیہ ان فیمی نازیوں کے لئے آئینہ ہے جس سے یہ منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔' مولانا ابدالی نے خوش ہو کر کہا۔ وہ رابعہ کو انٹرویو دے رہا تھا۔

'مولانا صاحب! کیا یہ اصطلاح۔۔ فیمی نازی۔۔ آپ کے ذہن کی اختراع ہے؟ بہت سے لوگوں کے منہ سے میں یہ اصطلاح سن چکی ہوں۔' رابعہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

'ارے بھائی یہ رانی صاحبہ کی دین ہے۔ ایک سماجی تقریب میں ان سے ہوئی تھی ملاقات۔ بس اس دن سے میری زبان پر چڑھ گئی۔' ابدالی مسکراتے ہوئے بولا۔

'مولانا صاحب آپ لوگ اس بنیاد پر عورتوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ پیغمبر یا نبی نہ ہوئی۔ وہ امامت نہیں کر سکتی۔ وہ جنازہ نہیں پڑھا سکتی۔ وہ بغیر نامحرم حج یا عمرہ نہیں کر سکتی؟' رابعہ نے بے دھڑک ایک چبھتا ہوا سوال پوچھ لیا۔ جس کا جواب ابدالی نے بہت تحمل سے دے کر لڑکی کو حیران کر دیا۔ جوشیلی صحافی کو امید تھی کہ ابدالی مشتعل ہو جائے گا۔ اور وہ اسے طیش دلا کر مطلب کی بات نکلوالے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ابدالی نے اسے لاجواب کر دیا یہ کہہ کر کہ عورت کو تو وہ کئی لحاظ سے مرد سے افضل سمجھتا تھا کیونکہ پیغمبروں، ولیوں، محرموں، اماموں اور جنازہ پڑھانے والوں کو وہ ہی جنم دیتی تھی۔

'عورت اور مرد برابر ہیں۔۔ حقوق اور ذمہ داریوں کے حوالے سے۔ دونوں ایک جیسے نہیں۔ جیسے اگر آپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ وہ برابر ہیں مگر ایک جیسے نہیں ہیں بے شک وہ جڑواں ہوں۔ نظام تو ایک ہی ہو گا۔ اگر پدر سری نہیں تو زنان سری۔ گاڑی ایک ہی شخص چلا سکتا ہے ایک وقت میں۔ دونوں سٹیرنگ سے کھینچا تانی کرینگے تو بس کھائی میں گر جائے گی۔ یہ ہماری فیمی نازی بہنیں جو اپنے آپ کو عورت کے حق کی واحد علمبردار سمجھتی ہیں ایک فتنے کو فروغ دے رہی ہیں۔ میں آپ کو اپنی مثال دیتا ہوں۔ گھر کا سربراہ میں ہوں لیکن تمام فیصلے بیگم اور بچوں کے مشورے سے کرتا ہوں۔ میری بیوی بیٹیوں کو تعلیم کے لئے باہر بھیجنے کے حق میں نہ تھی۔ اگر زنان سری سسٹم گھر میں ہوتا تو آج بچیاں اعلی تعلیم حاصل کر کے ملک کی خدمت ملک میں ہی نہ کر رہی ہوتیں۔ میں نے دونوں کو باہر بھیجا اور

اپنے خرچے پر۔ مغرب کی خیرات پر نہیں! اس ملک کی سربراہی دو بار ایک عورت کر چکی ہے۔ اس ملک میں ہر شعبے میں عورتیں ہی چھائی ہوئی ہیں۔ آپ خود میدان صحافت کی خاتون شہسوار ہیں۔ کس منہ سے پدرسری نظام کو آپ لوگ۔۔ میری مراد آپ کی ذات سے نہیں فیمی نسٹس سے ہے۔۔ گالی دے سکتے ہیں۔ یہاں مرد بیچارہ تین تین نوکریاں کر کے گھر چلاتا ہے اور آپ اس کی بیوی اور بیٹی کو اسی کے خلاف بھڑکاتی ہیں! یہ کہاں کی منطق ہے؟ یہ تو سازش ہے گھر کو توڑنے کی۔ خاندان کو تباہ کرنے کی! اگر یہ فیمینزم ہے تو ہم اسے فتنہ سمجھتے ہیں اور اسکے خلاف آواز اٹھاتے رہینگے۔ یہ فیمی نازی ازم ہے!'ابدالی نے نپے تلے انداز میں اپنا موقف سامنے رکھدیا جسے رد کرنا ناممکن تھا۔

'آپ اپنی تقاریر میں لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔ پچھلے سال ویلنٹائن ڈے پر آپ کی شعلہ بیانی نے بلوہ کرادیا۔۔'رابعہ نے اب ایک اور کوشش کی مولانا کو مشکل میں ڈالنے کی۔

'آپ لوگ بہت معصوم ہیں۔ مغرب کی "تقسیم کرو تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" والی سوچ سے ابھی تک ناواقف ہیں۔ مغرب کی پالیسی ہے کہ چور کو کہے چوری کر اور شاہ کو کہے تیرا گھر لٹا۔ ایک طرف وہ این جی اوز کو پیسہ دیتا ہے کہ ویلنٹائن ڈے کے حق میں ریلیاں نکالو۔ یہ مہذب این جی اوز ہیں۔ دوسری جانب اس نے کئی ایسی این جی اوز بنا رکھی ہیں جو وہ آپکے خلاف استعمال کرتا ہے!'ابدالی نے کہا اور رک گیا۔

'یہ کونسی این جی اوز ہیں جنہیں مغرب پیسہ دیتا ہے اور ہمارے ہی خلاف استعمال کرتا ہے؟'رابعہ کا دماغ الجھ چکا تھا۔

'یہ این جی اوز وہ ٹولے ہیں جو معاشرے میں تشدد پھیلاتے ہیں۔ شدت پسند، دہشت گرد۔۔ اصلی والے۔ جن کا اسلام سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ چند برس پہلے ایک وڈیو سب کے پاس پہنچی تھی۔ چند داڑھی اور پگڑی والے مرد ایک عورت کو جو برقعے میں تھی کوڑے مار رہے تھے۔ اس وڈیو کو شائع کر کے دنیا تک یہ پیغام پہنچایا گیا کہ دیکھو اسلام کے نام پر عورتوں پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ ہم نے ایک طاقتور کمیشن قائم کیا جس میں سابقہ ججز شامل تھے۔ لمبی چوڑی چھان بین کی تو پتہ چلا یہ وڈیو جعلی تھی۔ ایک این جی او نے بنائی تھی مغرب کے کہنے پر یہ وڈیو۔۔۔ شریعت کو بدنام کرنے کے لئے۔ بنانے والی ایک بے شرم اور غدار عورت تھی جو اب ملک چھوڑ کر فرار ہو چکی ہے۔ آقاؤں نے اسے سیاسی پناہ دے دی ہے۔ اب وہ باہر بیٹھ کر ملک اور اسلام کو بدنام کرتی ہے۔ مغرب بے وقوف نہیں جو ہمارے غم میں دبلا ہوا جائے۔ مغرب جو رقم ہمارے ایک جوان پر سکالرشپ کی مد میں خرچ کرتا ہے اس میں ایک گاؤں میں کئی پرائمری اور مڈل سکول قائم کیے جا سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ

سکالرشپ بند کر دیے جائیں۔ سو کی جگہ پچاس کر دیں باقی پیسہ ابتدائی تعلیم پر لگائیں تو یہ معاشرہ کہیں زیادہ بہتر ہو سکتا ہے۔ سکالرشپ اعلی لیول پر دیے ہی یوں جاتے ہیں کہ لینے والا رہتی سانسوں تک مغرب کی زبان بولتا رہے۔ ہم تو ابتدائی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو ابھی یہ سیکھنا ہے کہ قطار کیسے بنائی جاتی ہے؟ اپنے گھر کو کوڑا دوسرے کے خالی پلاٹ پر پھینکنا غیر اخلاقی عمل ہے۔ لیکن ہمیں اعلی تعلیم کے چکر میں الجھایا جا چکا ہے۔ یہ وہ سازش ہے جسے آپ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔' ابدالی رعب دار انداز میں بولا۔

'یہ تو سرکاری موقف ہے۔ ہر دہشت گردی کے واقعے اور مسئلے کا الزام مغربی طاقتوں پر لگا کر اپنی جان چھڑا لو۔۔۔' رابعہ بولی۔

'بی بی بات زیادہ پرانی نہیں۔ ان ہی دہشت گردوں کو وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ہار پہنائے جاتے تھے۔ اسلام کے ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ مغرب انہیں فلموں میں ہیرو بنا کر پیش کرتا تھا۔ صرف گیارہ بارہ برس بعد یہ ہی اسلام کے مجاہدین دہشت گرد بن گئے! ہر داڑھی اور پگڑی والا دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ عراق میں ملے وسیع پیمانے پر تباہی مچانے والے ہتھیار؟ جھوٹی رپورٹیں گھڑ کر عراق کو ایسا تہنس نہس کیا کہ اب وہ دہشت گردی کا ایک نیا گڑھ بن چکا ہے۔ بیس اکیس برس طالبان کو کائنات کا بدترین دشمن قرار دے کر ساری دنیا افغانستان پر پل پڑی۔ ملک کی ہر شے تباہ کر دی۔ پھر راتوں رات بھاگ گئے۔ اب وہی طالبان پھر سے اقتدار میں ہیں۔ اب انہیں تسلیم کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ اگر یہ ہی کرنا تھا۔ اگر سو جوتے اور سو پیاز ہی کھانے تھے تو خطے میں آگ کیوں لگائی؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اگر مجھے سمجھا سکتی ہیں تو میں آپ پر یقین لے آؤں گا!' ابدالی کے جواب کے آگے رابعہ کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا۔

باب 41

نپولین عاشق تھا عیاش نہیں!

'اوہ نو۔۔شہباز۔۔یہ دیکھو!' رابعہ نے چونک کر کہا۔ اس نے انٹرنیٹ پر کچھ ایسا پڑھا جس نے اسے حیران کر دیا۔

'کیا ہے؟' یہ کہتے وہ رابعہ کے کمپیوٹر کی سکرین کے سامنے آ چکا تھا۔ لیکن اس پڑھ کر حیرت نہ ہوئی۔ اس نے صرف اتنا کہا: 'یہ تو ہونا ہی تھا۔۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آناً فاناً ہو گیا۔۔۔'

'تم نے اسے بتایا کیوں نہیں؟' رابعہ نے پوچھا۔

'وہ کسی کی سنتا ہے؟' شہباز بولا۔

نپولین کی این جی او کے بورڈ ممبران ادارے کو ختم کر چکے تھے۔ پچیس برس پرانا ادارہ اب اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔

'لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ این جی او تو پھل پھول رہی تھی۔ بہت پیسہ مل رہا تھا۔ مغرب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ نپولین ہر وقت ملک سے باہر ہی رہتا تھا۔ نت نئے پراجیکٹس کے لئے گرانٹس اکھٹی کر رہا تھا۔ ڈونرز اس کی مٹھی میں تھے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے کہ یار یہ گرانٹ لے لو۔ کہیں کھپا دو اسے تا کہ ہماری جان چھوٹے۔ اور وہ انہیں کہتا ٹیم نہیں ہے میرے پاس!' رابعہ نے پوچھا۔

'بعض اوقات ہماری خوبیاں ہمیں لے ڈوبتی ہیں۔ اگر وہ ہر وقت ملک سے باہر رہتا تھا تو یہ کوئی اچھی بات بھی نہ تھی۔ گھر کا سربراہ غیروں پر گھر چھوڑ کر ساری دنیا گھومتا رہے۔ عیاشی کرتا پھرے۔ ایسے میں گھر تو تباہ ہونا ہی تھا!' شہباز بولا۔

'لیکن وہ عیاشی نہیں کر رہا تھا۔ وہ عیاش نہیں۔ وہ کام سے باہر جاتا تھا۔' رابعہ شہباز کی بات سے متفق نہ تھی۔

'میں محاورتاً کہہ رہا ہوں یہ بات۔ نپولین نے ہی یہ ادارہ قائم کیا۔ شروع سے آخری لمحے تک اسی نے چلایا۔ ہمیشہ اپنی مرضی کی۔ کبھی ڈپٹی نہیں رکھا۔ اسے خود پر بھروسہ تھا کہ وہ اول تا آخر سب کچھ کر لے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اسے چیلنج کرے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ انسان کی توانائیاں کم ہوتی جاتیں ہیں۔ درست کہ وہ اکیلا چلا سکتا تھا ادارہ اور اگلے تیس برس

مزید چلا سکتا تھا لیکن صرف اتنے سائز کا ادارہ جتنا وہ ابتدا میں تھا۔ ادارہ اپنے اصلی حجم سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اسے موثر انداز میں چلانے کے لئے ایک نہیں کئی نپولین درکار تھے۔ ایسے میں اس نے اپنی حماقت سے شہسوار کھو دیا۔ مینا جس کی نہ شکل نہ صورت۔ ٹھیک ہے اوسط درجے کا حسن ہے جو ہر لڑکی میں ہوتا ہے۔۔۔ کو زمین سے آسمان تک پہنچا گیا۔ یہ بات قابل اور مستحق لوگ برداشت نہیں کرتے۔ مینا محنتی تھی مگر قائدانہ اور تخلیقی صلاحیتوں سے محروم! نپولین نے برق رفتار گھوڑے کی سواری چھوڑ کر گدھے کی سواری کو ترجیح دی۔ کہاں شہسوار کہاں مینا۔ بس دوڑ ہار گیا! میں نے اسے سمجھایا تھا کہ مہناز کو نہ رکھے بورڈ میں۔ اسکی شہرت تو داشتہ والی ہے۔ نائکہ ہے وہ۔ سب ہی جانتے ہیں۔ اس میں کوئی شک ہے کیا؟ پھر مہناز نے ایک بھڑوا لانچ کر دیا ادارے میں سید کی صورت میں۔ نپولین یہ چال نہ سمجھ سکا۔ ادارہ بڑھا تو اس نے حل یہ نکالا کہ مینا کو ہی ڈپٹی بنا دیا جو ہر فارن ٹور پر نپولین کے ساتھ دم چھلے کی طرح ساتھ رہتی۔ اب پیچھے کام کون کرے؟ سید؟ وہ تو بھڑوا تھا۔ نپولین اسی بھڑوے پر اندھا اعتماد کیا کرتا تھا۔ ڈھیر سارے جعلی پراجیکٹس اس نے نپولین سے منظور کرا لئے۔ پیسہ مہناز کو کھلا دیا۔ کچھ خود کھا گیا۔ نپولین عجلت میں رہا کرتا تھا۔ نو نو مہینے مسلسل فارن ٹورز کرتا۔ جب واپس آتا تو دفتر میں کاغذوں کا انبار میز سے چھت تک ایک مینار کی صورت میں لگا ہوتا۔ بس وہ اعتماد میں مارا گیا۔ سید اسے کہتا کہ بس سر آپ سائن کر دیں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ جب آڈٹ ہوا تو پول کھل گیا۔ نپولین کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے استعفی دے دیا۔ سب خوش ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ نیا سربراہ تلاش کرتے انہوں نے ادارہ ہی ختم کر دیا اور دال جوتوں میں بانٹ دی۔ ادارے کے اثاثے مہناز کی این جی اوز کو مل گئے۔ کافی پیسہ سید نے بھی بنایا۔ نپولین بیچارے کو تو آخری مہینے کی تنخواہ تک نہ ادا کی گئی۔ کروڑوں میں اسکی گریجویٹی بھی مہناز اور سید کھا گئے۔ جب ادارہ ہی قلاش کر دیا تو پیسہ کہاں سے آئے؟ نپولین ہوش میں آیا ضرور مگر سب کچھ لٹا کر جب مزید لٹانے کو کچھ باقی ہی نہ رہا!'

'میں یقین نہیں کر سکتی کہ نپولین کے زوال کی وجہ مینا تھی۔۔۔' رابعہ بولی۔

'واحد وجہ نہیں لیکن بنیادی وجہ تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ مینا سے نہیں بلکہ مینا اس سے پیار کرتی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اس نے نپولین کو اپنا عادی کر لیا تھا۔ شاید اسی لئے مینا نے آج تک شادی بھی نہیں کی۔' شہباز دور کی کوڑی نکال کر لایا۔

'کچھ بھی ہو۔ نپولین عورت کا شوقین نہیں!' رابعہ نے اپنا موقف دھرایا۔

'نپولین عورتوں کا شوقین ہرگز نہیں۔ میں نے کب کہا؟ وہ مینا کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس میں ڈوبتا ہی چلا گیا لیکن بہت بچ بچا کر۔ رنڈی باز اور عاشق میں زمین آسمان کا فرق

ہوتا ہے۔ نپولین سچا عاشق تھا۔ ہر عاشق کی طرح نپولین نے بھی قیمت چکائی عشق کی۔ مینا کے عشق میں اس کی عقل جاتی رہی۔ بہت احتیاط سے عشق کیا۔ کوشش بھرپور کی کہ کسی کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو۔ پر تاڑنے والے بھی قیامت بھی نظر رکھتے ہیں۔۔ تاڑ جاتے ہیں!' شہباز بولا۔

'اپنی تعریف کر رہے ہو نا؟' رابعہ اسے چھیڑتے بولی۔ دونوں ہنس دیے۔

'مجھے بہت دکھ ہے اس ادارے کے ختم ہونے کا۔ سب این جی اوز میں یہ واحد تھی جو کچھ کام کر رہی تھی۔ ہر لحاظ سے بہت بہتر تھی اوروں سے۔۔۔' شہباز بولا۔

'نپولین کیا کرے گا اب؟ وہ تو صدمے کی کیفیت میں ہو گا۔۔' رابعہ نے پوچھا۔

'نپولین کی ایک بات بہت زبردست ہے۔ زندگی میں بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے، افسوس یا ملال نہیں کرتا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا قائل ہی نہیں۔ صرف آگے دیکھتا ہے۔ وہ چاہے تو موجودہ ادارے سے بھی کئی گنا بڑے ادارے کی داغ بیل ڈال سکتا ہے۔ ڈونرز تو اسے اب بھی پسند کرتے ہیں۔ کچھ نہ بھی کرے، سب ہی اسکی قابلیت اور تجربے سے بطور مشیر ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ وہ دوبارہ امریکہ بھی جا سکتا ہے۔' شہباز بولا۔

'اور مینا۔۔ وہ کیا کرے گی؟'

'اسے شکر ادا کرنا چاہیے اگر کوئی ڈھنگ کا ادارہ اسے پروگرام آفیسر بھی رکھ لے۔ بہت چونا لگایا اس نے بھی ادارے کو۔ کچھ کرنے کی اب تاحیات ضرورت نہیں۔ ہر سال دفتر سے برانڈ نیو گاڑی خود ہی منظور کر کے لے لیتی، پھر اسے کوڑیوں کے مول آؤٹ ڈیٹڈ قرار دیکر خرید لیتی۔ ایک کروڑ کی گاڑی اسے ایک لاکھ میں پڑتی۔ وہی گاڑی خرید کر مارکیٹ پرائس پر بیچ دیتی۔ نوے لاکھ کی تو آرام سے نکل جاتی۔ بیس کے قریب گاڑیاں اسی طرح ہڑپ کر گئی وہ اور ڈکار بھی نہیں ماری! میرے خیال میں اسے اب اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔ بڑھاپے میں انسان بہت اکیلا محسوس کرتا ہے۔ وقت بھی بہت سست رفتاری سے گذرتا ہے۔ اپنے موجود حسن سے ابھی بھی کوئی رئیس قبر میں پیر لٹکائے بڈھا تو مل ہی جائے گا اسے۔' شہباز نے کہا۔

'تم کب بسا رہے ہو گھر؟ اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت!' رابعہ نے یہ سوال پوچھ کر شہباز کو غزالہ کی یاد دلا دی۔

'ہاں میں بھی بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کم از کم جوان تو ہرگز نہیں۔ بہت جلد۔۔۔ شاید تین ماہ بعد؟' شہباز بولا۔

'ارے واہ۔۔۔ یہ تو سکوپ ہے۔ اسے تو شائع کرنا چاہیے۔۔۔'

'خبردار! یہ صحافتی اقدار کی توہین ہو گی۔ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی میں دخل نہیں دیتے!'شہباز بولا۔

'اچھااتناتوبتاؤوہ خوش نصیب کون ہے جس نے تم پر اپناجادو چلادیا؟'رابعہ نے پوچھا۔

'ہے کوئی۔۔۔اس کائنات کا سب سے بڑا معمہ!' شہباز بولا اور رابعہ اسکی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگ گئی۔ شاید اسے آج احساس ہوا کہ وہ شہباز سے پیار کرتی تھی۔ ایسا پیار جس کا اسے کبھی خفیف سا احساس تک نہ ہوا۔ دیر کیوں ہوئی اس احساس کے جاگنے میں؟ شاید وہ بہت مصروف تھی اپنے کام میں؟ اپنے پیشے سے اتنا عشق بھی درست نہیں کہ انسان اپنی ذات تک بھول جائے۔ آج اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ایک عورت ہے۔ اسے بھی کوئی اچھالگ سکتاہے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ کچھ کام کرتی اور کچھ عشق کرتی اور پھر عاجز ہو کر دونوں کو چھوڑ دیتی۔ آج اسے کافی عرصے بعد فیض انکل یاد آئے۔ اس کے لئے فیض انکل اور دوسروں کے لئے عظیم شاعر فیض احمد فیض!

باب42

قبولیت!

'افسانے۔۔رب نے سن لی ہم سب کی!'
'کیا!واقعی؟'اپنی ماں کی بات سنکر اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔
'ہاں۔۔۔دوسرا مہینہ جاری ہے اور ابھی تک میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔' محمودہ بولی۔
'الحمد اللہ۔۔الحمد اللہ۔ یہ بہت بڑی آرزو ہو گی میری جو پوری ہونے جا رہی ہے۔' افسانے نے کہا۔
'لیکن بیٹا اگر بہن ہو گئی تو؟'ماں بولی۔
'آپ ایسا سوچنا چھوڑ دیں۔ قوت ارادی پر بھروسہ کریں۔ ہم دونوں اٹھتے بیٹھتے دعا کرینگے۔ آپ اس بار بھی بیٹا ہی جنم دینگی۔'افسانے نے ماں کو دلاسہ دیا۔
'تو بہت ذہین ہے بیٹی۔بس ایک فکر کھائے جا رہی ہے۔۔۔'ماں اب افسردہ لہجے میں بول رہی تھی۔
'کیا؟'
'تیری جب شادی ہو گی اور سہاگ رات کو۔۔۔اسے سب پتہ چل جائے گا۔ معلوم نہیں آگے کیا ہو گا؟ ہمارے خاندان میں کبھی طلاق نہیں ہوئی۔۔۔'ماں نے اندیشہ ظاہر کیا۔
'آپ بہت سادہ ہیں۔ میں کسی ایسے گھٹیا شخص سے شادی کرونگی ہی نہیں جس کی عقل کنوارے پن اور پردہ بکارت تک محدود ہو۔ یہ بھی کوئی معیار وفا ہے؟'افسانے بولی۔
'لیکن بیٹی ایسے مرد کتنے ہونگے ہمارے معاشرے میں؟'محمودہ اپنی بات افسانے پر مسلط کرنے کے موڈ میں تھی۔
'اچھا پھر آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ اگر کوئی لڑکی اپنے کنوارے پن کے علاوہ جسم کے ہر حصے کی لذت کو دریافت کر چکی ہو۔ اسکی شادی ہو جائے۔ اس کی ساس سہاگ رات کے بعد اگلی صبح سفید چادر کوٹھے پر لٹکا دے جس پر لال رنگ کے دھبے ہو۔ اور وہ اچھل رہی ہو خوشی کے مارے کہ دیکھو کسی سچی ساوتری بہو ملی ہے۔ سو فیصد کنواری! تو اس سے بڑا احمق کوئی اور ہو گا دنیا میں۔۔۔'افسانے نے یہ کہہ کر ماں کے چاروں طبق روشن کر دیے۔

'افسانے میں دیکھتی ہوں کہ زیادہ پڑھی لکھی اور نوکری کرنے والی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو بہت تاخیر سے۔ ماریہ کی مثال ہی لے لے۔۔۔' محمودہ بولی۔

'تو نہ ہو ماں۔ کیا فرق پڑتا ہے! پھر تو خود ہی کہتی ہے کہ رشتے تو اللہ میاں طے کرتا ہے آسمانوں پر۔ اگر کوئی ہوا میری قسمت میں تو خود چل کر آجائے گا۔ اور میں اسے دھوکے میں نہیں رکھوں گی۔ سب بتادونگی کہ کس کس کے ساتھ سوچکی ہوں!' افسانے نے ایک بار پھر ماں کو شش و پنج میں ڈال دیا۔

'اگر تو ایسا کرے گی تو وہ شادی کرتا بھی ہوا تو نہیں کرے گا۔ ایسی بے وقوفی نہ کریو۔۔۔' ماں بولی۔

'اسے تو اندر داخل ہوتے ہی سب پتہ چل جائے گا کہ دروازہ کتنی بار کھلا اور بند ہوا۔ کیسے چھپاؤں گی؟' افسانے شرارتی انداز میں مسکراتے بولی۔

'تو کوئی اللہ میاں کی گائے ٹائپ شوہر۔۔ اپنے باپ جیسا ڈھونڈنا۔ پھر کچھ پتہ نہیں چلے گا!' ماں بولی۔

'ایسا بدھو ملنا اس زمانے میں تو ناممکن ہے۔۔۔ لیکن سنی لیونی کی تو شادی ہوئی حالانکہ وہ پورن سٹار تھی۔ اسطرح بیسیوں ایسی پورن سٹارز ہیں جن سے ان کے عاشقوں نے شادی کی۔ انہوں نے انڈسٹری کو خیر باد کہا اور پھر گھر سنبھال لیا۔ ہر فلم ایکٹریس ڈرامہ ایکٹرس، ماڈل، گانے بجانے والی شادی شدہ ہے۔ بچوں والی ہے۔ سوئے بغیر تو یہ سٹار بن ہی نہیں سکتیں۔ پھر بھی ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے اب شادی سے پہلے یا بعد میں سیکس عام اور قابل قبول ہو چکا ہے۔ کنوارہ پن، وفا وغیرہ اب کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ شوہر کونسے پارسا ہیں؟ وہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ سوتے ہیں۔ یہ کھوڑُو کو ہی دیکھ لیں۔ گھر میں بیوی ہے۔ جوان بیٹی ہے اور آپ کے ساتھ منہ کالا کر رہا تھا!' افسانے نے بے ساختگی میں سخت بات ماں کو کہہ ڈالی۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ زبان کا تیر کیا زخم لگا گیا۔ جب ہوا تو کمان سے نکل چکا تھا۔ محمودہ اداس تھی۔

'آئی ایم سوری اماں میرا یہ مطلب نہ تھا۔ اچھا ایک بات بتائیں۔۔ سچ مچ۔ میں آپکی دوست بھی تو ہوں!' ماں کا دل بہلانے کے لیے یہ جملہ افسانے نے کسی بچی کے طرح بولا جس پر محمودہ مسکرا اٹھی۔

'پوچھ۔۔ کیا پوچھنا چاہتی ہے؟'

'ابا، ملک اور کھوڑُو۔۔ سب سے زیادہ کون اچھا لگا!' افسانے نے مسکراتے کہا۔

'تینوں منہ زور گھوڑے ہیں!' محمودہ بھی شرارت بھرے انداز میں بولی۔

'سب سے زیادہ منہ زور کون لگا؟'افسانے نے پوچھا۔

'کھوڑُوان میں سب سے زیادہ منہ زور تھا!' محمودہ کو یہ کہتے اس کی یاد بھی آگئی۔

'کھوڑُو کہ منہ زوری میں کیا خاص بات تھی؟'افسانے نے پھر کریدا۔

'بہت دیر تک موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی اس طرح ہچکولے کھانے لگی کہ ایسا لگا یہ ڈوب جائے گی۔ بہت مشکل سے سنبھالا میں نے اپنے آپ کو۔ تو ذرا ہوشیار رہنا اس سمندر میں اترتے!'اب ماں بھی چسکے لینا شروع ہو چکی تھی۔

'اماں کتنی بار طوفان آیا؟'افسانے نے پوچھا۔

'تیسری بار آچکا تھا کہ تم لوگوں نے سارا مزہ ہی کر کرا کر دیا!'ماں نے قہقہہ لگاتے کہا۔

'دوبارہ ملنے کو جی تو کرتا ہو گا؟'افسانے نے پوچھا

'تین بار مل بھی چکی ہوں۔ آگے بھی ملتی رہوں گی!' محمودہ نے بلا جھجھک کہا۔ افسانے کو ماں کی دیدہ دلیری پسند آئی اور اسے بوبی کی یاد ستانے لگی!

باب 43

فائنل میچ!

میدان بھارتی فلموں کے پاپ ڈسکو اور دیگر بے ہنگم گانوں سے گونج رہا تھا۔ بہت طاقتور صوتی سسٹم تھا۔ میلوں دور پھیلے ہوئے میدان میں طرح طرح کا میلہ لگا ہوا تھا۔ قسم قسم کے لوگ وہاں موجود تھے۔ زیادہ تر عورتیں تھیں لیکن دو دھڑوں میں تقسیم۔ ایک دھڑا چیختی چلاتی چنگھاڑتی غصے میں بپھری منہ سے جھاگ اڑاتی بے قابو مادر پدر آزاد عورتوں کا تھا جو کسی مجذوب کی طرح میگا فون پکڑے چلا چلا کر پکار رہی تھیں۔۔ میرا جسم مرضی! یہ فیمی نسٹس تھیں۔ اپنا دن منا رہی تھیں۔ اس دھڑے کا ایک بہت بڑا پویلین تھا۔ اسی پویلین میں ایک بہت بڑا سٹیج سجا ہوا تھا جہاں کرسیوں کی ایک مختصر قطار پر تجربہ کار فیمینسٹس براجمان تھیں۔ ایک طرف کانوں میں بُندے کوکے ڈالے ایک عورت نمامرد تھا جسے عرف عام میں ڈی جے کہا جاتا تھا۔ اس سٹیج پر اگلے تین روز میں بہت کچھ ہونا تھا۔ یہ اجتماع آزادی تھا۔ آج کے دن عورت اس مقام پر ہر بندش سے آزاد تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کسی کے باپ میں یہ جرات نہ تھی کہ آج اسے روک لے۔ وہ فیمینسٹس کی تقاریر سے متاثر ہو کر پدر سری معاشرے کے مداری کی چھڑی کے خوف سے ڈگڈگی کے کہروے کی درت لے پر ناچنے والی بندریا کے بجائے ایک ہی جست میں چھلانگ لگا کر اپنے باپ کی آنکھیں نوچنے والی بندریا بن چکی تھی۔

پٹھان فلم کے گانوں پر لڑکیاں اور عورتیں بھونڈے انداز میں اچھل کود کر رہی تھیں۔ الٹے سیدھے ٹھمکے لگاتے جب یہ جسم کو ہلکا سا بھی خم دیتیں تو واقعی ثابت ہو جاتا کہ ان کے جسم پر آج ان کے لباس کی مرضی نہیں چلے گی! ایسا نہیں تھا کہ سب کے جسم تھرک رہے ہوں۔ رنڈی اگر ناچے پر تماش بین نہ ہوں تو اس کے نرت کی کیا اہمیت؟ دیکھنے والے، سننے والے، سمجھنے والے اور داد عیش۔۔ چاہے وہ واہ کی شکل میں ہو، آہ کی صورت میں ہو، تالی یا سیٹی کی حالت میں ہو یا بطور ویل، فنکار کے لئے حیات ہوتی ہے۔ جو کولہے نہیں مٹکا رہی تھیں جن کی چھاتیاں اتنی بڑی نہیں تھیں کہ ان پر داستان امیر حمزہ رقم کی جا سکے وہ گاؤ تکیے لگا کر شیشہ پیتے پیتے ناچتے تھرکتے جسم پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہی تھیں۔ حوا کی ان بیٹیوں کا شیشے سے شغل لکھنو کے نوابوں اور رُؤسا کی یاد دلا رہا تھا۔ جنہیں شیشے کا شغف نہ تھا وہ بئیر کا ایک کین کھولتیں، ایک ہی سانس میں چڑھاتیں اور گلہ پھاڑ پھاڑ کر چلاتیں: میرا جسم میری

مرضی۔ یہ کہتے کہتے ایک لڑکی تو جوش کے مارے اتنی بے اختیار ہو گئی کہ ساتھ کھڑے لڑکے کو مضبوطی سے بھینچ کر اسکے ساتھ سرعام بوس و کنار کرنا شروع ہو گئی۔ اسکی دیکھا دیکھی یہ کام دوسری لڑکیوں نے بھی شروع کر دیا۔ جن مستورات کو آس پاس کوئی لڑکا نظر نہ آیا وہ یہ سوچ کر کہ ہم اس کارِ خیر میں حصہ کیوں نہ ڈالیں آپس میں ہی شروع ہو گئیں۔ یہ "انقلابی" منظر دیکھ کر سائرہ جو سٹیج پر شبانہ اور ساروی کے ساتھ موجود تھی جوش میں آ کر کھڑی ہو کر مائک پر چڑھ کر پوری قوت سے چلائی: "تیرا باپ بھی دے گا آزادی!" یہ معلوم نہ تھا کہ کسے آزادی چاہیے، کس سے چاہیے اور کس چیز کی آزادی چاہیے!

'نہ جاؤ! رک جاؤ۔ میرے پاس ہی رہو!' غزالہ شہباز سے التجا کر رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں فلم "نور محل" کا گانا "میرے محبوب نہ جا۔۔۔ آج کی رات نہ جا۔ ہونے والی ہے سحر، تھوڑی دیر اور ٹھہر" بج رہا تھا۔ سمن کلیان پور کی آواز میں یہ گانا صورتحال کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔

شہباز غزالہ کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ چادر اٹھا کر بستر پر بیٹھ چکا تھا۔ پاؤں اس کے فرش پر تھے۔ غزالہ چادر کے اندر تھی۔ چادر کی ناہمواری صاف بتا رہی تھی کہ اس نے نائٹی تک زیب تن نہیں کی۔ اور بھید کھل بھی گیا جب شہباز کو اپنے سے دور ہوتا دیکھ کر اس نے چادر سے ایک ہی جھٹکے میں مکمل آزادی حاصل کر لی۔ شہباز ساری رات اس کی آغوش میں بتا چکا تھا۔ اسکی صرف ایک نگاہ غزالہ پر پڑی۔ اسے ایسا لگا یہ عورت اس کے لئے مکمل طور پر اجنبی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے اس کے حسن کو ابھی تک نظر بھر کر دیکھا تک نہ تھا۔ اس کا دل چاہ کہ وہ رک جائے۔ مگر جانا ضروری تھا۔ آج عورت مارچ تھا۔ جب اس نے فون پر نظر ڈالی تو احساس ہوا وہ لیٹ ہو چکا تھا۔ اسکا فون خاموشی پر تھا۔ رابعہ اسے تین بار کال کرنے کے بعد ایک ایس ایم ایس اور ایک واٹس ایپ میسج کر چکی تھی۔ جملہ ایک ہی تھا: "تم کہاں ہو؟ جلدی پہنچو!" اس سے پہلے وہ چوتھی کال کرے، شہباز فون کو مکمل بند کر چکا تھا۔

'مجھے جانا پڑے گا ڈارلنگ! عورت مارچ پر ہم بہت کچھ کر چکے ہیں۔ یہ سمجھو آج ہم فائنل کھیلیں گے۔ کیا کبھی فائنل میچ بھی چھوڑا جا سکتا ہے؟' شہباز نے کہا۔

'پلیز مت جاؤ ورنہ میں تمہیں کھو بیٹھوں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!' شہباز کھڑا ہوا۔ غزالہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ چکی تھی۔ وہ سر اٹھائے اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ غزالہ کا سر ایک بار پھر اٹھا ہوا تھا اور اسکا جھکا ہوا! شہباز نے اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑا کیا۔ وہ

کھڑے ہوتے ہی شہباز سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ شہباز اس کے آنسوؤں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔

'تم کیوں روک رہی ہو مجھے؟'

'میں نے تمہیں ایک بات بتائی تھی ایک بار۔ یاد کرو اگر یاد ہے تو تمہیں جواب مل جائے گا۔ تمہیں بہت غرور ہے نہ اپنی یادداشت پر!' غزالہ نے اس پر اپنی گرفت ڈھیلی کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ شہباز نے غزالہ کو اسکی نائٹی اپنے ہاتھوں سے پہنائی۔ یہ وہی کالی نائٹی تھی جس میں اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اگر غزالہ کی بات سچ نکلی تو اس کا مطلب یہ کہ وہ اسے آخری بار دیکھ رہا تھا۔ پہلا اور آخری جلوہ۔۔اسی کالی نائٹی میں۔۔ عجب اتفاق ہو گا۔

'مجھے یاد ہے! تم نے کہا تھا کہ تمہاری تیسری آنکھ بہت جلد بیدار ہو چکی تھی۔ کیا دیکھ رہی ہے یہ اس وقت؟'

'جو دیکھ رہی ہے وہ بہت ہی خوفناک ہے۔ میں اسے دہرانا تک نہیں چاہتی۔ شہباز میں نماز پڑھنا چاہتی ہوں۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں شاور لے کر ابھی آئی۔ تم بھی نماز پڑھ لو۔ شاور لے لو افضال کے کمرے والے باتھ روم میں۔ میں نیچے لاؤنج میں تمہارا انتظار کرونگی۔' یہ کہہ کر غزالہ تیزی سے باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ شہباز اسے حیرت سے تکتا رہ گیا۔ اس کے حسن کا جلوہ ہر ساعت رنگ بدلا کرتا تھا۔

وہ پکا مسلمان تھا۔ مذہبی گھرانے سے تھا۔ روزے رکھتا تھا مگر نماز شاذونادر ہی پڑھتا۔ لیکن اس بار اس کا بھی جی چاہا کہ رب کو یاد کرے۔ غالباً پانچ برس بعد وہ دوبارہ مصلے پر کھڑا ہو گا۔ یہ سوچ کر وہ افضال کے کمرے میں چلا گیا۔

عورتوں کے دوسرے دھڑے کی قیادت مولانا ابدالی اور اسکی دونوں بیٹیوں کے ہاتھ میں تھی۔ عائشہ ان کی اتحادی تھی۔ انکے پاس کوئی بینڈ باجا نہ تھا۔ سیدھا سادا سٹیج تھا عام سا ایمپلی فائر اور سپیکر۔ انکے نعرہ تھا "ہمارا مقصد اور ہماری زندگی"۔ ابدالی کی بیٹیوں نے ایک وین میں موبائل کلینک کا اہتمام کر رہا تھا۔ دونوں اس دن بھی مریضوں کا معائنہ کر رہی تھیں۔ مفت دوائیں بانٹ رہی تھیں۔ مریضوں کے لئے ڈرپ کا بھی انتظام تھا۔ ابدالی بھی وہیں تھا۔ رابعہ کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ تیزی سے پویلین سے باہر نکلا۔ اسکے سر پر دست شفقت پھیرا اور پوچھا کہ شہباز کہاں تھا۔

'اس کا فون بند ہے۔ رات بھر کام کرتا ہے۔ دیر سے ہی اٹھتا ہے۔ آ جائے گا۔ میرا تو سر چکرا رہا ہے یہ خرافات سن اور دیکھ کر۔ آپ کیسے برداشت کر رہے ہیں؟' رابعہ نے مایوسانہ انداز میں پوچھا۔

'اسے ہی عفو و درگذر کہتے ہیں جو مغرب دیکھنے سے قاصر ہے۔ اور جو ہمارا میڈیا دیکھنے اور دکھانے سے ڈرتا ہے۔ ہمیں تو داڑھی اور ٹوپی کی وجہ سے دہشت گرد قرار دیا جا چکا ہے۔ اب آپ خود دیکھ لیجئے یہ سب بے ہودگی اپنی آنکھوں سے۔ آپ بھی مغرب میں رہیں۔ میں بھی رہا ہوں۔ میں نے تو ایسی بے حیائی وہاں بھی نہیں دیکھی! ہمارا نظم و ضبط دیکھیے اور پھر انہیں دیکھیے۔' ابدالی نے کہا۔

اس اثناء میں ان کے پاس سے ایک جنازہ گذرا۔ کفن میں لپٹا ہوا کوئی مردہ۔ لیکن جنازے کو کندھا کوئی مرد نہیں عورتیں دے رہی تھیں۔ یہ جنازہ چارپائی پر تھا۔ اگلا ایک پایہ ساروی نے پکڑ رکھا تھا۔

ابدالی اور رابعہ تیزی سے جنازے کی جانب بڑھے۔۔ یہ سوچ کر کہ شاید کوئی عورت مارچ کے دوران اللہ کو پیاری ہو چکی ہو۔ رابعہ جنازے کے پاس ابدالی سے پہلے پہنچی۔

'کیا ہوا؟ کس کا جنازہ ہے یہ؟ خیر تو ہے نا؟'

'ہیلو رابعہ۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ پدرشاہی نظام کا جنازہ ہے۔ ذرا دھوم سے نکلے! تم اس کی نماز جنازہ پڑھانا پسند کرو گی؟ اس کی تدفین اسی میدان میں ہو گی۔ ہم عورتوں نے خود اس کی قبر کھودی ہے اور بہت گہری کھودی ہے۔ اسکا کتبہ بھی تیار کیا ہے۔ آ جاؤ شاباش۔ تم ہم میں سے ہو۔ ان مولیوں میں سے نہیں!' ساروی نے استہزایہ انداز میں ایک نظر ابدالی اور دوسری رابعہ پر ڈالتے کہا۔

'استغفر اللہ!' بیک وقت رابعہ اور ابدالی کے منہ سے نکلا۔

شہباز لاؤنج میں پہنچا تو غزالہ نماز پڑھ رہی تھی۔ کالے رنگ کی شلوار قمیض اور دوپٹے میں آج اس کے حسن کا یہ جلوہ اپنی مثال آپ تھا۔ اب تک اس کے بے پناہ حسن کے جتنے بھی جلوے اس کی نظروں سے گذرے ان میں سب سے زیادہ خوبصورت یہ ہی تھا۔ اسے ایسا لگا وہ شام غریباں کے لئے تیار ہوئی تھی۔ اس نے سلام پھیرا۔ سر اوپر اٹھا کر چھت کو ایسے دیکھا جیسے اسے آسماں نظر آ رہا ہو۔ ہاتھ اٹھا کر وہ دعا مانگ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھی اور ایک امام ضامن شہباز کے دائیں بازو پر باندھ دیا۔

'جانے سے پہلے مجھ سے شادی کرتے جاؤ شہباز۔ میں رب کا سامنا تمہاری شریک حیات کی حیثیت سے کرنا چاہتی ہوں۔'غزالہ نے انتہائی سنجیدگی اور خلوص سے یہ جملہ بولا۔

'لیکن اس وقت کہاں سے نکاح خواں اور گواہ ڈھونڈ کے لاؤنگا؟ آکر کر لونگا تم سے نکاح!'شہباز مسکراتے ہوئے بولا۔

'نکاح کے لئے صرف ایجاب و قبول کافی ہے۔ گواہ رب سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے؟ تمہارے بٹوے میں کتنے پیسے ہیں اسوقت؟غزالہ نے پوچھا۔

'زیادہ نہیں۔ پے منٹس تو کریڈٹ کارڈ سے کرتا ہوں۔ دو تین ہزار تو ہونگے ہی۔ دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔ہاں ہزار کے دو نوٹ ہیں۔ کچھ چھوٹے نوٹ ہیں۔'شہباز بولا۔

'بس ایک دس روپے کا نوٹ مجھے دے دو۔ یہ میرا حق مہر ہو گا جو تم ادا کر چکے ہو گے۔' غزالہ نے کہا۔ شہباز نے یہ فرمائش بھی پوری کر دی۔

'اب جاؤ میرے مجازی خدا۔ تمہاری بیوی تمہاری راہ تکے گی۔ اور تم سے وعدہ کرتی ہے کہ اس لمحے کے بعد کوئی اور اس کا آنچل بھی نہ دیکھ پائے گا۔ اور ایک سچ بھی بولنا چاہتی ہے۔ شاید تم یقین کرو یا نہ کرو!'غزالہ اب کھوئی کھوئی نظروں سے اسے تکتے یہ باتیں کر رہی تھی۔

'مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے۔ بتاؤ!'

'جس دن ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔۔۔'غزالہ رک گئی۔

'ہاں۔۔۔۔ پھر؟'

'اس وقت سے اس لمحے تک میں۔۔۔'وہ پھر رک گئی۔

'اس لمحے تک کیا؟'شہباز نے پوچھا۔

'اس گھڑی سے لے کر اس گھڑی تک میں کسی اور مرد کے پاس نہیں گئی۔ نہ میرے پاس کوئی آیا۔ میں نے اسی دن اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملا دے!' غزالہ یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ محسوس کرنے کے لئے کہ وہ اس کی بات پر یقین کر رہا ہے یا نہیں۔

'افضال یا تمہارے شوہر نے خواہش ظاہر نہ کی اس عرصے میں؟'شہباز حیران تھا۔ اس لئے اس نے پوچھا۔

'ایک نہیں کئی بار۔ لیکن میرے پاس کوئی نہیں آسکتا اگر میں نہ چاہوں۔ میں نے نہیں آنے دیا۔ انہوں نے زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے روک دیا۔ یہ ہی سچ ہے شہباز۔ مجھے میرے دونوں بیٹوں کی قسم۔ اس امام ضامن کی قسم۔ پنجتن پاک کی قسم۔ میں نہیں گئی کہیں بھی۔ نہ کوئی میرے پاس آیا۔ اور اب مرتے دم تک ایسا ہی ہو گا۔ ایک بات اور

کہنی ہے تم سے۔۔۔ لیکن چھوڑو۔ تمہیں میری پہلی والی بات پر ہی یقین نہیں آیا۔ دوسری بات کرنے کا کیا فائدہ جو پہلی والی بات سے بھی بہت بڑی ہے۔۔۔'غزالہ نے افسردگی سے سر جھکاتے کہا۔

'نہیں ڈارلنگ تم غلط سوچ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے تمہاری پہلی بات پر۔ اور تم بھی یقین کرو کہ تمہارے بعد میں بھی کسی کے پاس نہیں گیا۔ نہ کوئی میرے پاس آیا۔ تمہارے بعد جب بھی میں نے کسی عورت پر نظر ڈالی، مجھے ایسا لگا میں نامرد ہو چکا ہوں۔ لیکن جب جب تم پر اک نگاہ پڑی مجھے اپنے اندر اک بپھرا ہوا سمندر محسوس ہوا جسے تم سے ہی سکون ملا۔' شہباز نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے کہا۔

'مجھے معلوم ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔۔۔'

'دوسری بات کیا ہے غزالہ؟'

'دوسری بات خوشی کی بات ہے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں!' یہ کہتے غزالہ مسکرائی۔

'سچ!'شہباز نے پرجوش انداز میں کہا۔

'سو فیصد سچ۔ اسی لئے تو میں نے تم سے آج نکاح کیا۔ آج تیسرا مہینہ چل رہا ہے!'

'الحمد اللہ! میں واپس آجاؤں پھر جشن منائیں گے۔'شہباز کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

'انشااللہ! اب تم جاؤ۔ میں اپنے بیٹوں کو جگاتی ہوں۔' غزالہ نے کہا۔ اسکے دونوں بیٹے ابھی تک سو رہے تھے۔ شہباز غزالہ کا ماتھا چوما اور یہ کہہ کر چلا گیا:'وہ میرے بیٹے بھی ہیں!'

'السلام علیکم رابعہ! بہت خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔ شہباز صاحب نہیں آئے؟' عائشہ نے پوچھا۔

'وعلیکم السلام عائشہ۔ ارے بھئی صحافی کبھی صبح سویرے نہیں اٹھ سکتا!'رابعہ نے کہا۔

'تم کیوں اٹھ گئیں؟'

'میں خاتون صحافی ہوں!'رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

'تم پر مساجنی کا الزام لگ سکتا ہے۔ ذرا احتیاط سے!'عائشہ نے بھی مذاق کرتے کہا۔

'آؤ ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ دیکھیں تو کیا کیا "نمونے" موجود ہیں یہاں پر؟ لو جی وہ آ گئے۔ صحافی صاحب۔ بڑی عمر ہے بھئی! رابعہ نے جیسے ہی بات مکمل کی، اچانک شہباز وارد ہو گیا۔

'آئی ایم سوری۔ لیٹ ہو گیا۔ کچھ خاص چیز دیکھنے سے قاصر تو نہیں رہا میں؟'

'بھئی تم ایک جنازے میں شرکت نہ کر سکے۔ اور اب تک تو میت کو دفنا بھی دیا ہو گا!' رابعہ نے کہا اور اسے پس منظر سے آگاہ کیا۔

'ان فیمی نازیوں کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔۔' شہباز بولا۔

'تم بھی فیمی نازی کہنے لگے فیمی نسٹس کو۔ یو آر اے مساجنسٹ شہباز!' رابعہ نے قہقہہ لگاتے کہا۔

'اگر ایسا ہے تو مجھے مساجنسٹ ہونے پر فخر ہے!' شہباز کی بات سن کر دونوں خواتین مسکرا دیں۔

'چلو شبانہ کے پویلین میں چلتے ہیں۔۔۔' عائشہ نے کہا۔ تینوں اس جانب بڑھے۔ وہاں پہنچے تو ایک کیٹ واک ہو رہی تھی۔ سات آٹھ حاملہ لڑکیاں تھیں جن کا حمل آخری مرحلے میں تھا۔ سب کے پاجامے ناف کے نیچے سے گھٹنوں تک بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ پیٹ مکمل برہنہ تھا۔ چھاتیوں پر مختصر سا سلیو لیس بلاؤز تھا۔

پھولے ہوئے پیٹوں پر لپ اسٹک سے نعرے لکھے ہوئے تھے۔۔ حاملہ پیٹ کو چھپاؤ مت بلکہ فخر سے دکھاؤ۔ زچگی گناہ نہیں جو چھپایا جائے۔ حمل میں بھی حسن ہے۔ میرا پیٹ میری مرضی۔ میرا حمل میری مرضی۔

'ماشااللہ! ان خواتین نے تو کرینہ کپور کی گلابی زچگی والے لباس میں فوٹو سیشن کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔۔' رابعہ نے تبصرہ کرتے کہا۔

بالکل درست کہا تم نے!' عائشہ نے رابعہ کی بات کی تائید کی۔

'اب سائنس کا دور ہے۔ الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چل سکتا ہے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ہے یا نہیں۔ تین ماہ کی قید عدت پدر شاہی نظام کی بدصورت یاد ہے۔ اسے ختم کیا جائے۔ اور اب ڈی این اے سے پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ بچہ کس مرد کا ہے۔ لہذا عورت کو بھی مردوں کی طرح ایک وقت میں چار چار شوہر رکھنے کی اجازت دو!' یہ تقریر ساروی سرمست کر رہی تھی۔

'ساروی سرمست شرم کرو۔ اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دو۔ تمہیں تو ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوا اور باتیں چار کی کرتی ہو۔' یہ جملہ ایک خاتون صحافی کی طرف سے آیا۔ ساروی اسے جانتی تھی۔

'یہ ہمارا پروگرام ہے۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو یہاں سے نکل جاؤ۔ گارڈز اسے باہر نکالو۔' ساروی کے کہنے کی دیر تھی۔ گارڈز اسے پویلین سے باہر نکال چکے تھے۔

'اب اگلا آئٹم پدر سری کے حوالے سے ہے۔ پیش کرنے والوں کو دل کھول کر داد دیجئے گا!'ساروی نے اعلان کیا۔ سات آٹھ بچیاں ہاتھوں میں کتے لئے باری باری سٹیج پر نمودار ہو کر گذر گئیں۔ یہ بھی ایک کیٹ واک ہی تھی۔ کتوں کے گلوں میں پٹے تھے جن سے مختلف ناموں کی تختیاں لٹک رہی تھیں۔ زنجیر بچیوں کے ہاتھ میں تھی۔۔ کسی کتے کے گلے میں باپ، کسی کے بھائی، سسر، شوہر، تایا، ماموں یا چچا نام کی تختی لٹک رہی تھی۔

'آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں سر کتا بن کر؟'رابعہ نے ایک معزز شخص سے پوچھا جسے وہ جانتی تھی۔ کتے کو کیٹ واک کرانے والوں میں ایک بچی اس کی بیٹی تھی۔

'کم آن رابعہ! میں تمہارے فادر کا دوست ہوں۔۔ میری بیٹی مجھے کتا نہیں کہہ رہی۔ یہ علامتی واک ہے۔ کتا پدر سری نظام کو کہا جارہا ہے۔ لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے!' یہ شخص کچھ دیر بعد واقعی اپنی بیٹی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔

'یہ شلواریں کس کی ہیں؟' شہباز نے چند خون آلود پھٹی ہوئی شلواریں ایک سٹال کے سامنے لٹکتی دیکھ کر عائشہ سے پوچھا۔

'فیمینسٹس کی نظر میں یہ ان بچوں، بچیوں اور عورتوں کی ہیں جن کا ریپ مولوی صاحبان کرتے ہیں!'اس نے جواب دیا۔

'لاحول ولا قوۃ۔ انتہا ہے بے ہودگی کی! اچھا اب آپ بھی فیمی نازی والی اصطلاح استعمال کرنے لگ گئیں؟'رابعہ نے عائشہ کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے کہا۔

'انکی حرکتوں کو یہ ہی عنوان سوٹ کرتا ہے۔۔۔'عائشہ نے کہا۔

'بات تو درست ہے!'رابعہ بولی۔

'بیٹا آپ کو کس چیز کی آزادی چاہیے؟'رابعہ نے ایک سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سے پوچھا جس نے ایک پلے کارڈ۔۔ ہم کیا مانگیں؟ آزادی! اٹھا رکھا تھا۔

'مجھے تو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ میں تو اپنی میڈ کے بی ہاف پر آزادی مانگنے آئی ہوں۔ اس کا باپ اسے اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے نہیں دیتا۔ ویسے میرے ماما پاپا بہت لبرل ہیں۔ ہر ویک اینڈ پر میرا بوائے فرینڈ مجھ سے ملنے آتا ہے۔ میرے بھائی کا گہرا دوست ہے۔ سب گھر والے ٹونی کو۔۔ یعنی میرے بوائے فرینڈ کو بہت پسند کرتے ہیں!' لڑکی نے فخر سے کہا۔

'شاباش بیٹا۔ کیری آن!' شہباز نے کہا۔ تینوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کیا وہ مارچ میں ہیں یا کسی پاگل خانے میں!

'وہ دیکھو۔ ادھر چلتے ہیں۔' شہباز بولا۔ تینوں وہاں پہنچے۔ سادہ دیہاتی عورتیں تھیں۔ ان کے پلے کارڈز پر لکھا تھا۔۔ ایک گھنٹہ لیٹ۔ سزا ایک دن کی مزدوری کی کٹوتی!

'تم کون ہو؟' رابعہ نے ایک عورت سے پوچھا۔

'ہم امیر لوگوں کے گھریلو ملازم ہیں۔ اگر ہم ایک گھنٹہ لیٹ ہوں تو بیگم صاحبہ پورے دن کی تنخواہ کاٹ لیتی ہیں۔ گندی گندی گالیاں بھی دیتی ہیں۔' یہ کہتے اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسری عورت نے "تنخواہ تو وقت پر دیا کرو" نامی پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساروی کی نوکرانی ہے۔ تنخواہ دو دو مہینے لیٹ کرتی ہے ساروی۔ ایک روٹی سے زیادہ نہیں کھانے دیتی اسے۔ کوئی چھٹی نہیں دیتی۔ بات بات پر اس کے ماں باپ کو گالیاں دیتی ہے۔

'تم نے غور کیا فیمی نازیوں کے پویلین میں ایک بھی ایسا پلے کارڈ نہیں جس پر یہ رقم ہو کہ گھریلو ملازموں پر تشدد بند کرو۔ گھریلو ملازم بھی انسان ہیں۔۔ وغیرہ وغیرہ۔' رابعہ نے شہباز سے کہا۔

'ہاں میں نے یہ پوائنٹ نوٹ کر لیا ہے۔ اسے خاص طور پر اٹھاؤں گا رپورٹ میں۔۔'

'واہ۔۔ کیا بات ہے! آپ اس وقت اپنی عمر سے بیس برس چھوٹی لگ رہی ہیں۔ بوبی نہیں اٹھا ابھی تک؟ میں ناشتہ بنانے لگی تھی۔۔۔' افسانے نے رانی سے پوچھا جو ابھی ابھی نائٹی میں بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ افسانے صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

'یہ ہی وہ راز ہے جسے تو اس دن بار بار کرید رہی تھی۔ اندازے لگا رہی تھی۔ لیکن پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن آدھا راز ہے۔۔ پورا نہیں!' رانی نے آنکھ مارتے کہا۔ سفید نائٹی میں رانی کے بدن کی ہر شے کھل رہی تھی۔ خوبصورتی کا ہر زاویہ دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ رانی کا ایک شوق گھر میں کپڑوں کے بغیر پھرنے کا بھی تھا۔ بقول اس کے یہ مثبت سوچ رکھنے کے لئے ایک مفید ٹوٹکا تھا۔ افسانے یہ ٹوٹکہ اپنے گھر پر تو نہیں آزما سکتی تھی۔ لیکن جب جب رانی کے گھر پر قیام کرتی ضرور آزماتی اور اسے اس کی آفاقیت اور افادیت دونوں پر بھروسہ ہوتا جا رہا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے افسانے اور بوبی رانی کے مہمان تھے۔ عورت مارچ کی وجہ سے کام زیادہ تھا۔ اس لئے اسے رانی کے گھر پر ہی رکنا پڑا۔ بوبی کو بھی اس نے یہیں بلا لیا تھا۔ وہ رات کو افسانے کے بجائے رانی کے ساتھ سو گیا۔ رانی چونکہ اکیلی وارد ہوئی، لہٰذا افسانے اس سے پوچھ رہی تھی کہ بوبی اٹھا کہ نہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ ناشتہ سب اکٹھے کریں۔

'بوبی بچہ ہے اور بچوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ ابھی نہیں اٹھے گا۔ لیکن میں نے تو اسے کمرے میں دیکھا ہی نہیں۔ سوتے میں کہیں بیڈ سے گر نہ گیا ہو۔۔ ہو سکتا ہے کروٹیں بدلتے بیڈ کے نیچے گھس گیا ہو!' رانی بولی۔

'ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے لئے آدھا نہیں ابھی تک مکمل راز ہے۔ آپ کی عقل تک رسائی میرے لئے ناممکن ہے۔۔۔' افسانے بولی۔

'تو بہت ہی سادہ ہے! تو نے مجھے ہمیشہ یہ ہی کہا کہ میں اپنی عمر سے پندرہ برس کم نظر آتی ہوں۔ آج میں تجھے بیس برس کم کیوں نظر آئی؟ اس سے پہلے کیوں نہیں دکھائی دی؟' رانی بولی۔

'بوبی کی وجہ سے۔۔۔ درست؟' افسانے بولی۔

'شکر ہے درست جواب دیا تو نے!' رانی قہقہہ لگاتے بولی۔

'اور مشاہدہ ملاحظہ ہو۔۔ جو عورت اپنی عمر سے بیس سال کم نظر آئے اسکا مطلب وہ کسی کے تیرہ سالہ بھائی کے ساتھ سوتی ہے۔۔۔۔۔ ہے نا؟' افسانے اب شرارت کر رہی تھی۔

'تو بھی بہت حرافہ ہے میری طرح افسانے! ویسے جواب درست ہے تیرا۔' رانی جب ترنگ میں ہو تو لفظ 'حرافہ' کا گاہے بگاہے استعمال کرتی۔

'تو پھر میں بھی پچاس کی ہو کر تیس کی لگوں گی آپ کی طرح۔۔ درست یا غلط؟' افسانے نے پوچھا۔

'نہیں تو نہیں لگے گی۔ کیونکہ اس وقت بوبی تیس برس کا ہو چکا ہو گا۔۔۔ تیرہ کا نہیں رہے گا ساری عمر۔' رانی نے نفی کرتے کہا۔

'میں نے تو بوبی کا نام تک نہیں لیا۔ میں نے کہا۔۔۔ کسی کے تیرہ سالہ بھائی کے ساتھ!' افسانے پھر شرارتی انداز میں بولی۔

'اب تو مجھ سے بڑی حرافہ بن گئی ہے افسانے۔ شاباش!' رانی نے قہقہہ لگاتے کہا۔ پھر اپنی بات آگے بڑھاتے بولی: 'لیکن اور بھی چیزیں ساتھ ساتھ کرنا پڑیں گی۔۔ مثلاً ورزش، گرین ڈائٹ، کم کھانا، کم سونا۔ یوگا، پیراکی۔۔ اور میک اپ سے مکمل پرہیز۔ تو نے دیکھا مجھے کبھی چونا منہ پر ملتے؟'

'نہیں۔ آپ کے پاس تو اپنی ہی جڑی بوٹیوں کا خزانہ ہے۔ مجھے تو آپ کوئی وید لگتی ہیں۔ اللہ جانے کیا کیا چیزیں کچن میں پیسی جا رہی ہوتی ہیں۔' افسانے بولی۔

'یہ حقیقت چند لوگوں کے علم میں ہی ہو گی کہ جتنے میک اپ کے برانڈ ہیں سب تباہ کن ہیں۔ یوں سمجھ کہ نشے ہیں۔ ایک بار لگ جائے تو چھوٹتا نہیں۔ یہ سرمایہ داروں کی چال ہے زہر

فروخت کرنے کی۔ ہم یہ زہر شوق سے مہنگے داموں خریدتے ہیں۔ یہ کیمیکل جو میک اپ پراڈکٹس میں استعمال ہوتے ہیں انسان کی جلد اور جسم کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا حرامی پن دیکھ۔ یہ پردے کے خلاف کیوں ہیں؟ سوچا کبھی؟ رانی نے پوچھا۔

'پردہ کرنے سے چہرہ اور بال چھپ جاتے ہیں۔ کسی میک اپ اور شیمپو یا کنڈیشنز کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔'افسانے بولی۔

'درست کہا تونے۔ اب سوچ دنیا کی سب عورتیں پردہ کرنے لگ جائیں تو یہ امیر سرمایہ دار بھوکے مر جائیں۔ لیکن یہ اتنے چالاک نہیں جتنے ہم بے وقوف ہیں۔ ان حرامیوں نے ایک "حجاب شیمپو اینڈ کنڈیشنر" متعارف کروادیا یہ کہہ کر کہ جی سارا دن بال ڈھکے ہونے کی وجہ سے سوکھ جاتے ہیں۔ یہ خاص برانڈ حجاب میں لپٹے بالوں کے لئے ہے۔ اور ہم نرے احمق۔ دھڑا دھڑ خریدنے لگ گئے۔ ایک اور بات۔۔ مغرب میں اتنی سردی ہوتی ہے۔ مرد اوور کوٹ پہن کر پھرتے ہیں مگر عورت سکرٹ میں ننگی ٹانگوں پھرتی ہے۔ ٹانگیں ننگی رکھنے کا کلچر پیدا اور پروان ہی اسی لئے چڑھایا گیا کہ سکرٹس، سٹاکنگز اور ویکسنگ جیسی پراڈکٹس عورتوں پر نشے کی طرح مسلط کر دی جائیں۔'رانی بولی۔

'لیکن رانی ویکسنگ تو آپ بھی کرتی ہیں گو کہ آپ سکرٹ نہیں پہنتیں۔۔۔'

'ہاں لیکن پورے بدن کی ویکسنگ نہیں کرتی میں! صرف لیگز کی کرتی ہوں۔ باقی چیزیں میری قدرتی ہیں۔ او تو بھی قدرتی رکھا کر۔ یہ خدائی حسن ادھ موا کر دیتا ہے مرد کو۔ میکس تو مرتا ہے میرے بالوں پر۔ گھنٹوں ان کی پوجا کرتا ہے!'رانی آنکھ مار کر بولی۔

'ہاں مجھے بھی اس جگہ بہت الجھن ہوتی ہے ویکسنگ سے۔ لیکن ماں کا کہنا ہے انہیں رکھنا گناہ ہے۔۔۔'افسانے بولی۔

' اور جو تیری ماں اس دن کھوڑو کے ساتھ کر رہی تھی۔۔ وہ تو بہت ہی ثواب کا کام تھا۔۔'رانی بولی اور افسانے سوچ میں پڑ گئی۔ بات کو بدلنے کے لئے اس نے ایک اور سوال داغا:

'بوبی کیسا لگا۔۔ مزہ آیا بے بی ہارس پر سواری کا؟'

'کمال کا بے بی ہارس ہے بھئی۔ کہیں کہیں منہ زور گھوڑا بھی لگ رہا تھا۔۔ عدیل کی طرح! تجھے نہیں لگا ایسا؟ آج ٹرائی کریو!'اب رانی چسکے لے رہی تھی۔

'رانی اب میں کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت ہی سادہ ہیں!'افسانے چوٹ کرتے بولی۔

'بھئی ہم تو بچوں سے بھی سیکھ لیتے ہیں۔ بتاؤ بھئی بتاؤ ہم کو ہماری سادگی کا قصہ۔۔۔ لوگوں نے تو ہمیں مکار، عیار، شاطر، کٹنی اور نہ جانے کیا کیا مشہور کر رکھا ہے۔

ہماری تو آرزو ہی رہی کہ کوئی ہمیں بھی سادگی کے لقب سے پکارے!' رانی اب کسی سیاستدان کی طرح بات کر رہی تھی۔

'آپ کو تو ببی پر سواری کر کے میٹھی نیند آ گئی۔ مگر اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ اسے میرے ساتھ ہی نیند آتی ہے۔ اس لئے وہ میرے پاس آ گیا۔ ورنہ اسے میٹھی نیند ہر گز نہ آتی۔ جب وہ بیچ میں اٹھا تو میں نے اسے ضد کر کے آپ کے روم میں بھیجا!' افسانے فاتحانہ انداز میں بولی۔

'بہت حرامی ہے یہ ببی بھی۔۔ کھوڑُو کی طرح۔ لیکن ہے بہت ہی پیارا اور معصوم۔ ذہانت بھی بے پناہ ہے۔' رانی بولی۔ افسانے یہ بات سن کر خوش ہوئی۔ لفظ "حرامی" یہاں بطور خراج تحسین مستعمل تھا۔

'بہت بہت شکریہ رانی!'

'اچھا یہ بتا۔۔۔ تجھے نہیں لگا کہ منہ زور ہو رہا ہے؟' رانی نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

'جوں جوں بڑا ہو گا منہ زور ہی ہو گا۔ ساری عمر بے بی بارس ہی رہے گا کیا؟ ویسے مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسا آپ کو لگا۔' افسانے بولی۔

'میرے ساتھ رہے گا تو ایک ہفتے میں مکمل منہ زور ہو جائے گا۔۔۔' رانی نے پھر قہقہہ بلند کیا۔

'اچھا آپ نے یہ نہیں بتایا کہ جلد کو تر و تازہ اور جوان کیسے رکھا جاتا ہے؟ آپکے چہرے پر کوئی جھری نہیں۔ نہ آنکھوں کے حلقوں پر۔ نہ پپوٹوں پر۔ یہ تو معجزہ ہے۔۔۔' افسانے یہ سوال رانی سے کئی بار پوچھ چکی تھی۔ وہ ہر بار ٹال جاتی۔

'اس کا راز تجھے فلم 'کیلی گولا' میں مل جائے گا۔ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔' رانی پھر شرارتی انداز میں بولی۔

'مجھے نہیں دیکھنی فلم! آپ سے سننا ہے۔ فلموں میں مبالغہ آرائی ہوتی ہے حقیقت نہیں۔۔۔' اس بار افسانے روٹھ کر بولی۔

'اچھا میری اماں بتاتی ہوں! تو جس مرضی کے ساتھ ہو بس بیڈ شیٹ پر کچھ ثبوت نہیں چھوڑنا۔ ورنہ بستر کا روپ نکھرتا رہے گا اور تیرا اجڑنا شروع ہو جائے گا۔ بس اسی پہیلی میں راز ہے۔ اب اگر تو عقلمند ہوئی تو مزید سوال نہیں کرے گی۔۔۔' رانی فلسفیانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

'میں بدھو نہیں۔ سمجھ میں آ گئی۔ میرے گھر کی بیڈ شیٹس بھی اجلی اجلی ہی رہتی ہیں۔ اور پھر بوبی نے آپ سے اپنی ملاقات کا مکمل حال مجھے رات کو ہی بتا دیا تھا۔' افسانے بولی۔

'ایک تو اس بوبی کے پیٹ میں کوئی بات ٹکتی ہی نہیں۔۔۔اسے سمجھا کہ پردہ رکھا کرے۔' رانی بولی۔

'سارے جہاں میں ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ صرف مجھے بتاتا ہے۔' افسانے بولی۔

'بہت حرامی ہے ابھی سے!' رانی پھر تعریفی انداز میں بولی۔

'اچھا بھئی ہمارا عورت مارچ زبردست جا رہا ہے۔ میں لائیو دیکھ رہی تھی فیس بک پر۔ کیا خیال ہے چلیں وہاں؟' افسانے کا دل کر رہا تھا کہ ناشتے کے بعد تینوں جائیں۔

'نہیں۔۔۔۔ایسی حماقت نہ کرنا۔ اسی میدان میں مخالف پارٹیاں بھی اپنے اپنے عنوان سے مارچ منا رہی ہیں۔ ایسے حالات میں تصادم کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنا کام کر دیا۔ ہر چیز آؤٹ سورس کر دی۔ اب ہمارا سب کنٹریکٹر جانے یا اس کے نیچے والے ٹھیکیدار۔ ہم نے ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں بیٹھنا۔ ورنہ ہمیں جاگنا پڑے گا اور یہ سوتے رہیں گے۔' رانی نے سنجیدگی سے بات کی وضاحت کی۔

'کیا کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے؟' افسانے فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔

'ہمیشہ ہوتی ہے۔ پچھلے سال پولیس نے ہی لاٹھی چارج کر دیا تھا۔ کئی عورتوں کے سر پھٹ گئے تھے۔ سرکاری جامعات میں تو آئے دن ایسا ہوتا ہے۔ کوئی لڑکی نظر آئی کسی لڑکے سے بات کرتی۔۔۔۔مولوی فوراً وارد ہو گئے لٹھ لے کر اور اگلے لمحے لڑکا لہولہان۔ اب ٹیکنالوجی موجود ہے۔ تو لائیو دیکھ سکتی ہے۔ ہمیں وہاں مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ناشتہ کر کے فارم ہاؤس چلتے ہیں۔ قریب ہی ایک جھیل ہے۔ وہاں میری ایک بوٹ بھی کھڑی ہے۔ بوبی اور تو بہت خوش ہونگے بوٹ کی سیر کر کے۔ میں آتی ہو شاور لے کر!' رانی یہ کہہ کر اپنے بیڈ روم کی جانب لوٹ گئی۔ بوبی اٹھ چکا تھا۔ اسے بیدار دیکھ کر رانی شاور کا ارادہ ترک کر چکی تھی!

شہباز میرے والد کی طبعیت ٹھیک نہیں۔ میں نے انہیں ہسپتال لے جانا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ باقی سٹالز تم دیکھ لینا۔ فیمی نازیوں کے پھکڑپن میں کچھ نیا نہیں۔ کر لو گے نہ ہینڈل اکیلے؟' رابعہ بولی۔

'لو بھئی اب ایک معروف فیمینسٹ بھی فیمینسٹس کو فیمی نازی کہنے لگ گئی!' عائشہ رابعہ کو آڑے ہاتھوں لیتے بولی۔

'ان نام نہاد عورتوں کے حقوق کی علمبر دار خواتین کے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ سب اصلی فیمینزم کے نام پر دھبہ ہیں۔ عورت کے نام پر دھبہ ہیں اور یہ سب اپنے ماں باپ کو۔۔ اپنے گھر والوں کو سر عام رسوا کر رہی ہیں۔' رابعہ نے طنز کا جواب سنجیدگی سے دیا۔

'میں دیکھ لونگا۔ تم فوراً انکل کے پاس پہنچو۔ میرا اسلام بھی کہنا۔' شہباز نے کہا اور رابعہ چلی گئی

۔

اب عائشہ اور شہباز اگلے سٹالز کی جانب بڑھتے مختلف پلے کارڈز پر نظر دوڑاتے جا رہے تھے۔

'یہ پلے کارڈ دیکھیے شہباز صاحب۔۔' عائشہ بولی۔

'دوپٹہ پسند ہے تو اپنی آنکھوں پر لے لو!' شہباز پلے کارڈ پڑھ کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

'بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟'

'جی میرا نام نساء ہے۔۔۔' لڑکی نے کہا جس کی عمر بمشکل بیس برس ہو گی۔

'ماشاللہ۔ کیا مطلب ہے نساء کا؟ میں پہلی بار سن رہا ہوں اتنا خوبصورت نام!' شہباز بولا۔

'آپ مسلمان ہیں؟' لڑکی نے شہباز سے پوچھا۔

'الحمد اللہ پکا مسلمان ہوں۔۔۔'

'آپ کو سورۃ نساء کا علم نہیں؟ قرآن مجید کی چوتھی سورۃ ہے۔ اسی سورۃ پر بابا نے میرا نام رکھا تھا۔' لڑکی نے فخر سے بتایا۔

'جیتی رہو بیٹی!' شہباز یہ کہہ کر آگے نکل گیا۔

'دیکھا آپ نے۔۔۔ کیا کیا تضادات ہیں۔۔۔' عائشہ بولی۔

'جی۔ اسلام نے اتنے حقوق دیے عورتوں کو۔۔ اس وقت جب یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر ان کے پلے کارڈ میں ایک بھی ایسا نہیں جس پر کوئی آیت عورتوں کے حوالے سے ہو۔' شہباز بولا۔

'او مائی گاڈ! عائشہ کچھ دیکھتے بولی۔ ایک سٹال تھا جس پر ایک بینر لٹکا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا: اسقاط حمل کی فری معلومات کے لئے ہم سے رابطہ کیجئے!

دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کی نظروں سے ایک دلچسپ پلے کارڈ گذرا جو ایک مرد کے ہاتھ میں تھا۔ اس پر لکھا تھا: اچار کی بوتل تو میرے بغیر کھول نہیں سکتیں، زندگی کیسے گذارو گی جان من؟

'بھئی اس بندے کو تو انعام ملنا چاہیے۔ اور اسکی جان من کو چاہیے کہ کھلا اچار خرید ا کرے!'شہباز بولا۔

'یہ ساروی کا چھوٹا بھائی ہے۔۔۔'عائشہ بولی۔

'فرعون کے گھر موسی!'شہباز نے فقرہ کسا۔

اب وہ ایک خیمے کے نزدیک پہنچ چکے تھے جہاں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب عورتیں موجود تھیں۔ جبری مشقت کے لئے ان خواتین کے پیاروں کو امراء کا طبقہ اٹھالے گیا تھا۔ ان کی کوئی خبر نہ تھی کہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جتنے بھی پلے کارڈز تھے ان پر ایک ہی مطالبہ تھا۔۔ ہمیں ہمارے پیارے واپس کر دو۔ اگر زندہ نہیں ہیں تو لاش کی صورت میں ہی کر دو! ان خواتین کے چہرے ہی پلے کارڈز تھے جہاں مظالم کی ان گنت داستانیں رقم تھیں۔ ان کی آنکھوں میں کوئی چمک کوئی رونق نہ تھی۔ کچھ تھا تو درد اور کرب۔

میرا جسم مرضی پر ایک قوالی شروع ہو چکی تھی۔ قوال بہت سر میں تھا۔ شہباز کے قدم اس کی آواز کا تعاقب کرنے لگے جو میرا جسم میری مرضی والے پویلین کے سٹیج پر اپنے فن کا جادو جگا رہا تھا۔ اچانک اس نے غزالہ کو دیکھا۔ وہ اسی شام غریباں والے سیاہ لباس میں اسکے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ شاید غزالہ مجھے سرپرائز دینا چاہتی ہو۔ اس لئے یہاں چلی آئی؟ شاید اسے میری یاد ستا رہی ہو؟ اس لئے یہاں چلی آئی۔ وہ صبح سے ہی میرے لئے فکر مند تھی۔ شاید میری خیریت کو یقین بنانے کے لئے آئی ہو؟ بہت پیار کرتی ہے مجھ سے۔ یہ کتنا حسین احساس ہے کہ کسی کو کوئی دل سے چاہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا غزالہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہجوم بہت تھا۔ کبھی کبھی غزالہ اس میں گم ہو جاتی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہو جاتی۔ غزالہ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ شہباز اور اس کے بیچ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ شہباز کے چلنے کی رفتار غزالہ سے دگنی تھی۔ چلتے چلتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان موجود فاصلہ کم ہونے کا نام تک نہ لے رہا تھا۔ یہ سوچ اسے حیراں و پریشاں کئے جا رہی تھی۔ اسکی پکار غزالہ تک باآسانی پہنچ سکتی تھی اگر میدان میں شور نہ ہوتا۔ ایک لمحے کے لئے میدان میں سکوت طاری ہوا۔ اس خاموشی کے سناٹے کا شہباز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ پوری قوت سے چلایا:'غزالہ!!!!!!

غزالہ نے اس کی پکار کا جواب دیا۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے مڑ کر شہباز کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شہباز بھیڑ میں اس سے بچھڑ چکا تھا۔ اور وہ اسکی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ وہ اسے مل چکا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اور یہ ہی انمول خوشی اسکی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ وہ مسکرائی۔

اس مسکراہٹ میں کائنات کی ہر خوشی پنہا تھی۔ اسی طرح مسکراتے وہ شہباز کی طرف دوڑے چلی آ رہی تھی۔ عین اسی لمحے ایک زوردار دھماکہ ہوا جس نے میدان میں موجود ہر شے کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ نیلا چمکدار آسمان گہرے سیاہ دھویں کی لپیٹ میں تھا۔ چار سو چیخ و پکار اور آہ و بُکا کا منظر تھا۔ ہر چیز خون آلود تھی۔ آس پاس لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ میدان میں انسانی اعضاء بکھرے ہوئے تھے۔ لوگ زخموں سے کراہ رہے تھے۔ شہباز زمین پر گرا ہوا تھا۔ ہوش میں تھا۔ زخمی تھا مگر معجزاتی طور پر بچ گیا تھا۔ امام ضامن اسکے بازو پر ہی موجود تھا۔ آہستہ آہستہ اسے صورت حال سمجھ میں آنا شروع ہوئی۔

جو ہوا وہ بم دھماکہ تھا۔ وطن عزیز میں ایسے پٹاخے جن میں سو دو سو انسان مر جائیں، تین چار سو کٹ کر زخمی ہو جائیں، معمول کی بات تھی۔ آئے روز ہو جایا کرتے تھے۔ حیرانی تب ہوتی جب ان کے رونما ہونے میں وقفہ آتا۔ جس دیس کی آبادی کروڑوں میں ہو، وسائل انتہائی محدود ہوں، غربت اور جہالت کا دور دورہ ہو، وہاں چند سو کا جان بحق ہونا ایسا ہی تھا جیسے چلتے پھرتے انسان انجانے میں کیڑے مکوڑے کو اپنے پیروں تلے روند دیں۔

بم میں موجود کیلیں، نٹ بولٹ، وغیرہ لگنے سے شہباز خون اور خاک آلود تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ کھڑا ہو چکا تھا۔ اسکی چال میں لنگ تھا۔ اسے صرف ایک ہی چیز کی فکر تھی۔۔ غزالہ! وہ کہیں نہ تھی۔ وہ اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے غزالہ کو آخری بار دیکھا تھا۔ بہت ساری لاشیں بکھری ہوئیں تھیں لیکن اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ دھماکہ اسے میلوں دور پھینک دے۔ پھر بھی اس نے اس کی تلاش میں میدان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس ہولناک سفر میں اس کی آنکھوں نے کئی دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے۔ ساروی کی لاش دیکھی جس نے کچھ دیر پہلے پدر سری نظام کو اپنے ہاتھوں سے دھوم دھام سے دفنایا تھا۔ اس جنازے کی امامت بھی اسی نے کی تھی۔ اس کو کندھا دینے، لحد میں اتارنے اور مٹی ڈالنے والی بھی عورتیں تھیں۔ لیکن ان سب عورتوں کے جنازے مردوں نے ہی پڑھانے تھے۔ تدفین بھی انہوں نے ہی کرنی تھی۔ صرف غسل کسی عورت نے دینا تھا۔ 'گڈ لک ساروی!' شہباز نے اسکی لاش پر افسوس ناک نظر ڈالتے کہا۔

ساروی کے بعد اسے ایک ننھی منی بچی کی لاش نظر آئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے اب اپنے دونوں بیٹوں کی فکر تھی۔۔ غزالہ کے بیٹے، اس کے بیٹے!' وہ گھر پر اکیلے ہونگے۔ کیسے سمجھاؤں گا انہیں کہ انکی ماں کے ساتھ کیا ہوا۔۔ وہ تو زندگی اور موت کے تصور سے بھی آشنا نہیں!' شہباز اس سوچ میں گم تھا کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ یہ عائشہ تھی۔ لہولہان مگر سالم۔ وہ بھی شہباز کی طرح معجزاتی طور پر بچ گئی تھی۔ اسکے دائیں بازو پر بھی

ایک امام ضامن تھا! 'کاش ایک امام ضامن غزالہ کے بازو پر بھی بندھا ہوتا۔' شہباز کے دل سے آہ نکلی۔ عائشہ شہباز سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہباز کو اپنی بہن کی یاد آ گئی۔ اس نے عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور دو جملے بولے: اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون۔ اِنَّااللہَ مَعَ الصَّابِرِینَ

میدان سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا بیٹھا۔ اس کی منزل غزالہ کا گھر تھا۔

'آپ خیریت سے تو ہیں نہ؟ کافی دیر سے آپ کا نمبر مصروف مل رہا تھا۔ آپ کا عملہ تو خیریت سے ہے؟' یہ الفاظ ابدالی کے تھے۔ بم دھماکے کے بعد وہ اپنے جاننے والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے جگہ جگہ فون کر رہا تھا۔

'میں اور افسانے تو خیریت سے ہیں۔ ہم تو گئے ہی نہیں۔ بری خبر ایک ہی ہے۔ ساروی بیچاری شہید ہو گئی۔ سائرہ اور شبانہ کا کوئی اتا پتہ نہیں۔۔۔' رانی نے ابدالی تشویش دور کرتے کہا۔

'اور صوفیہ اور شاہینہ؟' ابدالی نے پوچھا۔

'وہ بھی نہیں گئیں۔ ہم سب لائیو دیکھ رہے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا شام کو جائیں گے۔ بس اللہ نے بچا لیا۔ آپ سنائیے۔۔ میں نے آپکو اور آپکی دونوں بیٹیوں کو دیکھا تھا لائیو۔۔' رانی بولی۔

درحقیقت وہ ان تینوں کو مارچ میں دیکھ کر حیران تھی اور سوچ رہی تھی کہ ابدالی جیسا زیرک انسان کیسے اتنی بڑی حماقت کر سکتا تھا۔

'اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے سب خیریت سے ہیں۔ ہم کھانے کے لئے باہر نکلے اور چند منٹوں بعد یہ سانحہ ہو گیا۔۔۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون۔ اِنَّااللہَ مَعَ الصَّابِرِینَ۔' ابدالی بولا۔

'بہت رسک لیا آپ نے۔ رہ نہیں سکے آپ۔ چلیے بچت ہو گئی۔ آپ آ رہے ہیں آج رات؟' رانی نے پوچھا۔

'ہاں ہاں کیوں نہیں۔ افسانے آج بھی آپ ہی کی طرف ہے نا؟' ابدالی بولا۔

'ارے حضور وہ تو صبح سے دس بار پوچھ چکی ہے آپ کا! آپ ہی کے لئے رکی ہے آج! ورنہ اس کی اماں تو بڑا زور دے رہی تھی کہ تین روز ہو گئے بچی گھر نہیں آئی۔ خاندان میں ناک نہ کٹ جائے۔ اب تو بھیج دیں۔ میں نے بڑی مشکل سے رام کیا اسے۔ اب آ بھی جایئے

گا۔ ایک تو آپ کی میٹینگیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اور اگر آج بھی نہ آئے تو بہت بھاری جرمانہ عائد ہو گا!' رانی نے بھاؤ دیتے کہا۔

'حضور بندہ آپ کا بے دام غلام ہے۔ آج آئے گا اور سر کے بل چل کر آئے گا۔ اور جرمانے کی ہم نے کب پرواہ کی!' ابدالی بولا۔

'چلیے دیکھ لیتے ہیں۔ خداحافظ!' رانی نے فون کاٹا، افسانے کی طرف دیکھا، پھر کہا: حرامی!!!'

اگلے لمحے لاونج تینوں کے قہقوں سے گونج رہا تھا۔ بوبی بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ تینوں چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ یہ عام چھپن چھپائی نہ تھی۔ اس میں کسی کھلاڑی کا دوسرے سے کچھ چھپانہ تھا!

باب44

سراب سچے!

شہباز کی گاڑی غزالہ کے گھر کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ لوہے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا اور مشکل سے چلتا ہوا گیراج میں داخل ہوا۔ لان میں ایک بزرگ آدمی پودوں کی نلائی میں مصروف تھا۔ ایک خون آلود اجنبی کو اندر آتے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شہباز سے کچھ پوچھتا، شہباز چلاتے ہوئے بولا: مالی میاں۔۔ امان اور ایان کہاں ہیں؟ بیگم صاحبہ کا کوئی اتا پتہ نہیں۔۔۔ جلدی سے بچوں کو بلاؤ۔۔' شہباز ہانپ رہا تھا۔ یہ کہتے کہتے گر پڑا۔

'عبدل، شبے۔۔۔ کہاں مر گئے؟ جلدی ادھر آؤ!' بزرگ پوری قوت سے چلایا۔ اس کی آواز بھاری اور رعب دار تھی۔ جس انداز سے اس نے یہ دو نام پکارے، اس سے شہباز کو اس حالت میں بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مالی نہ تھا۔ اس کی پکار پر ادھیڑ عمر کے دو مرد جو شکل و حلیے سے نوکر دکھائی دیتے تھے دوڑے آئے۔

'انہیں جلدی سے لاؤنج میں بٹھاؤ۔ میں اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتا ہوں۔۔ ہری اپ!' بزرگ بولا۔

نہیں۔۔۔ غزالہ کہاں ہے؟ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ وقت نہیں ہے۔ جلدی سے بچوں کو لے کر آؤ!' شہباز دوبارہ قدموں پر کھڑتے ہوتا بولا۔

یہ سن کر نہ صرف بزرگ بلکہ عبدل اور شبہ بھی حیران ہوئے۔ دونوں پہلے شہباز پھر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا البتہ بزرگ آدمی بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ دھماکے کی خبر اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شہباز کی حالت دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ یہ شخص دھماکے میں زخمی ہونے والوں میں سے ایک تھا اور صدمے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔

'بیٹے تم ایک منٹ کے لئے اندر تو آؤ۔ پانی وانی پی لو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ تمہارے زخم صاف کر کے پٹی کر دوں پھر چلے جانا۔۔' بزرگ بولا۔ دونوں نوکر شہباز کی طرف بڑھے۔ اس نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے سے منع کر دیا۔

'میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے آپ لوگ؟ کہاں ہیں امان اور ایان اور غزالہ؟' شہباز بولا۔

'کون امان اور ایان بیٹا؟' بزرگ نے پوچھا۔ پھر کہا: 'اچھا اندر تو آ جاؤ۔ یوں ہی کھڑے کھڑے بات کرنا مناسب نہیں۔' یہ کہہ کر بزرگ نے شہباز کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا۔ ایک بزرگ کے ہاتھ کو جھٹکنے کی جرات وہ نہ کر سکا۔ وہ اسے پکڑ کر غزالہ کے لاؤنج تک لے آیا۔ اندر کا ماحول دیکھ کر شہباز کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ لاؤنج میں موجود ہر شے مختلف تھی۔ دیواروں پر قرآنی آیات بہترین خطاطی کی شکل میں جابجا آویزاں تھیں۔ فرنیچر بالکل مختلف تھا۔ یہ وہ لاؤنج ہی نہیں تھا جہاں کچھ دیر قبل غزالہ مصلے پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔

'امان اور ایان۔۔ غزالہ کے اور میرے دو بیٹے۔۔ ایک پانچ برس کا، دوسرا چار برس کا۔۔ اور کون؟' شہباز بزرگ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی پاگل دیوانہ ہو۔

'اور یہ پرانا فرنیچر کہاں گیا؟ یہ لاؤنج کا سارا نقشہ کس نے بدل دیا؟ میں چند گھنٹوں کے لئے باہر کیا گیا آپ لوگوں نے ہر شے ہی بدل دی۔۔۔ آپ کون ہیں؟ یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے تو آج تک آپ لوگوں کو اس گھر میں نہیں دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا یہ کیا ہو رہا ہے؟ بچے کہاں ہیں؟ غزالہ کس ٹائم گھر سے نکلی؟ کیا وہ مارچ میں اکیلی گئی تھی یا بچے بھی ساتھ تھے؟' شہباز ہر شے کو حیرت سے تکے جا رہا تھا۔

'بیٹا پہلے پانی پیو۔ پھر تمہارے ہر سوال کا جواب دونگا۔ یہ لو۔۔۔' بزرگ ایک گلاس شہباز کی جانب بڑھاتے بولا۔

شہباز نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے اپنے سوالات دہرائے۔

'بیٹا یہ میرا گھر ہے۔ میرا نام ڈاکٹر معین الدین ہے۔ میں ماہر نفسیات ہوں۔ اس وقت میری عمر ستر برس ہے۔ مجھے ریٹائرڈ ہوئے دس برس بیت چکے ہیں۔ میں اس گھر میں پچھلے چالیس برس سے مقیم ہوں۔ میرے یہ دونوں ملازم میرے ساتھ اسی گھر کے پچھواڑے میں موجود سرونٹ کوارٹرز میں گذشتہ بیس برس سے رہ رہے ہیں۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ میری آنکھوں کے سامنے رکھی گئی۔ اسے کبھی کرایے پر نہیں اٹھایا۔۔' ڈاکٹر معین یہ کہتے کھڑا ہوا۔ ایک الماری سے پرانی سی کتاب نکالی۔ اسے شہباز کے ہاتھ میں تھماتے بولا:

'یہ تیس برس پرانی ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے۔ اسکے صفحہ تین سو اکیس پر میرا نام اور اس گھر کا مکمل پتہ موجود ہے۔ پھر بھی یقین نہ آئے تو تم گلی کے ہر گھر پر دستک دے کر میرے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ اس گلی میں سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر یہ ہی تھا۔' شہباز کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس نے ڈائریکٹری کھولی۔ صفحہ دیکھا۔ بزرگ سچ کہہ رہا تھا۔

'لیکن ایسا کیسے ممکن ہے؟ کچھ دیر پہلے میں یہاں اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ اسی لاؤنج میں۔ ہمارے بیٹے اوپر کے کمرے میں سو رہے تھے۔ اس گھر کے پہلے فلور پر تین کمرے ہیں۔۔۔'شہباز کو کسی بھی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک کارڈ اس کی جانب بڑھایا۔

'یہ کیا ہے؟ یہ تو آپ کا شناختی کارڈ ہے۔۔۔اس پر یہ ہی پتہ موجود ہے۔ یہ کب ایشو ہوا تھا؟ ہاں لکھا ہوا ہے۔ دس برس پہلے! لیکن۔۔۔' ٹھہریے۔ ایک منٹ۔۔۔میں۔۔۔میری سچائی کا ثبوت آپ کے سامنے ہو گا۔' شہباز نے کہا۔ اس نے اپنی جیب ٹٹولی تو پتہ چلا اس کا موبائل اس کے پاس نہیں۔ 'میدان میں کہیں گر گیا ہو گا۔' وہ سوچ رہا تھا۔

'میرا فون۔۔۔گر گیا شاید۔۔کیا میں آپکے فون سے ایک کال کر سکتا ہوں؟' شہباز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس نے فوراً اپنا سمارٹ فون اس کے ہاتھ میں تھماتے کہا: 'اس سائز کے پلاٹ پر تعمیر شدہ ہر گھر کے فرسٹ فلور پر تین ہی کمرے ہوتے ہیں۔۔کم از کم۔ بہت سے چار بھی تعمیر کرتے ہیں۔

'میں آپ کے سامنے سپیکر آن کر کے اپنے دوست کو فون کروں گا۔ وہ میری بات کی تصدیق کرے گا۔' شہباز پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ڈاکٹر اب اس جوان میں دلچسپی لینا شروع ہو چکا تھا۔ نوکروں کو وہ پہلے ہی اشارے سے باہر نکال چکا تھا جو شہباز کے پیچھے کھڑے بار بار اسے ہاتھ کے اشارے سے یہ پیغام دیے جا رہے تھے یہ نووارد پاگل ہے۔ اس پر وقت ضائع نہ کیا جائے۔ ایسے پاگلوں کے سات وقت گذارنا ہی اس کا پیشہ تھا۔ اسے ان کا علاج کر کے دلی مسرت ہوا کرتی۔

'میں اس وقت آپکی دوست غزالہ کے گھر پر ہوں۔ یہاں ایک صاحب۔۔۔'

'کون غزالہ؟ میری تو ایسی کوئی دوست سرے سے ہے ہی نہیں؟' چوہدری نے شہباز کی بات کاٹتے کہا۔ شہباز سپیکر آن کر کے چوہدری سے بات کر رہا تھا۔

'بھئی وہ آپ نے مجھے ایک دفعہ رات گئے فون کیا تھا۔۔۔غزالہ کے شوہر نے اسے مارا پیٹا تھا۔۔۔غزالہ۔۔۔۔۔وہ جو آپ کی یونیورسٹی کلاس فیلو تھی۔۔۔'شہباز جھنجھلاتے بولا۔

'شہباز۔۔ آر یو آل رائٹ؟ یو ڈونٹ سیم ٹو بی! میری کلاس میں اس نام کی کوئی لڑکی تھی ہی نہیں! یار آج آٹھ مارچ ہے۔ فرسٹ آف اپریل بہت دور ہے۔ اور میں ڈیڈ لائن پر ہوں۔ بائے!' فون کٹنے کے بعد ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے شہباز کی جانب دیکھا۔

'ایک منٹ سر ایک منٹ۔ ایک فون اور۔۔۔۔۔۔ کر سکتا ہوں؟' شہباز نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔

'جتنے مرضی چاہو۔۔۔ کر لو۔۔۔ چائے پیو گے؟' ڈاکٹر نے کہا۔

'شکریہ۔ نہیں۔ چائے نہیں۔ میں اس فون کے بعد فوراً نکل جاؤنگا۔' شہباز بولا۔

'ہیلو میں غزالہ کے گھر سے بات کر رہا ہوں۔ آپکی دوست۔۔۔ افضال کی بیوی۔۔۔' شہباز فون سپیکر پر ڈالے نپولین سے بات کر رہا تھا۔

'کون غزالہ۔۔ کون افضال؟ میں تو کسی کو نہیں جانتا!' نپولین بولا۔

'یہ کیسے ممکن ہے؟ یاد نہیں میں اور غزالہ کچھ عرصے قبل ڈیزرٹ کافی ہاؤس میں تھے۔ وہ۔۔۔ اس دن۔۔۔ جب آپ کو بخار تھا۔۔۔ اس دن جب مینا نے مجھے وہ فضول سی ای میل کی بھی تھی۔۔ وہ جس پر میں نے۔۔۔۔ آپ اسی دن مینا کے ساتھ کافی پینے ڈیزرٹ کافی ہاؤس آئے تھے۔ آپ بہت گرمجوشی سے غزالہ سے ملے تھے۔ آپ نے اس سے افضال کا حال بھی پوچھا تھا۔۔۔ یاد آیا؟ غزالہ بھی آپ سے بہت گرمجوشی سے ملی تھی۔ اس نے آپ کو جلد ملنے کا بھی بولا تھا۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔۔۔' شہباز نپولین کو یاد کرانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

'شہباز۔۔۔۔۔۔ لگتا ہے تم نے رات کو بہت پی لی۔ اثر ابھی تک قائم ہے۔ تمہاری اطلاع کے لئے بتاتا چلوں کہ یہاں ڈیزرٹ کافی ہاؤس نامی کوئی کافی آوٹ لیٹ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یو آر بیڈلی ڈرنک مائی ڈیئر اور آج اپریل فول بھی نہیں۔ میرا فون آرہا ہے۔ ٹیک کیئر!' نپولین نے فون کاٹ دیا۔ شہباز کو ایسا لگا جیسے سب مل کر اسے اپریل فول منا رہے ہوں حالانکہ مہینہ مارچ کا تھا۔

'آئی ایم سوری سر۔ مجھے لگتا ہے میں غلط گھر میں آگیا۔ لیکن اس گھر میں تو میں کئی بار آچکا ہوں۔ فلور پلان تو بالکل وہی ہے۔ البتہ فرنیچر اور سجاوٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔۔' شہباز ڈاکٹر سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

'رکو بیٹے۔ معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے والد کی عمر کا ہوں۔ میں کیوں تم سے جھوٹ بولوں گا؟ تم غلط گھر میں نہیں آئے۔ درست جگہ پہنچے ہو۔ تمہیں شیزوفرینیا ہے۔ غزالہ، امان، ایان اور ڈیزرٹ کافی ہاؤس تمہارے دماغ یا تخیل کی اختراع ہے۔ میں گذشتہ چالیس برسوں میں نہ جانے کتنے شیزوفرینیا کے مریضوں کا کامیابی سے علاج کر چکا ہوں۔ یہ کوئی بیماری نہیں۔۔ محض دو قطبی اضطراب ہے۔ اس حالت میں مریض کو کسی شے یا انسان کی غیر موجودگی میں وہ شے یا انسان نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان یا شے کا وجود ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تمہارے کیس میں ان دو دوستوں کا وجود تھا جنہیں تم نے ابھی ابھی فون کیا۔ مگر تیسرا یا چوتھا درحقیقت وجود ہی نہیں رکھتا۔ مثلاً غزالہ، افضال، امان اور ایان۔ اس کیفیت میں تمہیں تنہائی میں ان لوگوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہونگی۔ اسے ہیلوسی نیشن کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مریض کو ڈیلیوزن بھی ہوتے ہیں۔ یعنی خیالات جن پر

اس کا مکمل یقین ہو لیکن ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ مریض کو اپنے خیال پر سو فیصد یقین ہوتا ہے لیکن دوسروں کے لئے یہ ہی خیال ناقابل یقین ہوتا ہے۔ تمہارے دوست نے درست کہا۔۔ یہاں کوئی ڈیزرٹ کافی ہاؤس نامی شاپ نہیں۔ میرا مشورہ ہے تم میرے پاس ہی رک جاؤ۔۔ کم از کم صبح تک۔ میں تماری مرہم پٹی کیے دیتا ہوں۔ خون اب بھی تمہارے زخموں سے رس رہا ہے۔ اگر تم نہیں راضی تو تمہاری مرضی! میں تمہارے لئے دعاگو رہوں گا۔ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لو۔ کام آئے گا!'ڈاکٹر اصلی صورت حال بیان کرتے بولا۔

'تھینک یو انکل۔ آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھا۔ مجھے شیزوفرینیا کا علم ہے۔ میں اتنا بے خبر نہیں۔ لکھاری ہوں۔ لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔ اگر میں مزید غلط ثابت ہوا تو خود چل کر آپ کے پاس آؤنگا۔ آپ کرینگے میرا علاج؟'شہباز بولا۔

'یقیناً مائی سن! بیسٹ آف لک!'ڈاکٹر نے کہا۔ اب شہباز کافی شاپ کی جانب جارہا تھا جو غزالہ کے گھر کے قریب ہی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ وہاں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن وہاں کافی شاپ نہیں ایک گفٹ شاپ تھی۔ وہ پھر سے پریشان ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ جگہ تو وہی تھی۔ اس کا حلیہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ شاپ کے اندر جاسکے۔ اس نے شاپ کا بورڈ پڑھنا شروع کیا تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعی شیزوفرینا کا مریض ہے۔ یہ شاپ دس برس پہلے یہاں قائم ہوئی۔ سن بورڈ پر درج تھا۔ اسنے گاڑی موڑی اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ اپاٹمنٹ کے استقبالیہ پر تھا۔

'سر یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔ میں ایمبولینس منگواتا ہوں۔۔۔' کلرک خون میں نہائے شہباز کو دیکھتے پریشانی سے بولا۔

'نہیں۔۔۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ تمہیں یاد ہے اس دن۔۔۔ جب مجھ سے ملنے یہاں ایک عورت آئی تھی۔ تم نے اس کی انٹری بھی کی تھی۔ اس کا نام غزالہ افضال تھا۔۔۔ یاد ہے نہ؟ رجسٹر نکال کر دیکھو۔'شہباز ایک ہی سانس میں سب باتیں کہہ گیا۔

'سر آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ رجسٹر کی ضرورت ہی نہیں۔ مجھے ایک ایک ملاقاتی کا نام اور شکل یاد رہتی ہے۔ سب کمپیوٹر میں درج ہے۔ چیک بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آپ جب سے یہاں آئے ہیں آج تک کوئی بھی آپ سے ملنے نہیں آیا۔' کلرک نے یہ کہہ کر شہباز کے شیزوفرینیا والے شک کو مزید مضبوط کر دیا۔

'ذرا کمپیوٹر میں نام ڈالو۔ غزالہ افضال۔ مختلف سپیلنگ ویری ایشنز سے۔۔۔'

'نہیں سر۔۔ ایسا کوئی نام ہے ہی نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ سے ملنے آج تک کوئی نہیں آیا۔ آپ کے ساتھ بھی کوئی نہیں آیا۔۔۔ سر خون بہہ رہا ہے۔ ایمبولینس باہر ہی

ہے۔۔ سر۔۔۔۔ سر۔۔۔ گارڈ۔۔۔ گارڈ جلدی۔۔۔ ادھر آؤ۔۔ ایمبولینس۔۔۔۔' کلرک بدحواس تھا اور شہباز بے ہوش!

باب 45

لمبی ریس کا گھوڑا!

'رانی، اس دن آپ نے مجھے میکس کے حوالے سے بہت اچھا گائیڈ کیا تھا۔ آپ کی رہنمائی نہ ہوتی تو میں میکس پر چھانہ سکتی تھی۔ آج مجھے مولانا ابدالی کے حوالے سے ویسی ہی بریفنگ چاہیے۔ سنا ہے مولوی لوگ بہت شدت پسند ہوتے ہیں۔ قاری نواز اور شکیلہ والا کیس تو بچے بچے کے علم میں ہے۔ کہیں یہ بھی دوسرا قاری نہ نکلے۔' افسانے نے رانی سے کہا۔ دونوں خواتین لاؤنج میں تھیں۔ بوبی کو رانی نے ڈرائیور کے ذریعے گھر واپس بھجوا دیا تھا۔ نہ رانی نہ افسانے ابدالی کی موجودگی میں بوبی کا موجود ہونا مناسب سمجھتی تھیں۔

رانی افسانے کے خدشات محسوس کر سکتی تھی۔ اسے اچھا لگا جب افسانے نے یہ موضوع چھیڑا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ افسانے سوچنے اور سمجھنے والی لڑکی ہے۔ اسے یہ بھی ادراک ہے کہ میکس، بوبی، ڈیمے اور ابدالی میں بہت فرق ہے۔ وہ یہ سوال صرف اس لئے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیسے ابدالی کو مطمئین کر کے گھر واپس بھیجے۔

'افسانے بیٹا فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابدالی قاری نواز کی طرح درندہ نہیں۔ اگر میکس منہ زور گھوڑا ہے تو ابدالی ایسا گھوڑا ہے جو سوار کو بہت آرام اور سکون سے سواری کرنے دیتا ہے۔ مجال ہے سوار کو کوئی جھٹکا محسوس ہو۔ سوار کو لگتا ہے کہ مرسڈیز بینز میں سفر کر رہا ہے۔ زبردست مزا دے گا ابدالی تجھے۔ لائف ٹائم تجربہ ہو گا تیری زندگی کا۔ ابدالی لمبی ریس کا گھوڑا ہے۔' رانی نے افسانے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے کہا۔

'اس عمر میں بھی لمبی ریس کا گھوڑا؟ کہیں میری ایڑ لگانے سے اگلے جہاں میں نہ پہنچ جائے!' افسانے بڑے اعتماد سے بولی

-

'اتنی عمر بھی نہیں۔ ساٹھ برس کا ہے۔ بزرگ درست کہتے ہیں۔ گھوڑا اور مرد اگر خوراک اچھی رکھے تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ تو جتنی مرضی ایڑ لگا لے۔ وہ قائم رہے گا۔ مارشل آرٹ سیکھا ہوا ہے۔ ابھی تک جم جاتا ہے۔ اتنا وزن ڈالتا ہے کہ جوان نہ اٹھا سکیں۔ بڑا کانٹے دار میچ ہو گا آج۔

باب46

سراب سچے یا جھوٹے؟

ہوش آنے پر شہباز نے ڈاکٹر معین کو اپنے سامنے پایا۔

'آپ؟ میں کہاں ہوں؟'

'بیٹا تم زخمی حالت میں میرے گھر سے نکلے تھے۔ میں نے پوری کوشش کی تمہیں روکنے کی۔ تم نہیں رکے۔ میں نے اصرار نہ کیا لیکن مجھے تمہاری فکر تھی۔ اسی لیے میں اپنے سٹاف کے ہمراہ تمہارے پیچھے ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا تم کافی شاپ کی کھوج میں وہاں جاؤ گے اور مایوس ہو گے۔ تمہارا پیچھا کرتے کرتے میں تمہارے اپارٹمنٹ تک پہنچ گیا۔ کلرک مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں تمہیں یہاں لے آیا۔ یہ میرا ذاتی ہسپتال ہے۔۔جدید ترین سہولیات سے لیس۔ میں چاہتا تو تمہیں کسی بھی چھوٹے موٹے ہسپتال میں لے جاتا۔ بس زخم دھونے تھے، پٹی کرنا تھی اور کچھ دوائیں تجویز کرنا تھیں۔ شکر ہے تمہارے زخم اتنے شدید نہیں لیکن تعداد میں بہت ہیں۔ شارپنلز کئی جگہ اپنا کام دکھا گئے۔ یہ چند دنوں میں بھر جائینگے۔ لیکن تمہارا اصلی زخم جوں کا توں رہے گا۔ شیزوفرینیا کا علاج ممکن ہے۔۔اگر اسے اسی مرحلے پر قابو کر لیا گیا تو! جتنی دیر کرو گے یہ بگڑتا رہے گا۔ تم پڑھے لکھے اور سمجھدار انسان ہو۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے تمہارے دونوں دوستوں کو فون بھی کر دیا تھا۔ انہیں تمہاری کیفیت کے بارے میں اچھی طرح سے بتا بھی دیا تھا۔ نپولین اور چوہدری صاحب نے کچھ دیر پہلے فون بھی کیا تھا۔ وہ تمہارے حوالے سے بہت فکر مند تھے۔ وہ تم سے ملنے آئیں گے آج۔ زیادہ باتیں مت کرنا۔ تمہیں بہت زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔' ڈاکٹر معین شہباز کو صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

'میرا فون کہاں ہے؟ شہباز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ وہ غزالہ کا نمبر ٹرائی کرنا چاہتا تھا۔۔باوجودیکہ ڈاکٹر اسے بتا چکا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے دماغ کی اختراع تھا۔

'فون کا کیا کرنا ہے؟ وہ تمہیں آرام نہیں کرنے دے گا۔' ڈاکٹر بولا۔ اسے علم تھا کہ شہباز فون کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔

'میں گھر والوں کو اطلاع دینا چاہ رہا تھا۔۔۔' شہباز نے بہانہ گھڑا۔

'تمہارے دوست یہ کام پہلے ہی کر چکے ہیں۔ انہوں نے تمہارے گھر والوں کو تسلی بھی دے دی ہے۔۔ یہ کہ تم بالکل خیریت سے ہو اور فیلڈ میں کسی ایسی جگہ پر ہو جہاں فون کے سگنلز نہیں آتے۔ تمہاری دوست رابعہ سے بھی رابطہ ہو چکا ہے۔ اتفاق سے اسکے والد میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ میرا یہ ہسپتال نفسیاتی امراض کا علاج کرتا ہے۔ شہر کے تمام بڑے لوگ یہاں آتے ہیں۔ تم یہاں کچھ دن آرام سے رہو۔ میں تمہاری کیفیت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ اس کام میں تو میری ساری عمر بیت گئی۔ بس چند ادوایات تمہیں تاحیات استعمال کرنا پڑیں گی۔ آہستہ آہستہ ہیلوسی نیشن اور ڈیلیوزن بند ہو جائینگے۔ اور تم سو فیصد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس ایک دو مہینے کی بات ہے۔ لیکن ادوایات تمہیں تاحیات استعمال کرنا پڑیں گی۔ ٹھیک ہونے کی صورت میں یہ نہ سمجھ لینا کہ اب دوائی کی ضرورت نہیں۔ یہ ادوایات دماغ میں کیمیکل بیلنس برقرار رکھتی ہیں۔ جیسے ہی تم ان کا استعمال بند کرو گے، کیمیکلز کا توازن بگڑ جائے گا اور یہ مسئلہ مزید شدت سے اپنے آپ کو دھرائے گا۔' ڈاکٹر بولتا رہا۔ شہباز اسے تکتے سنتا رہا۔ وہ اسکی بات سمجھنے کی تو کوشش کر رہا تھا مگر اس کا دل اور دماغ۔۔ دونوں ہی اسکی نفی کر رہے تھے۔

'بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کرونگا۔ ویسے آپ کا یہ ہسپتال تو بہت مہنگا ہو گا۔ میں۔۔۔۔'

'تمہارے لئے مہنگا نہیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے سے پیسہ نہیں لیتا۔۔۔'

'لیکن اگر میں اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہوں تو؟' شہباز مسکراتے بولا۔

'ایک کپ کافی پلا دینا۔۔ ڈیزٹ کافی ہاؤس میں۔۔' ڈاکٹر آنکھ مار کر بولا اور شہباز ہنسنے لگا۔ اس دوران ڈاکٹر کا فون بجا۔ اس نے سکرین دیکھتے ہی فون شہباز کے ہاتھ میں تھما دیا۔

'ہیلو رابعہ۔۔۔ میں زندہ ہوں۔۔ بچ گیا ہوں۔۔۔ لگتا ہے تمہیں علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اسی لئے مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئیں۔۔' شہباز شرارتی انداز میں بات کر رہا تھا۔

'بے کار باتیں نہیں کرو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میں اتنی فکرمند تھی تمہارے حوالے سے۔ نہ جانے کہاں کہاں تلاش کیا تمہیں۔ تمام سرکاری ہسپتال چیک کئے۔ پھر انکل معین کا فون آ گیا۔ تب جا کر تسلی ہوئی۔ تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ کاش میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے آتی۔۔۔' رابعہ کے لہجے میں فکر اور تشویش کے علاوہ پیار بھی تھا۔ شہباز کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی اس سے پیار کرتی تھی۔ لیکن اس نے شہباز کو ایسا محسوس تک نہ ہونے دیا۔ اسے غزالہ کی یاد ستانے لگی۔

'میں پندرہ منٹ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے ؟' رابعہ نے شہباز سے پوچھا۔

'میرا موبائل فون۔۔۔'

'وہ ابھی ممکن نہیں۔ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس موبائل نے ہمیں سکون سے دور کر دیا ہے۔ اور تم کام پر نہیں ہو۔ ہسپتال میں ہو۔ وہاں ویسے بھی فون استعمال کرنے پر پابندی ہے۔' رابعہ کے سمجھانے میں اتنا خلوص اور پیار تھا کہ شہباز ضدی ہونے کے باوجود اس کی بات مان گیا۔

'او کے۔۔ تم جیتیں میں ہارا!' شہباز بولا۔

'تھینک یو۔۔ آئی لو یو!' رابعہ نے کہا۔ اس کے بعد فون کٹ گیا۔ شہباز کو اس کا آئی لو یو کہنا اچھا لگا۔ لیکن اس جملے میں بہت وسعت تھی۔ ایک بچہ اپنی ماں کو، بہن کو اور معشوقہ کو بیک وقت آئی لو یو کہہ سکتا تھا مگر رشتے کی نوعیت سے مفہوم بدل سکتا تھا۔ ایک دوست بھی ایک دوسرے کو آئی لو یو کہہ سکتے تھے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ رابعہ نے اسے کس حیثیت میں آئی لو یو کہا۔ اس سے دوستی کا رشتہ تو بہت پرانا تھا لیکن اس نے پہلے کبھی ایسا نہ کہا۔ اب کیوں؟ یہ سوچتے سوچتے اسے ایک اور خیال آیا۔ 'ڈاکٹر صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو آخری کال کر سکتا ہوں آپکے فون سے ؟' شہباز نے معین سے پوچھا۔

'کر لو کر لو۔ وہ ہے ہی نہیں۔ یہ شوق بھی پورا کر لو۔' ڈاکٹر مسکراتے بولا۔ اس کا فون ابھی تک شہباز کی ہاتھ میں تھا۔

'آپکو کیسے معلوم میں غزالہ کو فون کرنا چاہ رہا تھا؟' شہباز نے پوچھا۔

'بیٹا عمر گذر گئی اس دھندے میں! تم نے نپولین اور چوہدری صاحب کو سپیکر پر ڈال کر فون کیا تھا۔ غزالہ کو بھی اسی طرح کرنا۔ میں اسکی آواز سننا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ آواز تمہاری اپنی ہو!' ڈاکٹر نے بدستور مسکراتے کہا۔

'جی سپیکر پر ہی ڈالونگا!' شہباز نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

'آپکا ملایا ہوا نمبر درست نہیں۔ برائے مہربانی دوبارہ کوشش کیجئے!' فون کمپنی کا خودکار صوتی پیغام شہباز کو مایوس کیے دے رہا تھا۔ اس نے کئی بار یہ نمبر ڈائل کیا اور ہر بار یہ ہی پیغام سننے کو ملا۔

'فون مجھے دو۔۔۔' ڈاکٹر نے شہباز سے کہا۔ اس نے فون ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈاکٹر نے وہ نمبر دیکھا۔۔ پھر مسکرایا۔۔۔ پھر شہباز سے مخاطب ہوا: 'برخوردار یہ تو کوئی نمبر ہی نہیں۔ شروع کے ہندسے جو تم نے ملائے، یہ تو کسی بھی فون سروس کے ہیں ہی نہیں۔ مجھے لگتا

ہے تمہیں اس وقت دوائی اور اس کے بعد آرام کی ضرورت ہے۔ میں تمارے دوستوں اور رابعہ کو فون کر کے بتائے دیتاہوں کہ وہ تم سے آج نہ ملیں۔ میں نرس کو بھیجتاہوں۔ وہ تمہیں چار مختلف گولیاں دے گی۔ انہیں کھاکر تمہیں کچھ دیر بعد نیند آجائے گی۔ سکون اور نیند اشد ضروری ہے تمہارے لئے۔ مجھے امید ہے تم تعاون کروگے۔'ڈاکٹر نے بہت نرمی سے شہباز کو سمجھایا۔

'آپ اتنے پیار سے میرا علاج کر رہے ہیں۔ آپ میرے لئے فکرمند ہوئے۔ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اپنے اس عالیشان ہسپتال میں لے کر آئے۔ میں کیسے آپ کے خلوص کو ٹھکرا سکتاہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ میں آپ سے بھرپور تعاون کرونگا۔۔۔بس ایک آخری سوال۔۔۔'شہباز ملتجیانہ انداز میں بولا۔

'پوچھو بیٹا۔ سوال کاجواب دیناتو ہمارے کام کا حصہ ہے۔'ڈاکٹر بولا۔

'میرے دائیں بازو پر ایک امام ضامن تھا۔ وہ اسوقت بھی موجود تھاجب میں آپکے گھر پر تھا۔ وہ اب موجود نہیں! یقیناً آپ نے سنبھال کر رکھ لیا ہو گا۔۔۔کیونکہ آپ زخموں کو دھو رہے ہونگے۔۔۔۔'شہباز اتنا کہہ کر رک گیا۔

'بیٹا یہ امام ضامن کب سے تھاتمہارے پاس؟'ڈاکٹر نے پوچھا۔

'سر یہ آج صبح غزالہ نے نماز پڑھنے کے بعد میرے بازو پر باندھا تھا۔ یہ امام ضامن کی ہی برکت تھی جو میں اتنے بڑے دھماکے میں بچ گیا۔۔۔'

'بیٹے غزالہ اور اس کے ساتھ جڑی ہر یاد تمہارا فگمنٹ آف امیجی نیشن ہے۔ یعنی تمہارا جیتا جاگتا خواب۔۔اک سراب جو تمہیں سچا لگتاہے۔ بس اب دوائی کھا کر سو جاؤ۔ ذہن پر زور دو گے تو مزید الجھ جاؤ گے۔ گڈ نائٹ!'ڈاکٹر یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ایک نرس دوائی لے کر آئی جو شہباز نے کھالی۔ نرس اسکے کمرے کی بتی بجھا کر باہر چلی گئی۔ شہباز ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ چند منٹوں بعد اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ نہ جانے کب وہ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

شہباز نہ جانے کتنے گھنٹے سوتا رہا۔ جب اٹھا تو اسے اتنا یاد تھا کہ جب وہ سویا تھا سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا۔ اور جب جاگا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس حساب سے وہ نو گھنٹے مسلسل سویا اور ایک بھی خواب نہ آیا۔ وہ اس بات پر حیران تھا۔ کیونکہ اسے بچپن سے ہی خواب دیکھنے کی عادت تھی۔ جس رات خواب نہ دیکھے اسے نیند نہ آتی۔ اسکا ہر خواب مفصل ہوتا۔ وہ

خواب میں آوازیں سن سکتا تھا۔ رنگ دیکھ سکتا تھا۔ روز اسے کم از کم تین خواب تو ضرور آتے۔ بعض خواب اپنے آپ کو مختلف شکل میں دہراتے۔ بیدار ہونے کے بعد کچھ تو بہت اچھی طرح یاد رہتے۔ کچھ مبہم شکل میں سارادن ذہن میں گھومتے۔ اگر وہ بیدار ہونے کے فوراً بعد انہیں نہ لکھتا تو ذہن سے ہی نکل جاتے۔ عجب سلسلہ تھا! اسے سب دوست اور دشمن خوابوں میں بار بار دکھائی دیتے۔ بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے وہ یہ بھی سوچتا کہ اللہ کرے یہ خواب ہی ہو، حقیقت ہرگز نہ ہو! یعنی خواب میں بھی یہ خدشہ رہتا کہ حقیقت سو فیصد حقیقت نہیں۔ لیکن حقیقت میں رونما ہونے والے بھیانک واقعات کو وقوع پذیر ہوتے دیکھ کر کبھی یہ خیال اس کے دل میں نہیں آیا کہ کاش یہ بھی خواب ہوں!

اسکی سوچوں کا سلسلہ انٹرکام کی گھنٹی نے توڑا۔

'سر آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔۔۔' استقبالیہ کلرک نے شہباز کو بتایا۔

'کون ہے؟' شہباز نے پوچھا۔

'کوئی خاتون ہیں۔۔۔۔ مس۔۔۔۔' کلرک نے بتایا۔

'عجیب لوگ ہیں آپ! اتنا جدید ہسپتال ہے اور اتنا ان پروفیشنل سٹاف۔ کیا آپ ملاقاتیوں سے ان کا نام نہیں پوچھتے؟' شہباز کو کلرک کی حماقت پر غصہ آ گیا۔

'سوری سر میں بتانا چاہ ہی رہا تھا کہ آپ نے مجھے ڈانٹ دیا۔۔ مس غزالہ ہیں۔ بھیج دوں سر؟ کلرک نے کہا۔

'فوراً بھیجو۔ پلیز۔۔۔۔' شہباز نے جلدی سے کہا۔ بہت مشکل تھا اس کے لئے اپنے کانوں پر اعتبار کرنا جو اسے پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل دھوکہ دیے جا رہے تھے۔ کانوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی اسے دھوکہ دے چکی تھیں۔۔۔۔ جب کافی ہاؤس کی جگہ اس نے گفٹ شاپ کو کھڑا پایا۔

'میں نے تمہیں کتنا روکا۔۔۔ کتنا سمجھایا کہ نہ جاؤ۔۔۔ تم نہیں رکے۔ تم بہت ضدی ہو شہباز۔۔۔ کیا حال بنا لیا تم نے اپنا!' غزالہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ وہ اسی سیاہ لباس میں تھی۔ اسکے چہرے پر حسین اداسی تھی۔ اس کے بدن کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ شہباز مبہوت اسے تکتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا، غزالہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کے بدن کے لمس میں ہر دکھ اور درد کا علاج تھا۔ شہباز کو لگا اس کے تمام زخم مندمل ہو چکے ہیں۔

'میں نے غلطی کی تمہاری بات نہ مان کر۔ بہت بڑی غلطی کی۔ اس غلطی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ یہ لوگ مجھے پاگل، دیوانہ، مجنوں، دماغی مریض نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں تمہارا کوئی وجود ہی نہیں۔ تم میری فگمنٹ آف امیجی نیشن ہو۔ کیا یہ سچ ہے غزالہ؟'

'شہباز میں نے تمہیں اس دن بتایا تھانا۔۔۔ کافی شاپ میں۔۔۔ کہ میری تیسری آنکھ بچپن میں ہی کھل گئی تھی۔ میں وہ دیکھ سکتی ہوں جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ تمہاری تیسری آنکھ بیدار ہو چکی ہے۔ دو آنکھوں والے لوگ ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔ ہم اب اس دنیا کے لئے بے کار ہیں۔ یہ دنیا ہمارے لئے بیکار ہے۔ ارے۔۔۔ امام ضامن کیوں اتار دیا تم نے؟'

'غزالہ یہ لوگ کہتے ہیں تم ہو ہی نہیں۔ چونکہ امام ضامن تم نے اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا۔ اس لئے وہ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر وہ چیز جو تو سے جڑی ہے میرے دماغ کا خلل ہے۔۔۔ اضطراب ہے! تم بتاؤں سچ کیا ہے؟'

'ٹھہرو شہباز۔ یہیں رکو۔ میں فوراً آئی۔ میرے پیچھے مت آنا!' غزالہ نے یہ کہا اور اگلے ہی لمحے وہ کمرے میں دوبارہ موجود تھی۔ یہ لمحہ شہباز کے لئے ایک صدی کے برابر تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی امام ضامن تھا۔

'یہ ریسیپشن پر پڑا ہوا تھا۔ ان بے وقوفوں کو کیا علم ایسی چیزوں کا!' یہ کہتے کہتے غزالہ اس کے بازو پر امام ضامن دوبارہ باندھ چکی تھی۔

'اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہمارا یہاں ایک پل بھی رکنا ٹھیک نہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ ہمارے بچے ہماری راہ تک رہے ہونگے۔' غزالہ نے اپنا ہاتھ شہباز کی جانب بڑھایا۔ شہباز نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ دونوں ڈاکٹر معین کے ہسپتال سے نکل کر سڑک پر آ چکے تھے۔ راہداری میں جس جس نے انہیں دیکھا دائیں بائیں ہو کر راستہ دیتا چلا گیا۔ ان میں آخری شخص ڈاکٹر معین تھا جس نے مسکراتے مسکراتے غزالہ کو شہباز کا ہاتھ پکڑے اسے ہسپتال سے باہر لے جاتے دیکھا۔

ہسپتال کے باہر غزالہ کی کرونا انہتر کھڑی تھی۔ بالکل اس حالت میں جیسے ابھی ابھی شو روم سے نکلی ہو۔

'کافی پیئیں؟ وہیں؟' غزالہ نے شہباز کو گاڑی کی چابی تھماتے کہا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

'ضرور!' شہباز نے کہا۔ گاڑی پہلے ہی سیلف میں سٹارٹ ہوئی۔ اس نے ہسپتال کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر معین ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا!

ختم شد